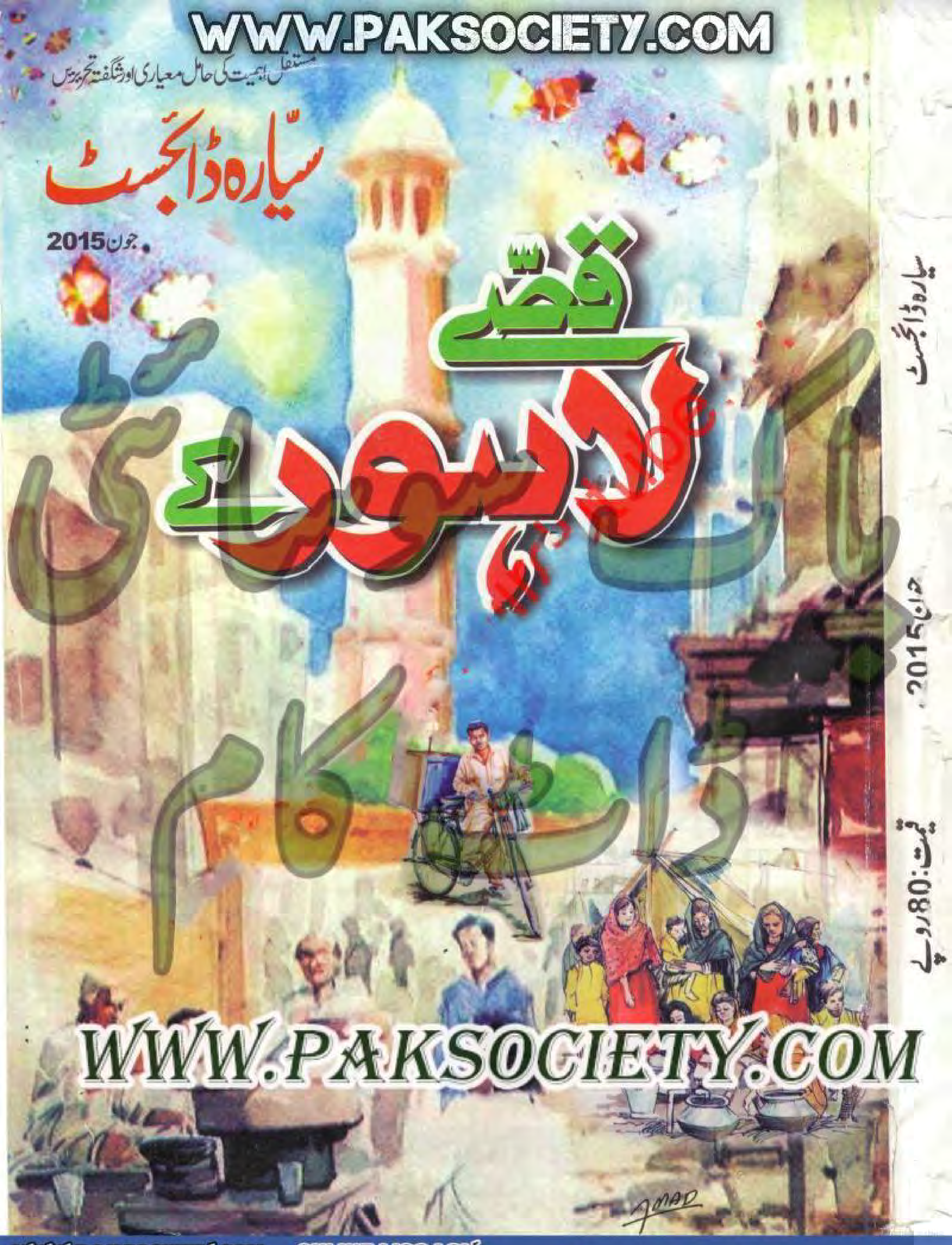


WWW.PAKSOCIETY.COM
مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں
سیارہ ڈائجسٹ
جون 2015
قصے لاہور کے
سیارہ ڈائجسٹ
جون 2015
قیمت: 80 روپے
WWW.PAKSOCIETY.COM

القرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الانعام

اے محمدؐ! ان سے پوچھو کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان؟ اور جبکہ اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا چکا ہے تو کیا اب ہم اُلٹے پاؤں پھر جائیں کیا ہم اپنا حال اس شخص کا سا کر لیں جسے شیطانوں نے صحرا میں بھٹکا دیا ہو اور وہ حیران و سرگرداں پھر رہا ہو۔ دراں حالے کہ اس کے ساتھی اسے پکار رہے ہوں کہ ادھر آ یہ سیدھی راہ موجود ہے؟ کہو حقیقت میں صحیح رہنمائی تو صرف اللہ ہی کی رہنمائی ہے اور اس کی طرف سے ہمیں یہ حکم ملا ہے کہ مالک کائنات کے آگے سر اطاعت خم کر دو، نماز قائم کرو اور اس کی نافرمانی سے بچو اسی کی طرف تم سمیٹے جاؤ گے۔ وہی ہے جس نے آسمان و زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور جس دن وہ کہے گا کہ حشر ہو جائے اسی دن وہ ہو جائے گا۔ اس کا ارشاد عین حق ہے اور جس روز صور پھونکا جائے گا اس روز بادشاہی اسی کی ہوگی۔ وہ غیب اور شہادت اور ہر چیز کا عالم ہے اور دانا اور باخبر ہے۔

(آیات ۷۱ تا ۷۳)(حوالہ تفہیم القرآن: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

الحدیث

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رمضان میں روزہ اور تراویح

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض کئے اور میں نے تمہارے لئے نماز تراویح تجویز کی۔ پس جو لوگ رمضان میں روزے رکھیں گے اور تراویح پڑھیں گے ایمان اور احتساب (اجر آخرت کی نیت) کے ساتھ تو وہ اپنے گناہوں سے اس طرح پاک ہوں گے جیسے اس دن جب کہ وہ پیدا ہوئے تھے گناہوں سے پاک تھے۔"

تشریح: حدیث میں قیام کا لفظ آیا ہے جس سے مراد تراویح ہے جو شخص مومن ہو اور اجر آخرت کی نیت سے یہ دونوں کام کرے تو اس کے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ رہے وہ گناہ جو حقوق العباد سے متعلق ہیں وہ تو اسی وقت معاف ہوں گے جبکہ صاحب حق کو اس کا حق لوٹا دیا جائے یا وہ بخوشی معاف کر دے۔

(بحوالہ فرمان رسولؐ نمبر۔ سیارہ ڈائجسٹ)

اس شمارے میں......

خواتین کارنر





جلد 52۔ شمارہ 6، جون 2015ء

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

www.facebook.com/sayaradigest
Email:editorsayyara@yahoo.com
sayyaradigest@gmail.com
editorsayyara@hotmail.com
Phone:92-042-37245412
Mobile:0300-9430206

مستقل اہمیت کی حامل معیاری اور شگفتہ تحریریں

ماہنامہ سیّارہ ڈائجسٹ لاہور

مدیر اعلیٰ
امجد رؤف خان

مدیر منتظم
کامران امجد خان

مدیر : محمد ثاقب

معاون مدیران : جویریہ کامران۔ رؤفی خان۔ فرحان امجد

سرکولیشن منیجر : بشیر احمد

مارکیٹنگ منیجر : خرم احمد خان۔ 0333-4207684

نگران پرنٹنگ : خالد محمود۔

طابع : اللہ والا پرنٹرز شاہراہ قائداعظم لاہور

شعبہ اشتہارات :
(لاہور) خرم احمد خان۔ 0333-4207684
طارق محمود۔ 0300-4144781
(کراچی) محمد عابد مرزا۔ 0321-3758492

مجلس مشاورت
صغیرہ بانو شیریں' رفیق نوری
ریاض آفندی' فیاض ثمر' عارف محمود' ایل

قیمت 80 روپے

امجد رؤف خان پبلشرز نے اللہ والا پرنٹرز سے چھپوا کر
240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور سے شائع کیا۔

آپ ادب نواز ہیں! آپ علم دوست ہیں!

ہم آپ کو سیارہ ڈائجسٹ کے تمام شمارے گھر بیٹھے
بذریعہ رجسٹری ڈاک بھیجیں گے اور
آپ کو -/520 روپے
کا فائدہ بھی ہوگا۔

-/520 روپے کی رعایت

سیارہ ڈائجسٹ

سالانہ اخراجات کا تخمینہ

قیمت فی شمارہ -/80 روپے ۔ سال بھر میں بارہ شماروں کی عام قیمت -/960 روپے
سال بھر کا ایئر میل رجسٹری ڈاک خرچ -/360 روپے ۔ کل رقم -/1320 روپے

لیکن آپ اتنی رقم کیوں خرچ کریں؟
آپ صرف -/800 روپے میں ارسال کر دیں۔
سال بھر سیارہ ڈائجسٹ آپ کو گھر بیٹھے ملتا رہے گا۔
صرف یہ کوپن پُر کر کے حوالہ ڈاک کر دیجئے!

اس پیشکش سے فوراً فائدہ اٹھائیں

جناب منیجر صاحب۔ سیارہ ڈائجسٹ
براہِ کرم مجھے ماہ............ سے سیارہ ڈائجسٹ ایک سال کیلئے جاری فرمادیں
-/800 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں/آپ مجھے -/800 روپے کی وی پی پی ارسال کر دیں۔ میں وصول کر لوں گا۔ نوٹ:۔ چیک قبول نہیں کیا جائے گا

نام............ پتہ............

آپ یہ رقم اے ٹی ایم (ATM) اور منی ٹرانسفر کے دیگر طریقوں سے بھی ہمارے اکاؤنٹ نمبر 4-720 ایم سی بی ریواز گارڈن بینک کوڈ نمبر 1227 برانچ لاہور میں ٹرانسفر کر سکتے ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے رابطہ نمبر 042-37245412

اظہار خیال

مظلوم عوام کا کوئی پرسان حال نہیں

جناب کامران خاں صاحب السلام علیکم! آپ کے موقر جریدہ کا شمارہ مئی ملا جواب زینت مطالعہ ہے۔ اس کا سرورق فیض احمد فیض کی تصویر اور ان کے خوبصورت کلام سے درخشاں تھا۔ کیا خوب تھے وہ لوگ ان کا کہنا قابل داد ہے کہ سارے جھگڑے انا کے ہوتے ہیں۔ دستک کے صفحات پر جناب امجد رؤف خاں صاحب کا تجزیہ "پاکستانی فوج ہی کیوں؟" حقائق کا غماز ہے۔ ہمارے حکمرانوں کی آخر جائے پناہ بھی تو سعودی عرب ہی ہوتی ہے اس لئے ان کے سارے فیصلے انا کے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نے کہا تھا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں یہ ہمارے ملک کا المیہ ہے کہ جب بھی مسلم لیگ ن کی حکومت آتی ہے تو مہنگائی بام عروج پر جا پہنچتی ہے۔ اس دور میں مظلوم عوام کا کوئی بھی پرسان حال نہیں ہوتا۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ حکومت کے وزیروں نے لاکھوں ٹن گندم ملک میں بغیر کسی پلاننگ کے درآمد کرلی یہ نہ سوچا کہ نئی فصل ملک میں جلد پک کر تیار ہونے والی ہے اور جلد ہی مارکیٹ میں آجائے گی اور پچھلے سال کی گیہوں بھی گوداموں میں پڑی ڈھیر ہے۔ حکومت نے تیار ریٹ بھی 1300 روپے دیا لیکن منڈیوں میں اس ریٹ پر گاہک خریدنے کے لئے تیار نہیں۔ سرکاری خریداری ابھی شروع ہوئی نہیں کسان بیچارا پریشان ہے۔ گرمی کی حدت میں جوں جوں اضافہ ہو رہا ہے بجلی کی لوڈشیڈنگ میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ دن تو جیسے تیسے گزر جاتا ہے لیکن رات کو مچھروں کی یلغار سے نہیں بچ جاتا۔ کے دہائی دیں عوام مجبور ہو کر سڑکوں پر نکل آئے گی توڑ پھوڑ ہوگی پھر یہ حکمران کہیں گے کہ ہمیں اپنی ٹرم پوری کرنے نہیں دی۔ انہوں نے یہ نہ سوچا کہ آخر انہوں نے بھولی بھالی عوام کے ساتھ کیا کیا۔ نئے بجٹ کی آمد آمد ہے بیچارے بوڑھے پنشنرز بھی آہ و فغاں کر رہے ہیں خدارا ان کا بھی کچھ احساس کیجئے۔ پچھلی حکومت پی پی پی نے اپنے پانچ سالہ دور اقتدار میں پنشن میں 125 فیصد اضافہ کیا سو فیصد پنشن میں اور 25 فیصد میڈیکل الاؤنس میں لیکن افسوس کہ ن لیگ جب بھی اقتدار میں آتی ہے تو خزانہ خالی ہونے کا ڈھونگ رچاتی ہے اور پنشنرز کو محض 10 فیصد اضافہ پر ٹرخاتی ہے کیا ان کے دور حکومت میں مہنگائی کا گراف اپ نہیں ہوتا۔ خدا بھلا کرے ہائی کورٹ کا کہ جس نے بوڑھے پنشنرز کے متعلق نوٹس لیا اور اپنے ریمارکس میں کہا کہ یہ پنشنرز قوم کا اثاثہ ہیں ان کے متعلق یہ سوچا جائے کہ یہ بزرگ اپنے حقوق کے لئے سڑکوں پر پولیس کی لاٹھیاں نہیں کھا سکتے۔

(قلندر حسین سید۔ احمد پور شرقیہ)

شوکت افضل کی تحریروں کا انتظار

جناب مدیر صاحب۔ السلام علیکم! ماہ رواں کا "سیارہ ڈائجسٹ" ہمارے سامنے ہے تمام تر سلسلے خوب ہیں۔ آپ ہر ماہ لاجواب تحریروں کا انتخاب کر کے لاتے ہیں مگر ہم ایک بات پر آپ سے سخت ناراض ہیں اور وہ یہ کہ آپ وعدہ کے باوجود بھی ہمارے پسندیدہ رائٹرز کی تحریریں شائع نہیں کرتے۔ میری مراد شوکت افضل صاحب سے ہے۔ آخر آپ ان کی تحریروں میں ہی اتنا وقفہ کیوں دیتے ہیں۔ ہم

پورا مہینہ انتظار کرتے ہیں کہ اگلے شمارے میں اپنی پسندیدہ رائٹر شوکت افضل کی نئی تخلیق پڑھیں گے مگر جب ایسا نہیں ہوتا تو یقین جانیے سخت مایوسی ہوتی ہے۔ براہ کرم ذرا غور کیجیے اور قارئین کی ناراضگی سے بچیے۔

(ثمینہ نعیم۔ لاہور)

☆ثمینہ صاحبہ، آپ نے جو بات لکھی ہے اور جس طرح کے جذبات کا اظہار کیا ہے، کچھ اسی طرح کے خیالات، کراچی سے صائمہ خالد، لاہور سے امتیاز احمد، میانوالی سے احمد شہزاد اور لاہور سے مدثر خان کے بھی ہیں جن کے خطوط ہم شائع نہیں کرسکے۔ بات دراصل یہ ہے کہ شوکت افضل صاحبہ جو بھی تحریر لیکر آتی ہیں اس پر پہلے کچھ عرصہ تحقیق کا کام کرتی ہیں اور پھر اسے تحریری شکل دیتی ہیں۔ اس دوران اُن کی طرف سے تحریر ارسال کرنے میں دیر ہوجاتی ہے۔ جیسے ہی وہ کوئی نئی تحریر ارسال کریں گی ہم انشاءاللہ اسے شائع کریں گے۔

دستک پڑھ کر ابہام ختم ہوجاتا ہے

محترم جناب مدیر صاحب۔ السلام علیکم اللہ تعالیٰ ہم سب کو حفظ و امان میں رکھے (آمین) میں ممنونیت بھرے خط لکھتا رہوں گا اور آپ پڑھتے پڑھتے تھک جائیں گے۔ میرے خطوط اور تحریروں کو مسلسل اشاعت نصیب ہورہی ہے اور آئندہ بھی (انشاءاللہ) یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ دستک پڑھ کر ذہن میں جو ابہام ہوتا ہے وہ ابہام یکسر ختم ہوجاتا ہے۔ فیض صاحب سے متعلق مضمون پڑھ کر فیض صاحب کی شخصیت کے کچھ پہلو نمایاں ہوئے یقیناً وہ ایک تاریخ ساز شخصیت تھے جو اپنے بعد ایک مکمل تاریخ چھوڑ گئے ہیں۔ سارے سلسلے بہت اچھے جارہے ہیں اور امید ہے کہ انشاءاللہ سیارہ اور آپ ہمیں مفید مضامین سے نوازتے رہیں گے۔ ایک تحریر اور ارسال کررہا ہوں امید ہے جلد شائع ہوجائے گی۔

(نیئر رضاوی۔ کراچی)

تحریر شائع کردیں

محترم جناب امجد رؤف صاحب۔ السلام علیکم!

اپنے پچھلے خط اور وعدہ کے مطابق حج کے ایمان افروز واقعات بعنوان "حج مبارک 1997ء" بڑی محنت اور سوچ سوچ کر لکھا ہے۔ کوئی نہ کوئی غلطی بھی ضرور ہوگی معذرت چاہوں گا نوک۔ پلک درست فرما کر سنوار کر سیارہ کی قریبی اشاعت میں ضرور شائع فرمادیں۔ اس مضمون سے بہت سوں کا بھلا ہوگا۔ 14 صفحات پر مضمون و واقعات روحانی غذا ہیں۔ اگر صفحات کا مسئلہ ہو تو بے شک دو تین اقساط میں شائع کردیں لیکن شائع ضرور کریں مہربانی ہوگی۔

(دعاگو غلام نبی عارف۔ لیہ)

☆غلام نبی عارف صاحب، انشاءاللہ آپ کی تحریر جلد شائع کردی جائے گی۔

صغیرہ بانو شیریں کا انتقال

محترم مدیر سیارہ ڈائجسٹ السلام علیکم! انہایت افسوس کے ساتھ آپ کو مطلع کررہا ہوں کہ محترمہ صغیرہ بانو شیریں انتقال کرچکی ہیں مجھے ان کے انتقال کی خبر ماہنامہ پاکیزہ سے ملی تھی۔ نہایت حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ آپ لوگوں نے تعزیت کے دو لفظ بھی نہیں چھاپے۔ ان کا نام برابر مجلس مشاورت میں چھپ رہا ہے۔ انہوں نے تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی مگر آپ کے ڈائجسٹ کی بہت خدمت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ آمین۔ ابھی میں نے مخدوم عبدالقادر ثانیؒ کے واقعات پڑھے ہیں جس میں

کتابت کی غلطیاں ہیں اکثر پڑھنے والے برابر آپ کی توجہ مبذول کراتے رہتے ہیں مگر آپ لوگ اس اہم مسئلہ کی جانب کوئی کارروائی نہیں کرتے۔ امید ہے کہ آئندہ ڈائجسٹ میں غلطیاں نہیں ہونگی۔ شکریہ

(سید شاہد علی۔ کراچی)

☆ شاہد علی صاحب جیسا کہ آپ نے خود لکھا ہے کہ ہمیں ان کے انتقال بارے معلوم نہ ہوسکا تھا اس لیے تعزیت کا اظہار بروقت نہ ہوسکا۔ بلاشبہ ہم ان کی سیارہ ڈائجسٹ کے لیے خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اسی لیے انھیں مجلس مشاورت میں شامل کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

شاعری کا عالمی دن

محترمی مکرمی ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم۔ مجھے امید ہے کہ تمام عملہ سیارہ ڈائجسٹ پر ابر رحمت کا سایہ ہوگا۔ ماہ مارچ ہو یا اپریل یا پھر مئی جو بھی موسم ہو سیارہ ڈائجسٹ اپنا مقام برقرار رکھتا ہے مگر افسوس اس بات پر ہے کہ ایس مارچ قارئین اور عملہ سیارہ ڈائجسٹ بھول گیا وہ لوگ بھی بھول گئے جو خود طبع آزمائی کرتے ہیں چونکہ 21 مارچ عالمی طور پر شاعری کا دن منایا جاتا ہے کسی بڑے مشاعرے کا تذکرہ کسی اخبار یا رسالے وغیرہ میں نہیں بلکہ کوئی مشاعرہ ہوا ہی نہیں۔ عہد حاضر کے بڑے بڑے نامور شاعر بھی 21 مارچ سے ناآشنا رہے میں نے سوچا کہ سیارہ ڈائجسٹ کے مارچ کے شمارے میں نہیں آیا تو شاید ماہ اپریل کے شمارے میں شامل ہوگا یہ آرزو بھی رائیگاں گئی۔ میں نے مختصر سا پہلے شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ پر مضمون لکھا ہے تاکہ میں اپنے قارئین حضرات کو پہلے دیوان مرتب کنندہ شاعر کا تعارف کراسکوں۔ سیارہ ڈائجسٹ سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور اس بات کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں اور پچھلے ماہ میں میری غزل کی اشاعت کیلئے شکریہ! اگر میں ماہ اپریل کے شمارے میں اپنی پسندیدہ تحریروں کا تذکرہ کروں تو یہ بھی نہایت طویل مضمون ہوجائے گا۔ سیارہ ڈائجسٹ نے مجھے بھی اپنا حصہ بننے کیلئے کھینچا۔ محض کھینچا ہی نہیں بلکہ حوصلہ افزائی بھی کی ہے میں نے اپنے مضمون سلطان محمد قلی قطب شاہ کو عام فہم اور آسان الفاظ میں مزین کرنے کی کوشش کی ہے لیکن کچھ لوگوں کے نزدیک یہ بات محض فضول ہے مگر وہ لوگ بھٹکے ہوئے ہیں مگر پھر بھی میں نے ماضی کی عکاسی کرکے لوگوں کو آشنا کرنا چاہا ہے۔ غالب کے اس شعر پر اختتام کرتا ہوں۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ کی بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہوگئیں

(عدیل الرحمٰن عدیل۔ خانوال)

معلوماتی سلسلہ

جناب مدیر منتظم کامران امجد خان صاحب۔ السلام علیکم! کبھی جنوری 1968ء میں کوپن سیارہ ڈائجسٹ انسائیکلوپیڈیا شائع ہوتا تھا مگر اب نہیں کیا وجہ ہے؟ معلومات کیلئے بہت اچھا سلسلہ تھا۔ سائل کا کام تو سوال کرنا ہی ہوتا ہے مالک کا کام اچھے جواب دینا یا اس کی مدد کرنا ہی ہوتا ہے کیا آپ کے پاس کاغذ کی کمی ہوتی ہے یا فضول سوال ہوتے ہیں۔ بندہ کی آپ سے استدعا ہے کہ آپ ضرور معقول سوالات کے جوابات سے نوازیں تاکہ سائلوں کی معلومات میں اضافہ ہو۔

خداوند تعالیٰ ادارہ اور اس کے تمام عملہ جات کو خوش و خرم رکھے۔

(حاجی محمد وارث۔ راولپنڈی)

☆جناب محمد وارث صاحب، انشاء اللہ بہت جلد اس طرح کا معلوماتی سلسلہ دوبارہ شروع کیا جائے گا۔

دل مسرور ہو گیا

جناب امجد رؤف خان صاحب۔ السلام علیکم!

خیر و عافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں۔ کافی دنوں کے بعد شہر جانے کا اتفاق ہوا جب میں بک سٹال پر پہنچا تو ماہ مئی 2015ء کا تازہ پرچہ دیکھ کے دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ سرورق خوب تھا اندر جھانکا تو رنگ برنگی تحریروں سے ملاقات ہوئی۔ یہ ایک معیاری پرچہ ہے اس کے سبھی سلسلے انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ ہیں۔ ہر بار جب بھی پرچہ آتا اپنی غزل نہ پا کر میں مایوس ہو جاتا تھا۔ خیر ہمارے ساتھ یہی ہوتا تھا ہم آپ بڑی محبت اور خلوص سے خط تحریر کرتے ہیں ہم آپ کو اپنی دعاؤں میں ہمیشہ یاد رکھتے ہیں اس مہنگائی کے زمانے میں ایسا کامیاب پرچہ نکالنا آپ ہی کا کام ہے۔ آج جب میں بک سٹال پر گیا تو بزم شاعری میں غزل پا کر دل بہت مسرور ہوا۔ اس کے لئے میں آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ موسم آہستہ آہستہ بدل گیا ہے ہر انسان کی اپنی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں ہم سیارہ ڈائجسٹ کے پرانے قارئین میں سے ہیں پرچہ اداس دلوں اور بچھڑے ہوئے لوگوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ خدا آپ کو اپنے مشن میں کامیاب کرے۔ کافی عرصے کے بعد آپ کو خط تحریر کر رہا ہوں۔ معاف کر دینا آخر کار آپ نے دوستی نبھائی میں آپ کا بے حد ممنون ہوں ہم پر آپ کی نظر عنایت ہو گئی خط سے آدھی ملاقات ہو جاتی ہے۔

چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں جسے آپ بزم شاعری میں جگہ دے دیں۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور صحت دے۔ تحریر میں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ دل کے بے حد اصرار پر آپ کو خط تحریر کر رہا ہوں ہمیشہ آپ کی زندگی میں رنگ برنگے پھول کھلتے رہیں۔ کچھ باتیں ذہن سے نکل جاتی ہیں معاف کرنا تفصیل سے خط لکھا تھا مگر وقت کی کمی اور مصروفیات کی بنا پر اجازت دیں۔ زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہو گی۔ ہمیشہ آپ کے سر پر رحمتوں کا سایہ رہے۔

(محمد اسلم جاوید۔ فیصل آباد)

قلندر حسین کا سلسلہ

جناب امجد رؤف خان صاحب۔ السلام علیکم۔

میں پچھلے قریب دس سال سے سیارہ ڈائجسٹ کا باقاعدگی کے ساتھ مطالعہ کر رہا ہوں۔ مجھے اس میں خاص طور پر نواز خان اور قلندر حسین کے سلسلے بہت پسند ہیں۔ قلندر صاحب جس محنت سے ہمارے لیے معلوماتی تحریریں منتخب کر کے لاتے ہیں وہ لائق تحسین ہے اور میں ان کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔ مگر ایک بات مجھے کھٹکتی ہے اور وہ یہ کہ قلندر صاحب نے اپنا سلسلہ اتنا مختصر کیوں کر دیا ہے۔ مانا کہ وہ ادارہ کے ساتھ ناراض ہو گئے تھے مگر ایسا تو ہو ہی جاتا ہے۔ اب جبکہ وہ لکھ رہے ہیں تو پہلے کی طرح بھرپور صفحات کیوں نہیں دیتے اور پھر ان کی ناراضگی قارئین سے تو ہرگز نہیں جو ان کے سلسلے کو پسند کرتے اور اس کا شدت سے انتظار کرتے ہیں۔

امید ہے وہ ہمارے جذبات کا خیال رکھیں گے۔

(شہریار اسلم۔ کراچی)

دستک

Editorsayyara@yahoo.com

دہشت گردی کیخلاف آپریشن اور عوامی توقعات

پاکستان میں دہشت گردوں اور ملک دشمنوں کے خلاف پاک فوج کا آپریشن زور و شور سے جاری ہے۔ ایک طرف پاکستان کے وہ کھلے دشمن ہیں جو ہماری ریاست کیخلاف کھلے عام حملے کرتے ہیں، معصوم لوگوں کے خلاف خودکش حملے کرتے ہیں اور لوگوں کا قتل عام کرتے ہیں۔ دوسری طرف وہ منافق ملک دشمن عناصر بھی ہیں جو بظاہر ملک کے ٹھیکیدار بنتے ہیں مگر دراصل ملک کی جڑیں کھوکھلی کررہے ہیں۔ ان سب کے ساتھ ساتھ ہمارے مذہبی، لسانی اور فرقہ بندی پرمبنی اختلافات ہیں جو ملکر پاکستان کو نقصان پہنچارہے ہیں بلکہ اس ملک کے لیے ناسور بن چکے ہیں۔ پاک فوج نے ان سب مسائل سے ملک کو نجات دلانے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ کام دراصل سیاسی رہنماؤں کا تھا نہ کہ پاک فوج کا۔ مگر سیاستدان ہمیشہ سے خواب غفلت میں سوئے رہے ہیں۔ انھیں اگر کوئی چیز عزیز رہی ہے تو بس اپنا اقتدار۔ آج بھی جب دہشت گردی کے خلاف آپریشن کا فیصلہ کن مرحلہ جاری ہے اور خاص طور پر کراچی میں ملک کے معاشی مرکز کو تاریکیوں میں گم کرنے والوں کے خلاف جنگ جاری ہے تو ملک کے اقتدار پر بیٹھے سیاسی رہنما خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ منہ سے ایک لفظ نہیں نکالتے کہ انھیں ملک سے زیادہ اپنے اقتدار کی فکر ہے۔ یہ جانتے بوجھتے کہ پاک فوج جو کام کررہی ہے وہ ہماری بقا کے لیے اب ناگزیر ہو چکا ہے سیاستدانوں کو مصلحت عزیز ہے۔ جب ہر کام پاک فوج نے کرنا ہے اور ملک کے تحفظ کا ذمہ دار صرف پاک فوج کو ہی سمجھ لیا گیا ہے جب کہ سیاسی رہنماؤں نے خود کو ہر ذمہ داری سے عہدہ برآ تصور کرلیا ہے تو پھر جمہوریت جمہوریت کا راگ کیوں الاپا جاتا ہے۔ پھر اس وقت شور کیوں مچایا جاتا ہے جب سیاستدانوں کی نااہلیوں اور کرپشن سے تنگ آ کر فوج اقتدار پر قبضے کے لیے مجبور ہوجاتی ہے۔ آپ خود ایسے حالات کیوں پیدا ہونے دیتے ہیں؟۔

جب پشاور کے آرمی پبلک سکول میں 140 بچوں کو سروں میں گولیاں مار کر شہید کر دیا گیا تھا تو پوری قوم نے دہشت گردوں کے خلاف حتمی اور فیصلہ کن جنگ کے لیے پاک فوج کو تمام تر اختیارات دینے کا مینڈیٹ دے دیا تھا۔ سیاستدانوں نے بھی اس مرحلے پر قوم کے دباؤ پر قومی ایکشن پلان کی منظوری دے دی تھی۔ اب پھر 13 مئی 2015 کو، صفورہ گوٹھ کراچی میں 43 افراد کو بس میں گھس کر سروں میں گولیاں مار کر شہید کیا گیا تو ایک بار پھر پوری قوم کراچی میں دہشت گرد عناصر کے خلاف فیصلہ کن جنگ کو انجام تک پہنچتا دیکھنا چاہتی ہے۔ عوامی توقعات اپنی جگہ، آپریشن میں حصہ لینے والے جوانوں اور پاک فوج کی ہائی کمان کے ارادوں کی پختگی سے بھی کسی کو انکار نہیں...... مگر اس سب کے باوجود چند اہم باتوں کو یاد رکھنا ضروری ہے۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ہم جو کبھی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ہمیں جتنا نقصان بیرونی دشمن پہنچا رہے ہیں اس سے بڑھ کر نقصان ملک کے اندر بیٹھے ملک کے دشمن بھی پہنچا رہے ہیں۔ پھر ہماری صفوں میں موجود انتہا پسند عناصر ہیں جو شاید ان سب سے بڑا خطرہ ہیں۔ ہمیں اس جنگ کو جیتنے کے لیے سب سے پہلے اندرونی ملک دشمن عناصر کا قلع قمع کرنا ہوگا۔

دہشت گردی کے مذکورہ اندوہناک واقعات میں قتال کے طریقہ کار میں واضح مماثلت پائی جاتی ہے۔ پچھلے عرصہ سے کراچی میں پکڑے جانے والے کئی جرائم پیشہ افراد کا تعلق بھارتی خفیہ ایجنسی ’را‘ سے بتایا جا رہا ہے۔ اس بات میں دو رائے نہیں کہ ملک کے غیر معمولی متشدد داخلی حالات ملک دشمن قوتوں کو انتہائی سازگار ماحول فراہم کر رہے ہیں جس سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوششیں یہ قوتیں کر بھی رہی ہیں اور کرتی بھی رہیں گی۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ عناصر ہمارے ملک میں اس طرح کی کارروائیاں اتنے بڑے پیمانے پر کرنے اور اپنا دائرہ کار اس قدر وسیع کرنے میں کیونکر کامیاب ہیں؟

بلاشبہ اس بات کو سمجھنا کوئی راکٹ سائنس نہیں! لیکن سوال تو یہ ہے کہ ایک ایسا ملک جس میں مذہب و مسلک کے نام پر نہ صرف گروہ بندیاں موجود ہیں بلکہ ہر گروہ اپنے نظریے کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر ریاست سے برسرپیکار بھی ہے اور عام انسانوں حتیٰ کہ معصوم بچوں کے قتال سے بھی گریز نہیں کرتا تو ایسی سنہری صورتحال سے ملک دشمن قوتیں فائدہ اٹھانے کی کوشش کیوں نہ کریں؟ ان ملک دشمن عناصر کو زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ محض ان متفرق گروہوں کو کیل کانٹے سے لیس کرنا ہے اور بس!

وطن عزیز میں ہونے والی ملک دشمن کارروائیوں میں سے زیادہ تر کے پیچھے ’را‘ کا ہاتھ ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ موقع پرست اور ملک دشمن عناصر بھی ان کارروائیوں میں ملوث ہیں۔ اب تو یہ عناصر کھلے عام بھی ’را‘ سے مدد مانگتے پھرتے ہیں۔ یہ بھی یاد رہنا چاہیے کہ ریاستِ پاکستان کے مستقبل کی آئین سازی کے لئے مذہبی تعصب سے بھری بنیاد ہم نے خود فراہم کی تھی۔ ریاست کو مذہب کی بنیاد پر دہرے معیار اپنانے کا حق ہم نے خود دیا ہے۔ دہشت گردی کا بوٹا اپنے آنگن میں اپنے ہاتھوں سے سینچ کر تناور درخت بنانا خود کا انتخاب تھا۔ ایسی صورتحال میں ریاست اقلیتوں اور کمزور فرقوں سے جو سلوک روا رکھتی ہے۔

اس پر شکایت کرنا انہیں زیب نہیں دیتا۔ ان کے لئے فرض ہے کہ ہر صورت ریاست اور اکثریت کے شکر گزار رہیں۔ یقیناً ہمیں کسی 'را' کی ضرورت نہیں! اپنے لئے ہم ہی بہت کافی ہیں!

پاکستان میں دہشت گردی کی بنیاد مذہبی انتہاپسندی ہے جس کی اپنی وجوہات اور تاریخ ہے۔ 'را' اگر ریاست مخالف یا علیحدگی پسند عناصر کی پشت پناہی کرتی ہے تو قصوروار ہم بھی ہیں جو اپنے شہریوں کو برابری کی بنیاد پر حقوق فراہم کرنے میں گذشتہ 67 سالوں میں ناکام رہے ہیں۔ اسی طرح کی ایک ریاستی کمزوری 1971 میں بھی دیکھنے میں آئی تھی۔

پاکستان کو اپنا وجود برقرار رکھنے اور دہشت گردی سے نجات کے لیے جنگ میں فتح کے لیے حقیقتاً تبدیل ہونا پڑے گا۔ یہ ایک کٹھن کام ہے کیونکہ مذہبی انتہا پسندانہ سوچ معاشرے کے رگ و پے میں سرائیت کر چکی ہے۔ ملائیت سے جان چھڑانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ آج حالات اس نہج پر ہیں کہ مفتی صاحبان اپنے مفادات کے خلاف اور برائی کی جڑوں کی جانب اشارہ کرنے اور زبان ہلانے والوں کو دائرہ اسلام سے خارج کرنے میں ایک پل کی دیر نہیں لگاتے۔

موجودہ صورتحال میں امید ضرور رکھنی چاہیے کہ دہشت گردی کے خلاف آپریشن اور قومی ایکشن پلان اپنے منطقی انجام تک پہنچے گا اور پاکستان کو حقیقی تبدیلی کی راہ پر گامزن کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ امید اس لئے بھی رکھنی پڑے گی کہ اس کے علاوہ کوئی دوسری راہ موجود نہیں۔ ایک منتخب حکومت ہے، دوسرے ریاستی ادارے ہیں اور تیسری عوام ہے۔ یہی ریاست ہے اور اسی کو سدھارنے کی کوشش جاری رکھنا فرض ہے۔ یہی اقوام کا امتحان ہے۔ ایسے امتحان سے گزر کر ہی اقوام کامیاب ہوتی ہیں۔ یورپ بھی ایسے وقت سے گزر چکا ہے جہاں کلیسے کی مرضی کے بغیر پتہ بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ کلیسا سیاسی اور عسکری امور پر حاوی تھا۔ اس گھٹن زدہ دور سے یورپ کو نکلنے میں کئی صدیاں لگ گئیں۔ لیکن جب اس دور سے چھٹکارا پا لیا تو صدیوں کے جان کن تجربے سے سیکھ چکا تھا کہ مذہب کا ریاستی امور سے کسی بھی قسم کا تعلق ہو ہی نہیں ہوسکتا۔ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے ریاست کا نہیں۔ پاکستان بھی ایسے ہی دور سے گزر رہا ہے۔ بس ثابت قدم اس بات پر رہنا ہے کہ رجعت پسندی لاکھ کہے لیکن سچ یہی ہے کہ زمین اس وقت بھی سورج کے گرد گھوم رہی ہے!!! پاکستان خوش قسمت ہے کہ اسے جنرل راحیل شریف جیسا سپاہ سالار ملا ہے اور ان کے ساتھ ساتھ ایسی عسکری قیادت بھی ملی ہے جو حقیقتاً پاکستان کو اس کے ازلی مسائل سے نجات دلانے کا پختہ عزم کیے ہوئے ہے۔ مگر ہمیں اس آپریشن کی کامیابی کے لیے اپنا کردار بھی ادا کرنا ہوگا اور اپنی صفوں میں موجود کالی بھیڑوں کو پہچانا ہوگا تبھی اس آپریشن سے وابستہ توقعات مکمل طور پر پوری ہوسکیں گی۔

(امجد رؤف خان)



قصے لاہور کے

عبدالمجید شیخ

لاہور پاکستان کا دل ہے۔ اس شہر میں بسنے والوں کا دل کسی اور شہر بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے کہ ان کا دل دنیا کے کسی بھی شہر میں نہیں لگتا۔ لاہور کے موسم کا بھی اس میں کافی دخل ہے۔ لاہور کی شامیں بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔ ہر طرف پھیلی ہریالی آنکھوں کو بہت بھاتی ہے۔ یہاں رہنے والوں کے مزاج میں بڑا کھلا پن ہے۔ وہ دوستی اور دشمنی میں انتہا پسند ہیں۔ خاص طور پر لاہور کے پکوان تو کسی بھی مسافر کو رُکنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

کچھ دن پہلے ایک کتاب ''قصے لاہور کے'' پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ کتاب اس قدر دلچسپ تھی کہ ساری کتاب ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ خود لاہور میں مقیم ہونے کے باوجود اس کتاب میں درج پرانی یادیں' بچپن سے پہلے کے قصے اور لاہور کے چیدہ چیدہ افراد کے کارنامے پڑھ کر میرے اندر ایک عجیب سی مسکان پھیلتی گئی۔ جب میں کوئی اچھی کتاب پڑھتا ہوں تو دل کرتا ہے کہ قارئین سیارہ ڈائجسٹ کے ساتھ اسے شیئر کروں۔ دل میں خیال آتا ہے کہ دیکھوں جتنا مجھ پر اس کتاب نے اثر کیا کتنے قارئین ویسا ہی محسوس کرتے ہیں۔ ہم نے آپ کی دلچسپی کے لئے اس کتاب کے چند اقتباس یہاں رقم کئے ہیں۔ یہ کتاب سنگ میل پبلی کیشن نے شائع کی ہے۔

(امجد رؤف خان)

لاہور اور اس کے نیل کی صنعت

جب آپ لوہاری دروازے کے راستے اندرون شہر میں داخل ہوتے ہیں جو غالباً ٹکسالی دروازے کے مسمار ہونے کے بعد اب قدیم ترین دروازہ ہے تو یہ سڑک چار سو گز دُور جا کر ایک کھلی جگہ پہنچتی ہے جسے کبھی چوک چکلہ کہا جاتا تھا جو لاہور کا اصلی قحبہ خانوں کا علاقہ تھا۔ ٹکسالی ان دنوں ثقافتی لحاظ سے بالائی طبقے کا علاقہ تھا۔ بائیں جانب یا شمال مغرب کو یہ تحصیل بازار کے سرے سے جا ملتی ہے اور دائیں جانب شمال مشرق کے رُخ یہ سوتر منڈی' دھاگے کی پرانی منڈی کے ساتھ بل کھاتی چلی جاتی ہے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں تو ہمیں اس منڈی سے نکلتی ہوئی دو گلیاں ''نیل گلی اور رنگ والی گلی'' دکھائی پڑتی ہیں۔ یہی دو گلیاں ہماری توجہ کا مرکز ہیں۔ آیئے ہم اپنی کہانی سن 1633ء سے شروع کرتے ہیں۔ مغل بادشاہ شاہ جہاں نے ایک شاہی فرمان جاری کیا جس کی رو سے نیل کی صنعت ریاستی ادارہ

داری میں لے لی گئی۔ لاہوری دروازے کے بالکل پاس لاہور کی نیل منڈی میں ڈھنڈورچی نے بادشاہ سلامت کے فیصلے کا اعلان کیا' جسے کم ہی علم تھا کہ اس فیصلے نے برصغیر میں یورپی آبادکاری کی بنیادیں رکھ دی تھیں۔

اس شاہی فرمان کی رو سے پوری سلطنت میں اگلے تین برسوں تک ایک ہندو تاجر منوہر داس جس کی لوہاری دروازے میں بہت بڑی دکان تھی اور جو اپنا کاروبار آگرہ اور سورت میں بھی چلاتا تھا نیل کے فروخت کے حق کی توثیق کی گئی تھی اسے شاہی خزانے سے ایک قرض کے ذریعے مالی امداد فراہم کی جاتی تھی اور منافع کی صورت میں تو حصہ داری کا حق بھی حاصل ہوگیا تھا۔ سرکاری تخمینے کے مطابق یہ پوری سلطنت میں سب سے زیادہ دولت کمانے کی سکیم تھی۔

اس عہد میں برصغیر میں نیل کی دو بڑی منڈیاں لاہور اور آگرہ میں تھیں۔ دیگر قابل ذکر منڈیاں ملتان' الہ آباد' سورت اور دلی میں تھیں۔ لیکن لاہور میں منڈی ان میں سب سے بڑی اور آگرہ کی معیار کے لحاظ سے دیگر منڈیوں پر سبقت رکھتی تھی۔ برصغیر ہند پرانے زمانوں میں نیل کی رنگائی کا قدیم ترین مرکز تھا اور لاطینی و یونانی ادوار سے یورپ کی نیل کی اساسی ضرورت پوری کرتا چلا آرہا تھا۔ برصغیر کا مغربی دنیا سے نیل کے تعلق کا پتہ رنگ کے نام ''انڈیگو'' سے لگایا جاسکتا ہے۔ یونانی زبان میں اسے ''انڈیکون'' اور لاطینی زبان میں ''انڈیکم'' کے لفظ سے پکارا جاتا تھا جو بعدازاں اطالوی زبان اور بالآخر انگریزی کے لفظ ''انڈیگو'' میں ڈھل گیا۔

یونانی دانشور پرپلس اپنی 81-80 قبل مسیح کی ایک تحریر میں نیل اور اس کا دریائے راوی کے ساتھ تعلق کا ذکر کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے ''اس دریا (سندھس یعنی انڈس' دریائے سندھ کے سات دہانے ہیں اور ماسوائے درمیانی کے باقی تمام کے تمام ناقابل جہاز رانی ہیں اور درمیانی حصے پر ایک ساحلی کاروباری مرکز ''باربریکون'' (لہاریا لاہور) واقع ہے جہاں سے اس منڈی میں بے شمار اشیاء درآمد کی جاتی ہیں دوسری جانب یہاں سے کوسٹس' بڈیلیم (گوگل) اور انڈین بلیک (انڈیگو' نیل) برآمد کیا جاتا ہے۔''

طاقتور ولندیزی اور انگریز تاجروں کی برادری کی نیل کے کاروبار میں روز افزوں دلچسپی کے پیش نظر شہنشاہ کو اپنی آمد میں اضافے کا قدم اٹھانا پڑا۔ چارسو برس قبل قدروقیمت کے لحاظ سے یہ برصغیر کا سب سے بڑا برآمدی شعبہ تھا۔ اس شاہی فرمان نے نیل کی عالمی تجارت پر بہت برا اثر ڈالا۔ چنانچہ ولندیزی اور انگریزی تجارتی کمپنیوں نے جو برصغیر کے ساحلوں کے ساتھ ساتھ جہاز رانی کیا کرتی تھیں 19 نومبر 1633ء کو اس اجارہ داری کو توڑنے کے لئے ایک حلفیہ معاہدہ کرلیا۔ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ کوئی یورپی ملک ایک سال تک نیل کی خریداری نہیں کرے گا اور جو ایسا کرے گا وہ اپنے من مانے ارزاں ترین نرخوں پر کرے گا اور یہ کہ آئندہ نیل کی خریداری مشترکہ طور پر کی جایا کرے گی۔ ولندیزی

اور برطانوی تاجروں نے یہ بھی قسمیہ وعدہ کیا کہ آئندہ نیل کو بطور مال برداری قبول نہیں کیا جائے گا۔ پرتگالیوں نے بھی اس عہد کی پاسداری کی، گویا نیل کی تجارت پر سخت قسم کی پابندی لگ چکی تھی۔

یورپی اقوام میں سب سے اولین نیل درآمد کرنے والے پرتگالی تھے۔ جن کے کارندے پورے برصغیر میں خصوصاً لاہور، آگرہ، احمد آباد اور ملتان میں سرگرم عمل رہتے تھے۔ وہ ان شہروں سے پیداوار اکٹھی کر کے سورت کی بندرگاہ پر لے جاتے جہاں سے پرتگالی اپنے بحری جہازوں میں اپنے دارالحکومت لزبن لے جاتے تھے جہاں سے وہ اسے ہالینڈ کے رنگ ریزوں کو فروخت کر دیتے تھے۔ لیکن بعدازاں ولندیزی اور برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنیوں کے معرض وجود میں آنے کے بعد نیل کی تجارتی اجارہ داری پر باہمی رقابت شروع ہوگئی۔

اس یورپی اتحاد نے شہنشاہ شاہ جہاں کو مجبور کر دیا کہ وہ 14 اپریل 1635ء کو منوہر داس تاجر کے ساتھ اپنی شراکت کو منسوخ کر دے۔ مغلیہ سلطنت پہلی بار کسی یورپی دباؤ کے تحت ہمت ہار بیٹھی تھی۔ اس کے بعد سے یہ دباؤ کبھی کم نہیں ہوا۔ نیل کے بعد پنجاب کی روئی پر قبضہ جمایا گیا۔ جنوب میں انہوں نے گرم مصالحے کی تجارت اٹھیائی چنانچہ پرتگالیوں کے ساتھ ولندیزیوں، فرانسیسیوں اور بالآخر برطانوی تاجروں نے اپنے اپنے کردار ادا کیے لیکن مغلیہ عہد میں نیل نے لاہور میں ایک خاص کردار ادا کیا تھا۔

مارکو پولو تیرہویں صدی کی ایک تحریر میں بیان کرتا ہے۔ ''.....لاہور میں یہ بہت مقدار میں نہایت عمدہ نیل بناتے ہیں۔ یہ ایک خاص قسم کی جڑی بوٹی سے بنتا ہے جو گرد و نواح سے اکٹھی کی جاتی ہے اور جڑیں الگ کرنے کے بعد اسے بڑے بڑے برتنوں میں ڈال کر اس کے اوپر پانی انڈیلتے ہیں اور پھر اسے اسی طرح چھوڑ دیتے ہیں حتیٰ کہ پورا پورا سڑ جاتا ہے۔'' ایک انگریز ''ولیم فنچ'' نے 30 اگست 1609ء میں اپنی ڈائری میں لکھا کہ نیل کی تین قسم کی پیداوار اس دور میں ہوتی تھی۔ اس کی سب سے بڑی اور بہترین قسم ''بیانہ'' کہلاتی تھی جو آگرہ کے قریب ایک گاؤں کا نام بھی تھا اور اس کی قیمت فروخت چار سو برس قبل پچیس روپے فی من تھی۔

ولیم فنچ نے بیانہ نیل کی مزید تین اقسام بیان کی ہیں۔ پہلے سال کی فصل نوٹ (نوڈا یعنی چھوٹا پودا) کہلاتی تھی۔ دوسرے سال کی فصل کو جڑی کہتے تھے جو جڑ سے نکلتی تھی اور بہترین تسلیم کی جاتی۔ تیسرے سال کی فصل کو کھنٹی کہتے تھے جو تینوں میں سے گھٹیا ترین تھی۔ ہندوستان میں تجارت کے بارے میں ٹیک اور نیل کا تاجر لکھتا ہے۔ ''میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ فی الواقع مشاہدہ کیا ہے کہ اگر ایک انڈہ صبح کے وقت نیل چھاننے والوں کے پاس رکھ دیا جائے تو شام ہونے تک اگر کوئی اس انڈے کو توڑے، تو اندر سے سراسر نیلے رنگ کا نکلے گا نیل کی دھول اس قدر جاذب ہوتی ہے۔''

ولندیزیوں اور انگریزوں کے مابین نیل کی تجارت کا ایک خاص وصف اس کی اجارہ داری میں ایک

دوسرے پر بازی لے جانا تھا۔ 1637ء میں ولندیزیوں نے انگریزوں کو ان کے مقصد میں ناکام بنانے کی خاطر احمد آباد میں نیل کی ادائیگی میں اضافہ کردیا۔

ایک اور خط میں جو کمپنی کو انگریزی گماشتوں کے بارے میں 29 مئی 1619ء کو لکھا گیا یہ درج ہے کہ نیل کی قیمت میں اضافہ سراسر انگریزوں اور ولندیزیوں کی باہمی مسابقت اور دیسی تاجروں کو نیل کی مال برداری کے لئے اپنے جہازوں کو استعمال کرنے کی اجازت دینا تھی۔ اگرچہ یہ نیل کو لاہور کے زمینی راستے سے ایران برآمد کرنا زیادہ سودمند نہ تھا اور نہ ہی ایسا سوچا جاسکتا تھا۔

یہ بھی بہت سے لوگوں کے لئے حیرت کا باعث ہوگا کہ کرسٹوفر کولمبس کے جہازوں کے بادبانوں کے کینوس نیل میں رنگے ہوتے تھے چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ لاہور اور آگرہ کا نیل نئی دنیا کی دریافت کا چشم دید گواہ تھا۔ اسکاٹ لینڈ میں نیل سے ملتا جلتا ایک پودا ''وڈ'' پایا جاتا ہے جو آج بھی اسکاٹ لینڈ کے روایتی چار خانے دار اور رنگین دھاری دار اونی کپڑے ٹویڈ میں استعمال کیا جاتا ہے۔

مبتی والے کپڑوں میں نیل کا استعمال 600 برس قبل سے بھی زیادہ عرصے سے ہورہا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستانی ملاح جو کینوس کی پتلونیں پہنتے تھے وہ نیل میں رنگی ہوتی تھیں۔ یہ احمد آباد کے قریب ایک شہر ''ڈنگہ'' میں تیار کی جاتی تھیں اسی سے لفظ ''ڈنگری'' نکلا ہے۔ فرانسیسی میں جو ہمیشہ سے بہترین کپڑا بنانے والے تسلیم کئے جاتے ہیں وہ سرج کی طرح کا ایک خاص کپڑا بنایا کرتے تھے۔ نیمز کا شہر آج بھی فرانس کی ٹیکسٹائل صنعت کا مرکز گردانا جاتا ہے نیمز کی سرج یا ''سرج دونیمز'' ہی بعدازاں (موٹا پائیدار سوتی کپڑا) ڈینم کہلایا جس سے جینز پتلونیں تیار کی جاتی ہیں۔

فرانسیسی سپاہی جو براعظم امریکہ میں انگریزوں سے جنگیں لڑ رہے تھے ڈینم کپڑے کی پتلونیں ہی استعمال کرتے تھے۔ ڈینم اطالوی ملاحوں اور اہل حرفہ کا بھی لباس تھا خاص طور پر ان کی سب سے بڑی بندرگاہ جنیوا میں ڈینم کی پتلونیں جنیوا کی نسبت سے جینز کہلانے لگیں۔۔۔ یہ حیرت کی بات ہی تو ہے کہ ایک ایسی پیداوار جو زیادہ تر مغربی ہندوستان یا لاہور، آگرہ، احمد آباد اور ملتان میں تیار کی جاتی تھی ساری دنیا کا سفر کرتی ہوئی دنیا میں سب سے زیادہ پہنے جانے والے کپڑے میں ارتقاء پذیر ہوئی۔

جب انیسویں صدی میں جرمنی کے ایک سائنسدان نے جس کا نام ''بائیر'' تھا مصنوعی عمل سے نیل تیار کرلیا تو قدرتی نیل کی مانگ گرگئی۔ جس وقت سے انگریزوں نے نیل کے کاروبار پر اپنا قبضہ جمالیا تو نیل کی مانگ کم ہونا شروع ہوگئی۔ خصوصاً اس وجہ سے بھی جب لوگوں نے نیل کے پودے دیگر ممالک میں بھی اُگانے شروع کردیے دنیا بھر میں اب واحد جگہ جہاں قدرتی نیل کی پیداوار کی جاتی ہے اور اس کا استعمال کیا جاتا ہے وہ پاکستان میں ہے جہاں سندھ اور ملتان میں روایتی ''اجرک'' کو نیل میں رنگا جاتا ہے۔

لاہور میں نیل کا کاروبار ختم ہو چکا ہے۔ اندرون شہر میں گلیوں کے نام صرف بوڑھے لوگوں کو یاد ہیں اور اب تو گلیوں کے نام بھی تبدیل کئے جا رہے ہیں۔ چوک چکلہ کا نام اب چوک بخاری ہے لیکن چونکہ پاکستان میں دنیا کی بہترین درمیانے ریشے کی روئی پائی جاتی ہے اور ڈینم کپڑے تیار کرنے کے کارخانے لگائے جا رہے ہیں نیل کی رنگائی کا کام دوبارہ شروع ہو رہا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اب یہ رنگ دوسرے ممالک سے درآمد کیا جاتا ہے ایک ایسے ملک اور شہر کے لئے یہ ایک اُداس کر دینے والے حالات کی تبدیلی کا نام ہے جو دنیا بھر کو بے تحاشا نیل کا رنگ فراہم کرتا رہا ہے۔

لاہور میں قحط سالی

گزشتہ 2 ہزار برس کے عرصے میں لاہور اور پنجاب بھر میں تقریباً بیس عظیم قحط آتے رہے۔ عظیم قحط سے مراد وہ قحط ہے جو مسلسل تین برس یا اس سے زیادہ عرصے تک جاری رہے۔ لاہور کے اناج کے ذخائر زیادہ تر حوصلہ بڑھائے رکھتے تھے لیکن ماضی میں ایسے خوفناک زمانے بھی آتے رہے' اتنے ڈراؤنے کہ ہم آج ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اگر ہم سرکاری ریکارڈ دیکھیں اور تاریخ کی مختلف کتابیں پڑھیں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ اوسطاً ہر سو برس بعد لاہور کو کسی نہ کسی عظیم قحط کا سامنا رہا ہے۔ سب سے بدترین قحط چھ برس تک جاری رہا اور حالات اس قدر خراب ہو گئے تھے کہ شہر میں داخل ہونے کے خواہشمند لوگوں پر شہر کے پھاٹک بند کر دیئے گئے تھے اور فاقہ کشی اس مقام پر پہنچ گئی تھی کہ لوگ زندہ رہنے کے لئے آدم خوری پر مجبور ہو گئے تھے۔ موجودہ دور میں ایسی بھیانک صورت حال کا تصور بھی محال ہے لیکن ہماری تاریخ میں ایسا تین بار ہو چکا ہے۔ ہر مرتبہ قحط کی طوالت نے چار برس کی حد عبور کر لی تھی اور آدم خوری کی اطلاعات ملنے لگی تھیں۔

ہمیں ان دلخراش واقعات کی تحقیق کر کے ضابطہ تحریر میں لانا چاہئے تاکہ ہم جان سکیں کہ ہم کون ہیں اور ہمیں کن کن مصائب کا سامنا رہا ہے؟ ایک طرح سے یہ بھی ایک اساسی وجہ ہے کہ ہم آج بھی اجتماعی طور پر ہی سلوک روا رکھتے ہیں۔ لاہور یقیناً شاندار عمارات سے عبارت ہے اور ایک ایسی تاریخ کا حامل ہے جس کی مماثل کرہ ارض پر بہت کم شہر کر سکتے ہیں۔ یہ باغات' شعراء اور یونیورسٹیوں کی وجہ سے بھی مشہور ہے لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ لاہور عوام الناس سے بھی متعلق ہے۔ یہ شہر جو کچھ بھی ہے یہاں کے لوگوں کی وجہ ہی سے ہے۔ جو یہاں رہتے رہے ہیں اور اب بھی یہاں رہ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو کچھ افتاد ان پر پڑی ہے انہیں بیان کرنے کی ضرورت ہے تاکہ آئندہ کبھی ایسا نہ ہو۔ ہمیں اپنی اجتماعی زندگیوں میں زخموں کے داغوں کو ذہنوں سے محو کر دینے کی عادت ہے۔ ہمیں خوفناک قحطوں کے داغوں کو بار بار دیکھنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم انہیں محسوس کر سکیں اور آج ان پر یقین رکھ سکیں۔

یہ قحط یقیناً ہماری تاریخ کے' جو کئی ہزار برس پر محیط ہے عارضی لمحات نہیں رہے ہیں ہمارے بہت

سے لوک گیت' ہمارے اجتماعی برتاؤ کی طرح' سب ان جیسے خوفناک واقعات سے جنم لیتے ہیں۔ ضبط تحریر میں آنے والا پہلا قحط جس نے لاہور کو زد کیا وہ 650ء میں آیا تھا۔ اگرچہ اس وقت کے قحط نے پورے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا پنجاب کے دور دراز کے علاقوں سے لوگ لاہور آ گئے اور اس کو گھیرے میں لے لیا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کے اناج کے ذخائر میں ان کے حصے کی خوراک موجود ہے۔ ہندو راجپوت راجہ کے پاس یقیناً اچھے خاصے ذخائر تھے اور اس نے اپنی رعایا کی ممکنہ حد تک مدد بھی کی لیکن لوگ گلیوں میں محض بھوک کی وجہ سے مر رہے تھے۔ 879ء میں ایک اور عظیم قحط نے لاہور پر کاری وار کیا۔ اس وقت اندرون شہر واقع اناج کے گوداموں پر حملہ کردیا گیا اور امن عامہ کی صورت حال کے انہدام کی وجہ سے قحط طول پکڑتا گیا۔ اس عمل میں بھٹ راجہ کی جانب سے رعایا کی بغاوت کو بزور طاقت کچلنا پڑا تھا اور جب دوبارہ امن عامہ بحال ہوگیا تو خوراک مہیا کردی گئی۔ لیکن بدترین قحط جو لاہور پر حملہ آور ہوا وہ 941ء میں آیا۔ اس قحط نے نہ صرف پورے پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا بلکہ سارے برصغیر کے بھی لاکھوں لوگ لقمہ اجل بن گئے۔ ایک تخمینے کے مطابق اس قحط میں پنجاب کی 35 فیصد آبادی ختم ہوگئی تھی۔ آبادی اس بری طرح کم ہوئی کہ ہر روز بیسیوں لاشیں گلیوں میں پڑی پائی جاتی تھیں۔ جو محض بھوک اور تھکن سے لقمہ اجل بن گئی تھیں۔ ہمارے حالات کی خرابی میں مزید اضافہ کرنے کے لیے ہمارے افغانی بھائیوں نے اپنی اولیں عظیم لشکر کشی کا آغاز کردیا اور جو کوئی بھی ان کے راستے میں آیا اسے بے دردی سے قتل کردیا گیا۔ وہ ہماری کمیاب گندم اور چاول کی فصلوں کے معتدبہ حصے لوٹ کر اپنے ساتھ افغانستان لے گئے اگرچہ ہماری نصابی کتب میں یہی لکھا گیا ہے کہ وہ اسلام پھیلانے آئے تھے۔

آخر کار کچھ سکون میسر ہوا اور بڑے بڑے سیلاب شہر اور اس کے نواحی علاقوں میں آنے کے بعد زمین زرخیز ہوگئی اور کئی برس تک غیر معمولی اچھی فصلیں ہونے کی اطلاعات آتی رہیں۔ اس دور کی بات ہے کہ لاہوری یا لوہاری دروازے کی تعمیر کی گئی۔

اناج کے گودام بھرے رہے اور زندگی معمول پر آ گئی۔ ایک لحاظ سے یہ خوشحالی کے زمانے ہی لاہور کو ایک عظیم شہر بنا گئے لاہور کی اٹھان اس خوشحالی کی بدولت ہوئی جو بھرپور فصلوں کی وجہ سے ہوئی آج بھی یہی راہ منزل ہے۔

لیکن 1148ء میں ایک اور قحط نے لاہور کو آلیا جو 1159ء تک جاری رہا۔ اگرچہ پورے ہندوستان میں پھیل چکا تھا جہاں اس کا اثر بھی زیادہ تھا لیکن لاہور بھی متاثر ہوا اور ہزاروں لوگ اس کی گلیوں میں مر گئے۔ اس کے بعد دو اچھے برس آئے اور اس سے قبل کہ اعتماد بحال ہو پاتا 1162ء میں ایک اور قحط آ گیا۔ بیرونی حملے اور قحط ہاتھوں میں ہاتھ دیئے اکٹھے چلے آئے تھے۔ 45-1344ء میں ہندوستان میں عظیم قحط آیا اور اس وقت مغل شہنشاہ اپنی گھر داری کے لئے ضروری اشیاء حاصل کرنے

کے قابل نہ رہا یہ قحط کئی برس تک جاری رہا اور لاکھوں افراد موت کے منہ میں چلے گئے 1396ء سے 1407ء تک درگا دیوی قحط بارہ برس تک ہندوستان میں جاری رہا لاہور تو تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔

لیکن پھر عظیم ترین سیلاب آ گئے اور زندگی معمول پر آ گئی لاہور کے وسیع اناج کے ذخائر پورے ہندوستان میں مشہور تھے۔ اسی وجہ سے مغلیہ خاندان لاہور میں خاصی دلچسپی لیتا تھا۔ پھر بنگال کا عظیم قحط 70-1769ء میں آ گیا اور ایک تہائی آبادی ایک کروڑ ختم ہو گئی۔ یہ المیہ سمجھ سے یکسر باہر تھا۔ اس زمانے میں لاہور نے اچھے انتظامات کیے تھے اگرچہ 1798ء میں یہاں کال پڑا لیکن 1783ء میں ''چالیسہ قحط'' آ گیا جس نے لاہور اور جموں کو متاثر کیا اور سینکڑوں افراد لقمہ اجل ہو گئے اگرچہ شہر لاہور نے اس زمانے میں اپنی گندم کا آزوقہ مقرر کر دیا تھا اور امن عامہ کو برقرار رکھا تھا اسی قحط کے دوران کشمیری آبادی لاہور منتقل ہوئی تھی آج ہمارے ہاں جو اتنی کشمیری آبادی نظر آتی ہے وہ اسی قحط کے سبب ہے۔

1790ء میں دوجی بارا یا کھوپڑی قحط نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ اتنے زیادہ افراد لقمہ اجل ہوئے کہ ان کو دفنایا نہ جا سکا۔ راویت کے مطابق یہ اب تک آنے والے قحطوں میں شدید ترین تھا۔ یہ قحط چار برس تک جاری رہا اور اس میں آدم خوری کے واقعات کی بھی اطلاع ملی۔ اسی زمانے میں لاہور کے موری دروازے کی تعمیر ہوئی تا کہ رعایا اپنے ہزاروں مُردوں کو دریائے راوی پر جو شہر کی چار دیواری سے بیرون بہتا تھا کریا کرم کے لیے لے جا سکے۔

''کھوپڑی قحط'' کے بعد بھی بڑے بڑے قحطوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جس کا سبب ہماری تحقیق کے بعد ہمیں اب پتہ چلا ہے کہ کیوں قحطوں کا دور دورہ رہا۔ اس کی وجہ تھی کہ انگریز ہمارے اناج کے بڑے بڑے ذخیروں پر قبضہ کر رہے تھے۔ برطانوی سامراجی طرز حکومت کے اس پہلو کو پہلے کبھی زیر بحث نہیں لایا گیا۔ 1838ء میں ایک شدید قحط نے ہندوستان کے شمال مغربی صوبہ جات 'متحدہ صوبہ جات' کو آ لیا۔ جس میں آٹھ لاکھ افراد لقمہ اجل بن گئے۔

1861ء میں ایک اور عظیم قحط ہندوستان کے شمال مغرب پر حملہ آور ہوا جس میں پانچ لاکھ افراد راہی عدم ہوئے۔ 1866ء میں ایک اور قحط عظیم نے بنگال اور اڑیسہ کو لپیٹ میں لے لیا جس میں دس لاکھ افراد مارے گئے۔ 1869ء میں ایک قحط عظیم نے راجپوتانہ کو متاثر کیا جس میں پندرہ لاکھ افراد مر گئے۔ 1876ء میں ایک اور قحط عظیم مرکزی اور مغربی ہندوستان پر حملہ آور ہوا جس میں پچاس لاکھ افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ لاہور ان واقعات سے بُری طرح متاثر ہوا اور اس کے اناج کے ذخائر ختم ہو گئے۔

1897ء میں ایک اور قحط عظیم آیا۔ 1899ء میں آنے والا قحط عظیم 1901ء تک جاری رہا۔ یہ آخری قحط تھا جو ہم پر حملہ آور ہوا۔ اس قحط میں برصغیر میں دس لاکھ سے زائد افراد لقمہ اجل بنے۔

ہمارے لوگوں نے بہت خوفناک زمانے دیکھے ہیں قحطوں نے ان طریقوں کو رواج دیا جنہیں ہم برت رہے ہیں ہمارے تحفظات کسی اور نسبت کے بجائے قحط سے زیادہ متعلق ہیں۔ جدید ذرائع نقل وحمل کے مرہون منت ہیں کہ اب قحط' کم از کم پاکستان میں قصہ پارینہ بن چکے ہیں تاوقتیکہ ہم سکھا شاہی افراتفری نہ مچا دیں' جس طرح ہم نے اپنے کمیاب پانی کے ذرائع کے انتظام میں کر رکھی ہے لیکن وہ تو سیاست کی بات ہے۔ ذرا سوچئے!

بسنت اور صوفی بزرگ

بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ موسم بہار کا قدیم بسنت پنچمی میلہ جو لاہور میں دھوم دھام سے منایا جاتا ہے بعینہ ہر سال برصغیر کے مسلمان دہلی میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ پر بھی مناتے ہیں۔ یہ سات سو برس قدیمی رنگا رنگ روایت چشتیہ سلسلے کے صوفی بزرگ اور ان کے مرید حضرت امیر خسروؒ سے تعبیر کی جاتی ہے جو غالباً اولین مسلمان تھے جو بسنت منانے پر خوشنودی کا اظہار فرماتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ سلسلہ چشتیہ کے یہ صوفی بزرگ ایک مرتبہ حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر آئے ہوئے تھے کہ بسنت کے تہوار کے رنگ دیکھنے کا اتفاق ہوا تو وصیت فرمائی کہ ان کے مریدان بہار کا موسم دہلی میں بھی اتنی ہی دھوم دھام سے منایا کریں لیکن ہوا یوں کہ پورے شہر میں تو نہیں لیکن بسنت میلہ صرف ان صوفی بزرگ کی درگاہ پر ہی منایا جاتا رہا اور آج تک بسنت تہوار پتنگیں اڑانے' میلہ لگانے' کلاسیکی موسیقی کی نغمہ سرائی' خاص طور پر ''بسنت راگ'' الاپنے اور دیگر دھیمے راگوں کے ساتھ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ بعدازاں درگاہ والوں نے اس میلے میں ''قوالیاں'' بھی شامل کر دیں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب سے قدامت پسندوں نے درگاہ کا انتظام سنبھالا ہے جشن بہار کے جوش و جذبے والی رونقوں پر پژمردگی چھا گئی۔

پچھلے دس برسوں میں لاہور اور دہلی میں دو دلچسپ تبدیلیاں دیکھنے میں آئی ہیں لاہور میں انتہائی مذہبی قدامت پسند حضرات نے عوام کی اخلاقیات پر قبضہ جمالیا ہے۔ (اس کی زیادہ سے زیادہ مذمت کرنی چاہیے) اور میلے ٹھیلے والی مسرت کے عنصر کو ہی کچل کر رکھ دیا ہے۔ ادھر دہلی میں صدیوں کے بیتنے کے ساتھ ساتھ قدامت پسندوں کے غلبے کی وجہ سے رونقوں کو ختم کر کے اسی لاہوری تہوار کو چندہ اکٹھا کرنے کا وطیرہ بنالیا ہے۔

میرا اندازہ ہے اگلے چند برسوں تک بھارت کا بسنت پنچمی سیاحوں کی توجہ مرکوز کرے گا اور یہ ویسے ہی ہوگا جیسے بھارت نے اپنے ہاں ایک جعلی شہر سیالکوٹ بنا کر ہمارے اصلی شہر سیالکوٹ کی کھیلوں کے سامان کی صنعت کو اچک لیا ہے۔ بسنت کے معاملے میں میرا یقین محکم ہے کہ اس موقع کو جھپانا ناممکن ہے۔ بسنت کی خوبصورتی اس حقیقت میں ہے کہ یہ خالصتاً عوام کا میلہ ہے خواہ وہ کلیدی عہدے پر ہوں' نچلے یا متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہوں' کالے ہوں یا گورے ہوں یا کسی بھی مذہبی فرقے سے تعلق رکھتے

ہوں۔ موسم بہار میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ہمارے بھیتر سے رجائیت باہر کھینچ لاتا ہے۔ عملی طور پر یہ بے ساختہ پن آج بھی موجود ہے جسے روکا نہیں جا سکتا۔ متشدد حملہ آوروں کے برعکس جو زندگی کو آر یا پار کے معنوں میں ہی لیتے ہیں یہ برصغیر کے عظیم صوفی حضرات تھے جنہوں نے لوگوں کو صحیح طور پر سمجھا خاص طور پر غریب لوگوں کو ان کے رنگ برنگے انداز میں جانچا۔ داتا گنج بخشؒ سے نظام الدین اولیاءؒ اور بلھے شاہ تک سب نے بہار کی بدلتی ہوئی رُت میں اندرونی روح کی خوبصورتی کو دیکھا سرسوں کے کھیتوں میں پیلے پھولوں کو کھلتے دیکھا۔

بنیادی حقیقت یہی ہے اس سے قطع نظر کہ کوئی کس کی اور کیسی عبادت کرتا ہے کہ ہماری تقدیریں اپنی سرزمین سے نہایت مضبوطی کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں نقطہ آغاز کے طور پر حقیقت یہ ہے کہ بہار کا مطلب ہے کہ سورج کی تمازت جلد ہی ہماری گندم کی فصل کو پکا دے گی اور ہمارا اگلے برس کا اناج یقینی ہوجائے گا۔ قدیم مذاہب' جین مت' ہندومت اور بدھ مت جو اپنے اپنے ادوار میں لاہور میں بام عروج پر تھے کو الگ رکھیں' مسلمان صوفیاء کرام نے اس کو نئے معنی عطا کیے۔ سکھ اسے قمری سال کے مہینے بیساکھ کی پانچویں تاریخ کو ''بیساکھی'' کے نام سے مناتے ہیں سال کے زیادہ تر عرصے میں پتنگ بازی پر پابندی نے اس قدیم میلے کو بری طرح نقصان پہنچایا ہے وجہ صرف اور صرف دھاتی تار کا استعمال ہے جو یقیناً محض خوشی منانے کے اس کھیل میں سراسر غیر حکمت عملی ہے۔ کوئی بھی شخص بیک وقت ناجائز کام کرتے ہوئے خوشی نہیں حاصل کرسکتا یہی وجہ ہے کہ اگر ہم صرف دھاتی تار استعمال کرنے والوں کو اچانک چھاپہ مار کر پکڑنے پر پوری توجہ دیں اور اچھے طریقے سے سزا دینا چاہیں تو ان کے چہروں کو کالا کرکے گدھوں پر سوار کرایا جائے تب شاید ''قانون'' کو نافذ کیا جاسکے۔

ہمیں سمجھداری سے کام لیتے ہوئے دھاتی تار والے پتنگ بازوں کو اچانک پکڑوانے میں عوام کو شرکت کی دعوت دینا ہوگی تاکہ مجرموں کو حوالہ پولیس کیا جاسکے۔ اس ضمن میں حکام کو ہر کس و ناکس کی مدد کی ضرورت ہے لیکن حکام کے پتنگ اُڑانے پر پابندی لگانے کے فیصلے کی کوئی حمایت نہیں کرے گا۔ یہ حماقت ہے کہ چند بے ایمانی کرنے والوں کی وجہ سے پتنگ بازی پر ہی پابندی لگا دی جائے اگر اس دلیل پر جائیں تو پھر تو ہر کھیل پر بہترین تفریحی کھیلوں سمیت پابندی لگ جائے گی۔

ہمارے بچپن کے دنوں میں پتنگ بازی رات ہوتے ہی شروع ہوجاتی تھی ہم کاغذ کے لالٹینی غبارے بنایا کرتے تھے رات کو پورے اندرون شہر کے آسمان پر کاغذی لالٹین ہوا کے دوش پر تیر رہی ہوتی تھیں۔ بسنت پر ہم لوگ لاہور کو جس قدر چاہیں خوبصورت یا بدصورت بنا سکتے ہیں۔ بھارتیوں کو بسنت پر پیسہ کمانے کے حربے مبارک ہوں ہم لاہوریوں کو ضرورت ہے تو محض یہ کہ اس موقع پر لوگوں کی آمد پر پابندی نہ لگائیں اور کسی تقریب کا رنگ پھیکا نہ پڑنے دیں بلکہ اس جشن کو نئی بلندیوں تک

لے جائیں کم از کم میں تو اپنے تئیں خوشی سے نہال ہو جاؤں گا۔

داتا دربار: جہاں سب کو کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے

جب کوئی لاہور کے بارے میں بات کرے تو کسی نہ کسی مقام پر داتا گنج بخشؒ کا ذکر ضرور آ جاتا ہے۔ ان کا انتقال 465ھ میں ہوا اور آج کل 1435ھ ہے 970 قمری یا 900 سے زائد عیسوی برس قبل اتنی طویل مدت کے گزرنے کے باوجود اس مزار کے اردگرد زندگی ہمیشہ رواں دواں رہی ہے لیکن اس مزار کے اردگرد کی حقیقی زندگی ہے کیا؟

ہم سب ان کے بارے میں جانتے ہیں اور ہم میں سے بیشتر کسی نہ کسی مرحلے پر تجسس کی بناء پر یا تعظیماً وہاں جا چکے ہیں۔ پچھلے برس سے بطور ایک صحافی میں مزار کے پڑوس میں رہائش پذیر رہا ہوں' میں بادشاہان' صدور' وزراء اعظم' گورنروں اور بے شمار دیگر درخشاں ہستیوں کو وہاں آتے جاتے دیکھتا رہا ہوں۔

لیکن پھر یہاں بھوکے اور پریشان حال افراد تو ایک طرف فقیروں اور جیب کتروں کی بھی بہتات ہے۔ یہاں پارسا لوگ بھی پائے جاتے ہیں اور دھوکے باز بھی اور غالباً موخر الذکر کی تعداد اول الذکر سے کہیں زیادہ ہے۔ جو اس مزار کے اردگرد ہوتا ہے وہی اس شہر کی تاریخ بھی ہے۔ پہلے زمانے میں داتا گنج علی مخدوم گنج بخش ہجویری لاہوری کہلاتے تھے کیونکہ اسی نام گرامی سے وہ دیگر ملکوں میں جانے جاتے ہیں۔ وہ کون تھے؟ بایں ہمہ اور کیا وجہ ہے کہ اپنی وفات کے تقریباً ایک ہزار برس بعد بھی ان کی اس قدر تعظیم کی جاتی ہے؟

داتا گنج بخش 431ھ میں افغانستان کے شہر غزنی سے لاہور تشریف لائے تھے اور سلطان محمود غزنوی کے بیٹے سلطان مسعود کے ہمراہ آئے تھے۔ ان کا اصل وطن ہجویر تھا۔ اسی لئے یہ ان کے نام کا حصہ بن گیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ابتدائی کوائف میں وہ شیخ علی مخدوم غزنوی کہلاتے تھے۔ ہجویری نہیں کیونکہ وہ محمود غزنوی کے بیٹے کے ہمراہ غزنی سے آئے تھے۔ مغرب سے مسلمان فاتحین کی پہلی کھیپ نے برصغیر کی دولت کو افغانی لشکر کے ہاتھوں لٹتے ہوئے دیکھا محمود غزنوی کے بعد اس کا بیٹا برصغیر آیا تو فتوحات کی دوسری لہر آئی لیکن اس کے ہمراہ بہت سے صوفیاء کرام بھی آئے تھے جن کا واحد مقصد صرف اللہ کا پیغام پھیلانا تھا۔ ان صوفیاء کرام میں سب سے پہلے آنے والوں میں داتا گنج تھے۔

کسی عقیدت مند لاہور کے لئے جو یہ سمجھتا ہو کہ داتا صاحب صرف اسی کے ہیں' یہ امر دلچسپی کا باعث ہوگا کہ ان کے مزار پر ان کا سلسلہ نسب واضح طور پر نصب ہے جو یوں پڑھا جا سکتا ہے: یہاں مدفون ہیں، شیخ علی بن سید عثمان' بن سید علی بن سید عبدالرحمٰن' بن سید عبداللہ' بن سید ابوالحسن علی' بن سید حسن' بن سید زید شہید' بن امام حسین' بن علی مرتضٰی۔ جس کا مطلب ہے کہ شیخ علی مخدوم گنج بخش ہجویری لاہوری

رسول پاکؐ سے صرف آٹھ پشت پر ہیں۔

شجرہ طریقت میں شیخ علی ہجویریؒ خواجہ ابوالفضلؒ کے مرید تھے جو شیخ حصریؒ کے مرید تھے جنہوں نے شیخ ابوبکر شبلیؒ سے تربیت پائی جو جنید بغدادیؒ کے مرید تھے جو سید سری سقطیؒ کے مرید تھے جو معروف کرخیؒ کے مرید تھے جنہوں نے داؤد طائیؒ سے فیض حاصل کیا جنہوں نے حبیب عجمیؒ سے فیض پایا جو حضرت حسن بصریؒ کے شاگرد رشید تھے جو حضرت علی مرتضیٰؓ کے شاگرد تھے۔ یہ سلسلہ نسب جو خاصا پیچیدہ ہے بالآخر شیخ علی مخدوم کی پیدائش تک پہنچتا ہے جو اب دنیا میں داتا گنج بخشؒ کے لقب سے مشہور ہیں۔

یوں علی ہجویریؒ 431 سن ہجری میں لاہور تشریف لئے اور بھاٹی دروازے کے عین بیرون مٹی گارے سے بنے ہوئے ایک گھر میں رہنے لگے۔ ان دنوں جیسا کہ اساطیر میں بیان ہوا ہے ایک طاقتور ہندو جادوگر لاہور کی آبادی کا مذہبی رہنما بنا بیٹھا تھا۔ یہ آبادی تقریباً ساری کی ساری ہندوؤں اور جین مت مذہب کے پیروکاروں پر مشتمل تھی۔ اس جادوگر نے نوجوان صوفی عالم کو مقابلے پر للکارا۔ کہا جاتا ہے اگرچہ میری میلان طبع ایسے دعوؤں پر یقین نہ کرنے کی ہے اس جادوگر نے فی الواقعہ علی ہجویری کی جھونپڑی پر ہوا میں اڑنا شروع کردیا۔ برگزیدہ ہستی نے اس مظاہرے کو ''دکھاوا'' قرار دیتے ہوئے یکسر رد کردیا اور آخر کو قل پڑھ کر جادوگر کی طرف پھونک ماری تو وہ زمین پر آن رہا اور بھاگ گیا۔ اس واقعے کا چرچا شہر بھر میں ہوگیا جو ان دنوں گارے کی فصیل کے اندر آباد تھا۔ جلد ہی بے شمار لوگ جو زیادہ تر ہندو تھے علی ہجویریؒ کی خدمت میں حاضر ہونا شروع ہوگئے اور ان کی دعاؤں کے طالب ہوئے۔ تب علی ہجویریؒ نے فیصلہ کیا کہ وہ اسی شہر میں مستقل قیام کریں گے اور اپنے علم اور نفس انسانی کے تزکیے اور اس سے لوگوں کی خدمت کریں گے۔ ایک طرح سے لاہور خود چل کر ان کے پاس آیا تھا اور انہوں نے اسے قبول کرلیا۔ تب ہی عوام نے کہا تھا ''بادشاہ اور فقیر صوفیوں کے نزدیک ایک جیسی حیثیت کے مالک ہوتے ہیں۔'' تقریباً 900 برس بعد بھی یہ سچ قائم و دائم ہے۔

سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر مذہب کے لوگ یہاں حاضری دیتے ہیں۔ ذرا تصور کریں کہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ (1141-1230ء) اور پاکپتن والے خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ (1188-1280ء) جیسے جید علماء اور اولیاء اللہ نے اس مزار پر عبادت کرنے اور چلے کاٹنے میں خاصا وقت صرف کیا ہے۔ صرف مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں مزار کے بیرونی مدرسے کے خوشنما رنگ سنگ مرمر اور نقش کندہ کی وجہ سے دانستہ غارت گری ہوئی لیکن سکھوں نے یہ سلوک تو لاہور کے ہر مقبرے اور مزار کے ساتھ کیا۔ ایک بیان کے مطابق سنگ مرمر اکھیڑنے کے اگلے ہی روز مہاراجہ کو قے آنا شروع ہوگئی اسے مشورہ دیا گیا کہ وہ بیرونی عمارت کو نقصان پہنچانے پر ازالے کے طور پر برگزیدہ ہستی کو راضی کرے۔ چنانچہ مہاراجہ نے مزار کے لئے سالانہ آمدن مقرر کردی اور اس دن کے بعد جب بھی اس کا گزر اس راستے سے ہوا اس نے ہمیشہ مزار پر حاضری دی۔

ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں مزار کی شاندار بیرونی عمارت تعمیر کی گئی اور شہنشاہ ایران نے سونے اور فیروزے کا منقش ایک نہایت خوشنما دروازہ بھیجا جو وہاں نصب ہے اور آج بھی دیکھا جاسکتا ہے نواز شریف تو پوری مسجد کی از سر نو تعمیر کر کے بازی لے گیا اور پھر مسجد بھی نہایت خوبصورت!

اگر آپ اس شاندار عمارت کے اردگرد دیکھیں تو آپ کو انتہائی غربت نظر آئے گی۔ یہ علاقہ جیب کتروں اور اغوا کنندوں کی جنت ہے۔ نوجوان جرائم رپورٹر کی حیثیت سے اپنے ایام میں ہماری ٹیم نے جیب کتروں کے ایک سکول کا کھوج لگایا تھا جہاں ابتدائی نصابی کتب میں جیب کترنے کے طریقے اور آپس میں استعمال کی جانے والی مخصوص زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس وقت ہم نے الزام لگایا تھا کہ یہ سکول مبینہ طور پر پولیس چلاتی تھی لیکن یہ تقریباً تیس برس پہلے کی بات ہے۔ اس انکشافی خبر کے چھپنے کا کچھ بھی نتیجہ نہیں نکلا۔ میرے علم میں ہے کہ یہ علاقہ اب بھی یونہی بدمعاشوں (ملکہ وکٹوریہ کے دور کی اصطلاح) کو نیلام ہوتا ہے اور پھر یہاں بہت سے پکوان خانے ہیں جہاں سے آپ میٹھے چاولوں، گوشت یا پلاؤ کی سالم دیگیں خرید کر غرباء میں لنگر تقسیم کر سکتے ہیں غریب لوگ اس علاقے میں بہت بڑی تعداد میں گھومتے رہتے ہیں بھوکے لوگوں کے لئے ایسا کھانا شرطیہ ہوتا ہے یہاں ہر ایک کو کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے اور یہ فیض نو سو برس سے بھی زائد مدت سے یونہی جاری و ساری ہے۔ داتا گنج بخش کا مزار ہر کس و ناکس کے لئے اہمیت کا حامل ہے اور یہ صدیوں ہی اہم رہے گا۔

اگر مرادیں گھوڑے ہوتیں

ہماری نوعمری میں میرے والد ہمیں سالانہ میلے پر خواہ چند گھنٹوں کے لئے ہی سہی بڑی رغبت سے لے جایا کرتے تھے جو حضرت مادھو لعل حسینؒ کے عرس کے ساتھ ساتھ شالامار باغ میں لگتا تھا۔ ان کے نزدیک یہ انہیں ان مسرت انگیز دنوں کی یاد دلاتا تھا جو انہوں نے ایک اعلیٰ مقام پر بسر کئے تھے۔ ان کے واقف کاروں میں یہ طے ہے کہ وہ دن یقیناً روحانی قسم کے نہیں ہوسکتے کیونکہ وہ اس سے کہیں زیادہ عاقل اور سمجھدار تھے۔

میلے سے لوٹتے ہوئے وہ ہمارے لئے آوے کے پکے ہوئے مٹی کے چند گھوڑے لایا کرتے تھے اور ہر بار ان کا کہنا ہوتا تھا ”تم مراد مانگو اور یہ گھوڑے اس کو پوری کردیں گے۔“ یہ آوے کے پکے ہوئے گھوڑے ”ککو گھوڑے“ گھوڑے شاہ کے مزار سے لائے گئے تھے جو لاہور کا طفل برگزیدہ تھا۔ مقبول عوامی روایت کے مطابق اگر اس طفل برگزیدہ کے پسندیدہ مشغلے کے لئے کوئی شخص گھوڑا لے کر جائے خواہ وہ اصلی ہو یا محض مٹی کا بنا ہوا ہو تو اس کے مزار پر جو بھی مراد مانگی جائے وہ پوری ہوجاتی ہے لاکھوں نہ سہی ہزارہا لوگ ہیں جن کا یقین ہے کہ طفل برگزیدہ وہ مراد پوری کرتا ہے کیونکہ وہ پاکیزہ دل ہے لاہور کے سرپرست طفل برگزیدہ کے سالانہ عرس کی تقریب کے موقع پر لوگ ہزارہا ”ککو گھوڑے“ چڑھا جاتے ہیں چند ایک خوبصورتی سے پینٹ کئے ہوتے ہیں اور باقی محض سرخ مٹی کے سادہ آوے

کے بکے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہر شخص اپنی اپنی مراد مانگ کر جاتا ہے یہ طفل برگزیدہ کون تھا؟ اس بچے کا دادا ایک مقدس برگزیدہ ہستی تھی۔ جو سندھ کے مقام اچ سے تقریباً چار سو برس قبل لاہور آئے تھے۔ ان کا نام سید عثمان شاہ تھا اور ان کا شمار اس زمانے کے لاہور کے جید مذہبی علماء میں ہوتا تھا وہ پارکنسن بیماری کا شکار تھے جو مقامی زبان میں چولے یا لرزش کہلاتی ہے۔ پنجابی اور اردو میں اسے رعشہ کہا جاتا ہے۔ اس بیماری کی وجہ سے انہیں لاہور میں چولے شاہ یا زیادہ مودبانہ لحاظ سے چولے شاہ بخاری کہا جانے لگا۔ ان بزرگ کی شہرت اتنی تھی اور وہ اس قدر موثر تھے کہ وفات پر انہیں قلعہ لاہور کے اندر دفن کیا گیا۔ اس بزرگ ہستی اور عالم دین سے بہت سے معجزات منسوب ہیں چولے شاہ کے بیٹے جن کا نام سید شاہ محمد تھا' اپنے والد کے گدی نشین ہوئے۔ وہ بھی اپنے علمی کارناموں کی بنا پر شہر میں ایک مقدس ہستی کے طور پر جانے جاتے تھے۔ ان کے بیٹے کا جو 997 ھ میں پیدا ہوا نام سید بہاؤالدین رکھا گیا لیکن جلد ہی پیار سے انہیں چولن شاہ کہا جانے لگا۔ جس کا مطلب ہے وہ شاہ جو جھولوں پر کھیلتا ہو۔ یہ نام ان کے دادا چولے شاہ سے مشتق تھا۔ لاہور کے لوگ کسی نہ کسی وصف کی بنا پر نام رکھنے میں مہارت رکھتے تھے اس میں ہمیشہ مزاح کا عنصر موجود ہوتا ہے اس کے باوجود سوانگ واضح اور حساس ہوتا ہے۔

جونہی چولن شاہ نے بولنا اور چلنا شروع کیا تو واضح ہو گیا کہ وہ خاص تحفہ قدرت ہے۔ حتیٰ کہ اس کی والدہ نے اپنے خاوند کو بتانا شروع کر دیا کہ بچہ جو کچھ کہتا ہے یا جو خواہش کرتا ہے وہ فوراً پوری ہو جاتی ہے۔ والد نے جو خود بھی ایک عالم دین تھے اور ان کے مریدین کی اچھی خاصی تعداد تھی ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوتے تھے کہ وہ بچے کی حفاظت فرمائے اور جو کچھ اس کے حق میں بہتر ہے وہی فرمائے۔ پانچ سال کی عمر میں بہاؤالدین شاہ کو گھوڑوں سے انس ہو گیا اور ان پر بڑی مہارت سے سواری کرنا سیکھ گیا لیکن چونکہ اس کے پاس ذاتی گھوڑا نہیں تھا اس لئے وہ لوگوں سے کہتا کہ وہ اسے ان کے گھوڑوں پر سواری کرنے دیں لاہور کے عوام بزرگ عالم دین کے بیٹے کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اکثر اسے اپنے گھوڑے پر سواری کی اجازت دے دیتے تھے۔ سواری کے بعد وہ انہیں کہا کرتا کہ اگر ان کی کوئی مراد ہے تو وہ اسے بتائیں جو اسے بتاتے تو وہ اسی وقت ان کو بتا دیتا کہ ان کی مراد پوری ہو گئی ہے اور حقیقتاً وہ پوری ہو جاتی تھی۔

غریب لوگ جن کے پاس گھوڑے نہیں ہوتے تھے وہ طفل برگزیدہ کو مٹی کے بنے ہوئے گھوڑے جنہیں ککو گھوڑے کہا جاتا تھا ہی پیش کر دیتے تھے۔ ان کی بھی خواہش پوری ہو جاتی تھی چنانچہ اس کی شہرت شہر اور گردونواح میں پھیل گئی اور جلد ہی اس کے والد کو بھی اطلاع مل گئی کہ ان کا برخوردار لوگوں کو گھڑ سواری کے عوض ان کی خواہشیں پوری کر رہا ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کو بلا بھیجا اور اس کی سخت سرزنش کی۔ کہا جاتا ہے کہ روایت کے مطابق اس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ اس چھوٹی سی عمر میں لوگوں کی مرادیں پوری کرنے کے بجائے اسے موت ہی آ جائے تو بہتر ہوتا۔ کہتے ہیں کہ دل شکستہ بیٹے نے

آسمان کی جانب دیکھا اور روتے ہوئے اپنے گھٹنوں پر گر گیا اور وہیں ترنت جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ ناراض باپ سکتے میں رہ گیا۔ روایتی کہانی کے مطابق باپ اللہ تعالیٰ سے معافی کا خواستگار ہوا اور اسے ہدایت ملی کہ جہاں یہ بچہ فوت ہوا ہے اسی جگہ اسے دفن کردیا جائے کیونکہ بچے نے اللہ تعالیٰ سے زندگی واپس لینے کی التجا کی تھی اور اس کی خواہش بھی رد نہ ہوتی تھی۔ مختصر یہ کہ یہ بہت ہی موثر کہانی ہے۔

چنانچہ سید بہاؤالدین شاہ عرف چولن شاہ عرف گھوڑے شاہ لاہور کا طفل برگزیدہ 1003ء میں اسی مقام پر دفن ہوا جہاں اس نے جان جانِ آفریں کے سپرد کی تھی۔ اس کا مزار انجینئرنگ یونیورسٹی سے شالامار باغ کی طرف جانے والی سڑک کے بائیں جانب ایک گلی میں واقع ہے۔ گلی کا نام گھوڑے شاہ ہے۔ آج کل وہاں ایک عظیم الشان مزار موجود ہے جہاں سینکڑوں افراد ہر روز اس طفل برگزیدہ کو مٹی کے بنے ہوئے گھوڑا کھلونے چڑھاوا چڑھانے آتے ہیں۔ ہزار ہا مٹی کے گھوڑا کھلونوں کا اس طفل برگزیدہ کے مزار کے چاروں طرف ڈھیر لگا رہتا ہے۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک خصوصاً بچوں کے لئے یہ جذبات کے اظہار کا ایک طریقہ ہے جو وہ زندگی میں ایک بار ضرور کرتے ہیں عقیدہ یہ ہے کہ وہ اب بھی گھوڑا ملنے پر لوگوں کی مرادیں پوری کرتا ہے۔

چھ پاکدامن خواتین کی پراسراریت

پنجاب بھر کے سارے مزاروں اور مقبروں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو لاہور کی چھ مقدس خواتین کی پراسراریت اور بھید کا مقابلہ کرسکے۔ مقبول عام بی بی پاکدامن کی قبریں ہمیشہ سے ہی ایک معمہ رہی ہیں۔ اس گورکھ دھندے کی خوبصورتی یہ ہے کہ لاہور میں یہ واحد مقام ہے جہاں ہر فرقے کے مابین اختلافات ختم ہو جاتے ہیں تاریک دور میں یہ ایک امید کی تصویر ہے۔

گڑھی شاہو میں ڈیورنڈ روڈ کی محاذی سڑک پر کوئین میری کالج کے بالمقابل واقع قبرستان میں ایک چھوٹا سا مقبرہ ہے اور دیگر قبروں کے علاوہ چھ نمایاں قبریں ان چھ بیبیوں کی ہیں۔ اس قبرستان کی رسائی ایمپریس روڈ سے بھی ہے لیکن ایک تنگ سی گلی میں پیدل چل کر ایک چھوٹی سی مسجد تک پہنچا جاسکتا ہے اور مقبرے تک جو گلی جاتی ہے اس میں دکانوں کی ایک قطار بنی ہوئی ہے جن میں مختلف عقیدوں کے لوگوں کے لئے اشیاء فروخت ہوتی ہیں۔

اس بارے میں کہ یہ چھ خواتین کون تھیں؟ دو طرح کی روایات مشہور ہیں۔ ایک مقبول عام ہے اور دوسری عالم حضرات کی تحقیق شدہ روایت ہے۔ دونوں روایتوں میں خامیاں بھی ہیں اور کشش بھی ہے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ دونوں کو جتنی سادگی سے ممکن ہوسکے بیان کردیا جائے اور یہ قاری پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ خود فیصلہ کرے۔

مقبول عام روایت کچھ یوں ہے کہ ان چھ قبروں کی تعمیر تقریباً ایک ہزار برس قبل کی گئی تھی اور عوامی

روایت کے مطابق یہ مقبرہ حضرت رقیہؓ کی قبر پر افغانی حملہ آور محمود غزنوی اور اس کے حواریوں نے تعمیر کرایا تھا جو اسلام کے چوتھے خلیفہ رسول پاک کے چچیرے بھائی اور داماد حضرت علی ابن ابی طالب کی بیٹی تھیں اور حضرت امام حسینؓ کے کوفے میں ایلچی حضرت مسلم ابن عقیلؓ کی زوجہ تھیں۔ ایک اور روایت کے مطابق مقبرہ فی الواقعہ رسول پاکؐ کے خانوادے کی چھ خواتین کی قبروں کا احاطہ کئے ہوئے ہے جن میں حضرت رقیہ بھی شامل ہیں جس کا مطلب ہوا باقی خواتین حضرت ابن عقیلؓ کی بہن اور بیٹیاں ہیں۔

روایت کے مطابق اور یہی اس کی سب سے نمایاں قبر کی لوح پر لکھا ہوا ہے کہ یہاں بی بی حج مدفن ہیں۔ عوام کا عقیدہ ہے کہ بی بی حج حضرت رقیہؓ کا نام تھا اور وہ اپنی چند سہیلیوں کے ہمراہ سانحہ کربلا کے بعد لاہور آئی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہندو راجہ نے جو ان دنوں لاہور کا حاکم تھا ان کی آمد کی خبر پا کر انہیں اپنے دربار میں طلب کیا چونکہ یہ خواتین پردہ کرتی تھیں اس لئے انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ انہیں موت آ جائے۔

چنانچہ زمین شق ہوگئی اور مقدس خاتون اور ان کی ہمراہی دیگر خواتین زندہ دفن ہوگئیں۔ اس عوامی روایت میں اختلافی پہلو نکلتے ہیں کیونکہ یہ تو طے ہے کہ حضرت علیؓ کے خانوادے میں بی بی حج نام کی کوئی خاتون نہیں تھی۔ مزید برآں یہ بھی دلیل دی جاتی ہے کہ سانحہ کربلا کے بعد کسی مسلمان خاتون کا لاہور چلے آنا کوئی تک نہیں بنتا جہاں ہندوؤں کی حکومت تھی۔

بہرحال کنہیا لال نے لاہور کے بارے میں اپنی کتاب میں ان کا ذکر چھ بہنوں کی حیثیت سے کیا ہے جن کے نام بی بی حج، بی بی تاج، بی بی حر، بی بی گوہر اور بی بی شہباز تھے۔ جو سب عوامی روایت کے مطابق کربلا کے قتل عام جو 10 محرم 61ھ بمطابق 10 اکتوبر 680 کو ہوا، کے بعد مدینہ معظمہ سے روانہ ہوگئی تھیں۔ یہی نام ان چھ قبروں پر لکھے ہوئے ہیں کسی ایک کتبے پر رقیہ کا نام نہیں ہے حالانکہ جو بھی وہاں حاضری دیتا ہے اسے بی بی حج کی قبر رقیہؓ کے نام کی بتائی جاتی ہے۔

ایک جانب ایک لوح پر درج ہے کہ حضرت داتا گنج بخشؒ ہر ہفتے چھ بیبیوں کی فاتحہ پڑھنے کے لئے اس مقام پر کھڑے ہوتے تھے۔ اس تحریر سے اس مبینہ حقیقت کو تقویت ملتی ہے کہ قبریں ہزار سال سے پرانی ہیں اگر یہ سچ ہے تو یہ لاہور میں اولیں مسلمانوں کی قبریں ہوئیں اور غالباً برصغیر بھر میں قدیم ترین مسلمان قبروں کی نمائندہ قبریں ٹھہرتی ہیں۔

اس بات کا کوئی تحریری ثبوت موجود نہیں ہے اور نہ ہی قتل عام کے نتیجے کے طور پر رسول پاکؐ کے خانوادے کی خواتین کی کسی ایسی روانگی کا ذکر ملتا ہے۔ اسی وجہ سے چند ایک صاحب علم حضرات رقیہؓ کو سید احمد توختہ کی بیٹی شمار کرتے ہیں جو بارہویں صدی عیسوی میں لاہور میں رہائش پذیر تھے۔ اس کا ذکر کنہیا لال کے ہاں ملتا ہے جس کے مطابق بارہویں صدی عیسوی میں ایک عرب جس کا نام سید عابد زاہد ولی اللہ توختہ تھا لاہور میں آباد ہوگیا تھا۔ 604ھ میں وفات پر اسے اندرون شہر میں اکبری دروازے

میں واقع محلہ چہل بیبیاں میں دفن کردیا گیا۔

اس کی قبر آج بھی موجود ہے جہاں کتبے پر اس کی تاریخ وفات 604ھ مرقوم ہے۔ اس کی تصدیق کے لئے میں قبر پر حاضر ہوا تو اس کی حالت دیکھ کر اس کی قدامت کا اندازہ ہوا۔ قبر پر کبھی ایک نہایت نفیس مقبرہ ہوا کرتا تھا جسے مہاراجہ رنجیت سنگھ نے وسیع پیمانے پر نقصان پہنچایا تھا۔ اس قبرستان کو سکھ حکمران نے ہموار کرادیا اور اس پر غلام محی الدین شاہ پیرزادہ نے اپنی حویلی تعمیر کرلی۔ بہر حال اس نے کمال مہربانی سے سید توختہ شاہ کی قبر کو جوں کا توں رہنے دیا۔

آج بھی منہدم شدہ حویلی پیرزادہ کی جگہ پر ایک ذیلی گلی میں تعمیر ایک چھوٹے سے گھر کے ایک جانب سید توختہ کی قبر موجود ہے۔ چند ایک صاحب علم حضرات اس بات پر بھی قائم ہیں کہ سید احمد توختہ کی بیٹی کیچ مکران کے حکمران سے بیاہی ہوئی تھی اور وہیں اس کا انتقال ہوا تھا اور وہ کبھی واپس لاہور نہیں آئی تھی۔ ہم یہ ملاحظہ کرتے ہیں کہ حضرت اسماعیل جن کا مزار ہال روڈ پر ہے مسلمانوں کے لاہور کو فتح کرنے سے پہلے لاہور آچکے تھے چنانچہ اغلب ہے کہ چند ایک مسلمان خواتین بھی اسی زمانے میں لاہور آئی ہوں اور اگرچہ حضرت علیؓ کی حقیقی رشتے دار نہ ہونے کے باوجود سید ہوں۔

سید توختہ کی چھ بیٹیاں اندرون شہر منتقل ہوگئیں اور بی بی پاکدامن کے قبرستان کے نزدیک ایک حویلی میں آباد ہوگئیں۔ وہ اپنی پاکیزگی کی بنا پر مشہور تھیں اور جیسا کہ کہا جاتا ہے وہ ساری کنواری رہیں اس لئے ان سب کو صیغہ واحد میں بی بی پاکدامن کہا جاتا ہے۔ 615ھ میں جب افغانی حملہ آور سلطان جلال الدین خراسانی نے لاہور کو غارت گری کا نشانہ بنایا تو اردگرد کے علاقوں میں بھی لوٹ مار اور زنا بالجبر کا بازار گرم کردیا جیسا کہ جنگ جیتنے کے بعد تیمور یہ روایت ہے۔ بدترین حالات سے خائف ہوکر روایت کے مطابق چھ کی چھ بہنوں نے اکٹھے مل کر اپنی عصمت کی حفاظت کی دعا کی۔

عین اسی لمحے ایک زلزلہ آیا اور زمین شق ہوگئی اور چھ بہنیں اوران کی خادمائیں بے حرمتی سے بچنے کی خاطر زندہ درگور ہوگئیں۔ بعدازاں جب مقامی لوگوں نے بہنوں کے کپڑے زمین سے باہر نکلے ہوئے دیکھے تو پھر ان کی مناسب تدفین کردی گئی۔ یہ قبریں آج بھی دو حصوں میں موجود ہیں۔ ایک طرف حج، تاج اور نور ہیں جبکہ ایک اور احاطے میں حر، گوہر اور شہناز کی قبریں ہیں خادماؤں کی قبریں بھی ان قبروں کی حدود سے باہر موجود ہیں۔

لاہور کی تین مؤثر ہستیوں سے محرومی

لاہور لوگوں سے عبارت ہے، فی والواقعی غیر معمولی لوگوں سے۔ سادہ لوح، غیر معروف لاہور، سب کے سب اندرون شہر کے کسی نہ کسی محلے سے ہوتے ہیں۔ چند ایک نام پیدا کرجاتے ہیں دیگر گمنامی میں

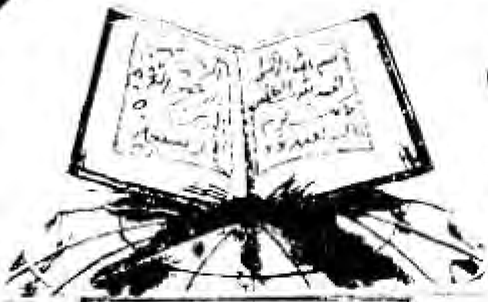
میں اطمینان کی مثال بن کر۔

عبداللہ ملک کے جنازے پر ہر عمر کے صحافیوں سے ملاقات ہوئی۔ مختلف میلان طبع کے حامل' ہر رنگ و روپ کے ایسے احباب جن سے پچھلے پچیس برس میں ملاقات نہ ہو پائی تھی۔ جب پاکستان ٹائمز ہی واحد انگریزی اخبار ہوا کرتا تھا۔ اسی ادارے کا اردو روزنامہ ''امروز'' تھا جو معاشرے کے ایسے عمدہ طبقے کی ذہنی بالیدگی کیا کرتے تھے جن کا آج چند لوگ ہی تصور کر سکتے ہیں۔ عبداللہ ملک ان دونوں اخباروں میں لکھا کرتے تھے جو دونوں ہی ہر لحاظ سے لفظ ''ترقی پسند'' پر کاربند تھے۔ ایک بار پھر لاہور کے صحافیوں کی وہ پوری برادری اکٹھی ہوگئی تھی جیسا کہ وہ ان دنوں میں ہوا کرتی تھی جب رواداری ایک متوقع وصف سمجھا جاتا تھا۔ نماز جنازہ پڑھانے والے امام صاحب نے طویل ترین دعا پڑھی جو میرا پہلا اتفاق تھا۔ ہر شخص اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہتا پایا گیا۔ عبداللہ ملک کے خاندان میں اختلاف رائے ایک متوقع طرز عمل تھا اور مذہب نہایت ذاتی معاملہ تھا اور اس پر بطور مسئلہ کبھی بحث نہیں ہوئی تھی کم از کم کھلے بندوں کبھی نہیں یہ بداخلاقی گردانی جاتی تھی۔

کسی اور موقع کی نسبت جنازے پر لوگ مدت مدید کے بعد بھی اکٹھے ہوجاتے ہیں ہر بات معاف کردی جاتی ہے ہمارے معاشرتی دستور میں یہ ایک غیر معمولی ناگزیر عمرانی زنجیر ہے۔ کوچہ چابک سواراں کا یہ شخص اصل گھڑسواروں کا نواحی علاقہ وہ ککے زئی علاقہ جہاں لوگ پیدا ہی بحث کرنے کے لئے ہوتے ہیں لیکن بالآخر ہر بحث کو نہایت رکھ رکھاؤ کے ساتھ سمیٹ لیتے ہیں۔ بعینہٖ ملک عبداللہ پوری زندگی کو نہایت سلیقے سے سمیٹنے میں کامیاب رہے جو معدودے چند لوگ ہی کر پاتے ہیں۔ اس لحاظ سے انہوں نے ہمیشہ نہایت وقار سے زندگی بسر کی اور ان کی یکسر لاہور پروری نے انہیں ایسا مامون کیا کہ انہیں کوئی گرہ احساس لاحق نہ رہا۔ اعجاز بٹالوی جو خاصے کمزور دکھائی دے رہے تھے سابق صدر رفیق تارڑ کو بتا رہے تھے کہ وہ ایسے عہد اور طبقے سے تعلق رکھتے تھے جہاں حدود واضح طور پر متعین تھیں۔ آغاز ہی سے یا تو آپ برطانیہ کے طرفدار تھے یا پھر مخالف اور آزادی کے حمایتی۔ بعدازاں یا تو آپ آزادی اور جمہوریت کے حامی تھے یا اس کے برخلاف۔ وہ نہایت بیدار مغز تھے اور سادہ منش۔ باریش سابق صدر نے رضامندی کے طور پر سر کو جنبش دی۔ اگر جلال کی وجہ سے نہیں تو شاید پاکستان کے سب سے قابل احترام وکیل اور استاد کی تائید میں ایسا کیا ہو۔

مجھے بچپن ہی سے عبداللہ ملک کو دیکھنے اور ملنے کا موقع مل گیا تھا کیونکہ وہ میرے والد کے دوست تھے اور ماڈل ٹاؤن کے جے بلاک میں میرے دادا کے گھر والی سڑک کے عین پار رہا کرتے تھے۔ میری دادی نے انہیں اندرون شہر بطور استاد سکول میں پڑھایا تھا اور ملک صاحب ہمیشہ ان سے تعظیم سے پیش آتے تھے حتیٰ کہ جب وہ بہت ضعیف ہوگئی تھیں اور لڑکھڑاتی چال سے ڈاکٹر کے پاس ٹیکا لگوانے جاتی تھیں تو جب تک وہ روانہ نہ ہو جاتیں وہ ساکت کھڑے رہتے تھے اور ان کا سر نہایت تعظیم سے جھکا ہوتا

"دُعا تقدیر بدل دیتی ہے" (حدیثِ رسولؐ)



سیارہ ڈائجسٹ کی ایک اور ایمان افروز پیشکش



دُعا نمبر

شائع ہو گیا ہے

- قرآنی دُعائیں۔
- عظیم پیغمبرانِ خدا کی وہ دُعائیں جو نسلِ انسانی کے لیے نجات اور ہدایت کا باعث بنیں۔
- خالقِ کائنات کے آخری نبی محمد رسول اللہؐ کی تمام مسنونہ دُعائیں جو رحمت اللعالمینؐ کی ذاتِ برکات کا مقدس پرتو ہیں۔
- صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی دُعائیں۔
- آئمہ اکرام اور اسلام کے عظیم اور باکمال صوفیائے عظیم کی بابرکات دُعائیں۔

جدید دُنیا کے گھمبیر اور اعصاب شکن مسائل میں گھرے
پریشان حال انسان کے تمام مسائل کا تشفی آمیز
رُوحانی اور ایمانی علاج

سیارہ ڈائجسٹ 244 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور
فون نمبر: 7245412

تھا۔ وہ یکسر دل کی گہرائیوں تک ایک غیر معمولی لاہوری تھے۔

لیکن پھر ان کے جنازے نے ایک اور جنازے کی یاد دلا دی جس میں، میں نے نومبر 1984ء میں ماڈل ٹاؤن کے اسی جی بلاک کے قبرستان میں شرکت کی تھی اور وہ جنازہ فیض احمد فیض کا تھا۔ جو بات مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کس طرح ایک اور عظیم پنجابی شاعر اپنے بچھڑنے والے دوست کے جنازے میں شرکت کے لئے پہنچا تھا اور میں عظیم لاہوری شاعر استاد دامن کی بات کر رہا ہوں۔ یہ عظیم شخص شدید بیمار تھا اور تقریباً چلنے پھرنے سے قاصر لیکن وہ کسی نہ کسی طرح جنازے میں شرکت کے لئے ایک رکشہ میں پہنچ گیا تھا۔ جن لوگوں نے اچھے دنوں میں ان کا پہلوانوں والا جثہ دیکھ رکھا تھا ان کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا کہ استخوانی پنجر کی طرح دامن دو افراد کی مدد سے چل رہا تھا۔ فیض اور دامن کی باہمی دوستی بہت گہری تھی اور فیض کے انتقال سے چند روز قبل دونوں نے اکٹھے منو بھائی کے ہاں عشائیے میں شرکت کی تھی۔ فیض کے جنازے پر استاد دامن بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ اب ان کی باری ہے چنانچہ فیض کے انتقال کے فقط 13 روز بعد 3 دسمبر کو دامن اپنے دوست سے جاملا۔

استاد دامن کا اصل نام چراغ دین تھا اور وہ اندرون شہر کے لوہاری دروازے کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے اپنے صلاح کار ''استاد ہمدم'' کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پہلے پہل ''ہمدم'' تخلص اختیار کیا لیکن پھر کچھ ہی عرصے بعد ''دامن'' رکھ لیا۔ اپنی پہلی نظم دامن نے آل انڈیا کانگریس کے جلسے میں جو موچی دروازے میں منعقد ہوا تھا پہلی بار سٹیج سے عوام کے پنڈال میں سنائی۔ اس جلسے کے نمایاں مقرر جواہر لال نہرو تھے جنہوں نے فوراً دامن کے ساتھ ذاتی تعلق قائم کر لیا۔ بہت برسوں بعد جب دامن ایک پاک و ہند مشاعرے میں شرکت کے لئے دہلی گیا تو اس نے اپنے اشعار سے مشاعرہ لوٹ لیا اور حاضرین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''لالی اکھیاں دی پئی دسدی اے روئے تسی وی او روئے اسی وی آں'' (آنکھوں کی سرخی بتا رہی ہے کہ ہم دونوں روئے ہیں۔)

پنجاب کی تقسیم سے دامن کو بُری طرح صدمہ پہنچا تھا۔ وہ دوستوں اور شاگردوں، جن میں زیادہ تر ہندو اور سکھ تھے کے بچھڑنے پر ٹوٹ کر رہ گئے۔ ان کی مصیبتوں میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب لاہور میں لوٹ مار کے اس دور میں ان کی شریک حیات کا انتقال ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ قبرستان تک جنازہ لے جانے کے لئے دامن کو مزدوروں کو کرائے پر حاصل کرنا پڑا تھا۔ اس حادثے نے انہیں ایک دروں بین شخص بنا کر رکھ دیا اور وہ شہر کی ایک کوٹھڑی میں منتقل ہو گئے۔ دہلی میں نہرو نے فی الواقع استاد دامن سے التجائیں کیں حتیٰ کہ پاؤں کو بھی چھوا کہ وہ ہندوستان میں قیام کر لیں، انہیں معقول پنشن اور بے حد عزت مندانہ زندگی بسر کرانے کا بھی وعدہ وعید کیا گیا لیکن دامن دل کی اتھاہ گہرائیوں تک لاہوری تھے اور ہر غیور لاہوری کی طرح وہ شہر کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ مکمل غربت اور جبر کی زندگی کی جانب لوٹ آئے۔ باقی ماندہ زندگی انہوں نے مجرد و تارک الدنیا کی حیثیت سے بسر کی۔

عبداللہ ملک کے جنازے پر میں کھڑا ہوا اس جگہ کو بغور دیکھ رہا تھا جہاں استاد کلاں رکشے سے اُترا تھا مجھے یاد ہے ایک بار عبداللہ ملک نے مجھے اس واقعہ کے حوالے سے کہا تھا ''ایک دن ایسا آئے گا جب ہم نہیں ہوں گے' جب لاہور کے عوام ماتم کناں ہوں گے کہ ہمارے جاہل اونچے طبقے کے حکمران اس شہر کے نفیس ترین خواتین و حضرات کے ساتھ کیسا ناروا سلوک کرتے رہے ہیں۔''

ایناں آزادیاں ہتھوں برباد یارو
ہوئے تسی وی اڈ ہوئے اسی وی آں

سول اینڈ ملٹری گزٹ نے چرچل کی زندگی کو کیسے سنوارا؟

بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ ایسے افراد کی ایک وسیع قطار ہے جو لاہور آئے بعدازاں اپنی حیات ہی میں تاریخ میں نام پیدا کرگئے۔ انگریز راج میں جو افراد زیادہ معروف ہوئے ان میں کپلنگ خاندان کے باپ اور بیٹا' سرونسٹن لیونارڈ سپنسر چرچل ہیں جو جنگ عظیم دوم کے دوران مشہور برطانوی وزیراعظم اور اپنے دور کے اعلیٰ ترین معیار کے مقرر رہے ہیں۔

لاہور کے بارے میں تحقیق کے دوران جن دلچسپ ترین ذرائع نے مجھے خاصا لبھایا ایک تو کپلنگ کی وہ دستاویز جو بنیادی طور پر لاہور پر مرتکز ہیں اور دوسرے چرچل کے ہندوستان میں قیام کے دوران اس کی مکمل دستاویز۔ میری بیٹی نے جو کیمبرج میں رہتی ہے مجھے اچھا خاصا مواد بھیجا ہے جو سرونسٹن چرچل اور ان کی صحافت اور لاہور کے سرکردہ روزنامہ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' میں ان کی یورشوں سے متعلق ہے۔ یہ لاہور کی روزمرہ زندگی کا نہایت اہم پہلو ہے جس کے بارے میں کوئی خاص تحقیق نہیں کی گئی ہے۔ اگر اس پہلو پر بھی دو وجوہات کی بنا پر سرسری جائزہ لیں تو یہ ہمارے قدیم شہر سے انصاف ہوگا۔ اول تو ہمارے شہر کے اس اہم پہلو پر مزید تحقیق پر آمادہ کیا جائے اور دوم ان ماہرین کے علم میں اضافہ کیا جائے جو اس موضوع پر اخباروں میں تحریر کرتے رہتے ہیں۔

برطانوی ہندوستان میں حاصل کردہ تجربے کی بنا پر ہی اس نے اپنا عالمی نقطہ نظر استوار کیا۔ روس سے متعلق ہر معاملے پر اس کی پیدائشی نفرت کی تصدیق اس کے شمال مغربی سرحد میں تجربات اور روسیوں سے بھرے افغانستان میں ان کی جاسوسی کی مہمات سے ہوتی ہے۔ اس قسم کا مواد جسے کپلنگ نے اپنی تحریروں میں استعمال کیا چنانچہ سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نامہ نگار کی حیثیت سے انہیں ''عظیم کھیل'' کا تجربہ رہا۔ یعنی عالمی تسلط اور بحرالہند کے گرم پانیوں تک رسائی کے مقابلے کی دوڑ باقی ماندہ زندگی انہوں نے اس عظیم کھیل کو جیتنے کی کوششوں میں بسر کی۔ اگرچہ یہ جنگیں اس مقام سے بہت دور دراز کے علاقوں میں لڑی تھیں۔

جنگ واٹرلو نے برطانوی خانہ جنگی کے واقعات کے بعد سے راندۂ درگاہ ڈیوک آف مارلبرو کے

خاندان کو ایک بار پھر امتیازی حیثیت عطا کر دی۔ وہ برطانوی خانہ جنگی میں پارلیمانی پارٹی کے رکن تو نہ تھے لیکن سرتاپا بادشاہی خاندان کے ایک فرد تھے۔ وہ 1874ء میں پیدا ہوئے۔ مشہور فوجی تربیت گاہ سینڈھرسٹ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1894ء میں گھڑ سوار فوج کے دستے حصار چہارم میں تعینات ہو گئے۔ انہیں جنگ کا اولیں مختصر تجربہ ہسپانوی افواج کے ہمراہ لڑتے ہوئے ہوا جو کیوبا کے گوریلوں کے خلاف جنگ آزما تھیں۔ تھوڑے عرصے کے بعد وہ گھر لوٹ آئے اور پھر انہیں ہندوستان بھیج دیا گیا وہاں جاتے ہی ہندوستانی فوج کے ہمراہ شمال مغربی صوبہ سرحد میں مشہور مالاکنڈ مہم میں بپھرے ہوئے قبائلیوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ انہی ایام کا واقعہ ہے کہ نوجوان ونسٹن چرچل لاہور آئے اور ایک روز روزنامہ ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے دفتر گئے اور انہیں شمال مغربی صوبہ سرحد میں جنگی نامہ نگار کی حیثیت سے کام سونپ دیا گیا یعنی وہ فوجی اور صحافی کے دہرے پیشے سے منسلک ہو گئے۔ یہ بطور صحافی ان کے شاندار پیشے سے وابستگی کا آغاز تھا چنانچہ دیگر اشیاء کے علاوہ انہیں ہندوستان' افغانستان' سوڈان اور آخر میں جنوبی افریقہ کے ممالک سے خبریں ارسال کرتے ہوئے پایا گیا۔

پہلی نمایاں سلسلہ وار خبریں مالاکنڈ کی میدانی فوجوں کے بارے میں تھیں۔ اس کے فوراً بعد تیرہ مہماتی فوج کے قابل ذکر کارناموں کے بارے میں نہایت شاندار سلسلہ وار خبروں کی ترسیل تھی۔ اس کے علاوہ الگ الگ صحافتی فن پاروں پر مبنی سلسلہ وار تحریریں بھی قابل ذکر ہیں جو افغانستان کے اندر دور دراز علاقوں سے لے کر سمرقند تک ان کی جاسوسی مہمات کے بارے میں تھیں۔ یہ صحافتی فن پارے 21 فوجی مراسلات پر مشتمل تھے جو بعد ازاں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ ان فوجی مراسلات کے معیار کا ذکر کپلنگ کی دستاویزات میں ملتا ہے جو برطانوی عجائب گھر میں موجود ہیں یہ ان دنوں کی برطانوی سوچ کو سمجھنے میں خاصی مدد دیتے ہیں لیکن ونسٹن چرچل کی کہانی میں لاہور کی گنجائش کہاں نکلتی ہے؟ اس کی وضاحت کپلنگ کی ڈائری میں کی گئی ہے۔

''آج مجھے لارڈ رینڈولف چرچل کا بیٹا ملنے آیا جو ڈیوک آف مارلبرو ہفتم کا سب سے چھوٹا بیٹا ہے وہ گھڑ سوار دستے میں بہادر آفیسر ہے۔ خوبصورت ہے' خوش طبع' پرجوش اور ہر دل عزیز ہے وہ ایک نہایت شاندار جنگی نامہ نگار بنے گا کیونکہ وہ مہم جوئی کے علاقے کے عین بیچوں بیچ تعینات ہے۔ چنانچہ ایک عظیم انگریز کے صحافیانہ پیشے کا آغاز لاہور ہی سے ہوا۔ مجھے یاد ہے میرے والد نے جو خود ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے ایڈیٹر تھے مجھے بتایا تھا کہ جس کرسی پر میں بیٹھا تھا وہاں کبھی سر ونسٹن چرچل بیٹھا کرتے تھے چنانچہ ان کی کہانی میرے لئے ہمیشہ دلکش رہی ہے۔

سول اینڈ ملٹری گزٹ کے جنگی نامہ نگار کی حیثیت سے چرچل کے تجربات اس عظیم شخص کی پہلی کتاب کی شکل میں منتج ہوئے۔ اس کتاب نے جس کا عنوان تھا ''مالاکنڈ کی میدانی فوج کی کہانی'' فوراً کامیابی کو چوم لیا اور اس پیشے کی بنیاد رکھ دی جس کی بلندیوں کو چھونا بہت کم لوگوں کو

اپنی زندگی میں نصیب ہوتا ہے۔ اس سے چرچل کے ادبی پیشے کا بھی آغاز ہو گیا۔ اولیں اشاعت میں اس کتاب کے لکھے جانے میں سول اینڈ ملٹری گزٹ کے کردار کا ذکر موجود ہے۔ ان کی دوسری کتاب کا عنوان ہے ''دریا کی جنگ'' جو سوڈان میں ان کے مشاہدات پر مبنی ہے جہاں وہ جنرل کچنر کی مہماتی فوج میں شامل تھے۔ آخری روایتی جنگوں میں سے ایک میں وہ ''جنونی درویشوں'' سے نبرد آزما ہوئے جس میں گھڑ سوار دستوں کے حملوں کا بندوبست تھا۔ اس جنگ سے ان کے ذہن میں مسلمانوں سے متعلق گہرے شکوک وشبہات جاگزیں ہو گئے جس کا بیج شمال مغربی صوبہ سرحد اور افغانستان میں ان کے مشاہدات کے دوران بویا جاچکا تھا اور جس نے بعدازاں زندگی میں انہیں اسرائیل کے موقف کی حمایت پر مائل کیا۔ ستم ظریفی کی بات ہے کہ اس دوسری کتاب پر کپلنگ نے لاہور میں نظرثانی کی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے ایک ناول لکھا پھر چرچل لندن کے روزنامہ ''مارننگ پوسٹ'' کی جانب سے جنگ بوئیر کی وقائع نگاری کے لئے جنوبی افریقہ چلے گئے ان کے مراسلات کو چرچل کی اجازت سے مارننگ پوسٹ سے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں مکرر شائع کیا جاتا تھا۔ ایک مہینے کے اندر اندر وہ قید بھی ہوئے اور پھر قید سے فرار بھی ہو گئے۔ اپنے فرار کی داستان بیان کرنے پر وہ پوری دنیا میں مشہور ہو گئے۔ یہ ان کے سیاسی پیشے کا آغاز تھا باقی کہانی تاریخ ہے۔

سرونسٹن چرچل نے اپنی کتابوں اور خطوط میں لاہور کے بارے میں ڈھیروں لکھا ہے انہوں نے توجیح کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ ایک روح پرور شہر ہے جس کا اپنا دماغ ہے اس کا حسن دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ آپ کو اپنے حسن کی طرف مائل کرتا ہے۔'' لاہور میں اپنے ایک دوست کو خط میں تحریر کرتے ہیں۔ ''مجھے تم پر رشک آتا ہے کیونکہ تم لاہور کی راحتوں کے مزے لیتے ہو۔'' لیکن نوجوان چرچل کا حقیقی شوق اس کی پولو کے کھیل سے محبت تھی۔ لاہور پولو کلب کے سرکاری اعداد و شمار کی دستاویزات میں اس میدان میں ان کی مہمات کا خصوصی اندراج ہے۔ بعدازاں زندگی میں جب پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے موقع پر انہوں نے ذکر کیا کہ ہندوستان میں دیگر مشاہدات میں انہیں ہمیشہ یاد آتا ہے کہ وہ لاہور میں پولو کے کھیل سے کس قدر لطف اندوز ہوتے تھے۔

نوجوان ونسٹن چرچل کو تیز گھڑ سواری کی عادت تھی۔ لیکن جب لاہور چھاؤنی کے مقام میاں میر سے نمائش گاہ تک نئی سڑک بن رہی تھی تو وہ اس کے کنارے کنارے سبک خرامی سے گھڑ سواری کرتے تھے ان کی ابتدائی ڈائریوں میں ان مشاہدات کا خاص طور پر ذکر ہے۔ ''ٹھنڈی سڑک'' نے یقیناً دنیا کے ایک عظیم ترین اور منجھے ہوئے سیاسی مدبر کی صورت گری میں ایک تشکیلی کردار ادا کیا تھا۔



کیپٹن لیاقت علی ملک
malik.psp33@gmail.com
http://www.facebook.com/liaqatmalick?fref=ts

میں اور میں......!

"میں" سے "میں" کی لڑائی میں انسان نڈھال ہو جاتا ہے۔ نہ سانس کی ڈوری ٹوٹتی ہے اور نہ سکون میسر آتا ہے۔ قانون قدرت کی خلاف ورزی کی لذت گرچہ وقتی ہے مگر اس کا سواد اور چسکا انسان کو جانتے بوجھتے بھی آگ میں چھلانگ لگانے گلے پر چھری چلانے اور عشق و محبت کے نام پر پرائی مچھلیں سمانے پر مجبور کرتا ہے۔

انسان کے دکھوں اور مصائب کی اصل وجہ بیان کرتی پُر اثر تحریر



قدرت نے انسان کو "علما آدم اسماء کم" عطا کرکے تمام علوم اس کی فطرت کا حصہ بنا دیئے۔ احسن تقویم خلق کرکے نوری، ناری اور تمام مخلوق پر برتری بھی عطا کردی۔ اور جس نے اس برتری کو تسلیم کرنے میں صدائے احتجاج اور اختلاف بلند کی اور اپنی تسبیح اور عبادت پر ناز اور غرور کیا اور اس انسان کو جس کو اس کے سامنے تخلیق کیا گیا اس کی تکریم کرنے کو اپنی عبادت کی تذلیل تصور کیا وہ راندہ درگاہ ہوا۔ دربار سے نکال دیا گیا اور رہتی دنیا تک ملعون و مطعون ٹھہرا۔ اور جس انسان کے لیے یہ سب کچھ خلق ہوا وہ اپنے اندر ازلی بڑائی اور غرور لیکر زمین پر آموجود ہوا۔ اور اسی خالق کے حکم کے خلاف ہر روز صدائے احتجاج بلند کرنے لگا۔

خالق خود بھی یقیناً اپنی ہر دو مخلوق کی کارستانیوں

سے آگاہ ہوگا کہ جو ہمیشہ کا تابعدار اور سجدہ گزار تھا اس کے دل میں عبادت، قرب اور تسبیح پر ناز تھا اس لئے اس نے خاکی کو سجدہ کرنا اپنی ریاضت کی توہین تصور کرتے ہوئے زندگی بھر کی ملامتیں ضرور کمائیں مگر خدا کو صرف یہی کہا کہ "مجھے تم سے محبت ہے اور میں تیرے علاوہ کسی اور کے آگے سر جھکانا اپنی محبت کی توہین تصور کرتا ہوں! میں نے زندگی بتا دی تیری تقدیس اور تسبیح میں۔ میری سرشت میں اپنی محبت ڈال کر اب مجھے اذن دیتے ہو کہ کسی اور سے محبت کرو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ یہی میرا حاصل زندگی ہے۔ یہی میری زندگی کی کمائی ہے اور میرا اثاثہ ہے۔ رہتی دنیا تک لوگ مجھے دھتکارتے رہیں گے۔ دشنام اور طعن کرتے رہیں گے۔ مگر ہر پتھر، کنکر، لعن اور دشنام کے ساتھ میری محبت میں اضافہ ہوگا۔ کیونکہ یہ دراصل مجھے برا نہیں کہیں گے بلکہ اقرار کریں گے کہ میں نے عالمین کی تذلیل کا سودا کیا ہے مگر محبت میں دوئی برداشت نہیں کی۔ یہ میری محبت کا اقرار ہے.....! اور یہ میرے سامنے چار عناصر سے پیدا کیا جانے والا خاکی جسے تو مسجود بنانا چاہتا ہے یہ تیرے سے زیادہ میرا تابع ہوگا۔ اور میں روزِ قیامت تیرے سامنے اپنی محبت اور اس کی ظلمت لیکر حاضر ہونگا۔ اور پوچھوں گا کہ اگر تخلیق کائنات کے اس منصوبے میں میرا کردار ایسا ہی لکھنا تھا تو ہم دونوں بے قصور ہیں۔ میری محبت اور اس کی اذیت ہر دو کا اذن تیرے پاس ہے۔ پھر یہ حساب کتاب کے رجسٹر کس لئے..... بس عمر گزر گئی تیرے نام کے ٹھوکے کھاتے ہوئے اب ایک بار دیدار کی نعمت سے نواز دے پھر چاہے انسان کے گناہوں کے عذاب بھی مجھے دے دینا..... کیونکہ اس نے وہ کیا جس کا تو نے اسے حکم دیا ہے یا جو میں اپنی انا کی تسکین کے لئے اس سے کروا سکا تاکہ میں یہ ثابت کرسکوں کہ خاکی تیری محبت کے لائق نہیں .....! اس میں سب بے قصور ہیں ہاں معاملہ محبت کا تھا.....! اور محبت میں سود و زیاں کا ہوش نہیں رہنے دیتا۔ سوچ اور فکر تو بہت دور کی بات ہے!"

جبکہ زمان و مکاں اور گھڑی کی سوئیوں سے آزاد اس محبت اور عبادت پر ترجیح دیکر جس چیز کو اشرف المخلوقات بنا کر تمام مخلوقات سے سجدہ کروایا گیا وہ انسان بھی اپنی تخلیق پر نازاں اور مغرور ہوکر احساس برتری کا شکار ہوا اور اپنے خالق کو فراموش کر بیٹھا۔ سجدہ نہ کرنے والا تو اپنی محبت کے زعم میں دو عالم میں تذلیل حاصل کرکے بھی محبت کی تکمیل کرکے سکون حاصل کرنے کا مگر مسجود ہر روز کی نافرمانی سے آلودہ ہوکر شاید کبھی بھی چین حاصل نہ کرسکے اور راندۂ درگاہ ہوکر دربدر کی ٹھوکریں اور چوٹیں کھاتا اور سجدوں میں ڈولتا پھرے!

غرور و تکبر ہر انسان کی سرشت کا خاصا ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ اس کی کچھ وجوہات جینیاتی ہیں اور کچھ کائناتی۔ مگر قدرت نے ہمیشہ ہر نظام کی خامیوں کا تدارک بھی کر رکھا ہے۔ جہاں انسان کو قدرت نے عالم برزخ میں تخلیق کرکے اعلیٰ و ارفع بنایا وہاں اس کی تخلیق کا عمل ایسا بنا دیا کہ اگر انسان صرف اس عمل کا بغور جائزہ لے تو شاید پوری زندگی شرم سے سر نہ اٹھائے۔ مگر سانپ اور انسان سر اٹھائے بغیر کب رہ سکتے ہیں!

دو انسانوں کے دو غلیظ ترین حصوں کا ملاپ اور پھر اس ملاپ کے دوران پانی کے غلیظ ترین قطروں سے ایک انتہائی مغرور انسان کی تکمیل۔ ایک ایسا انسان جو اپنے رنگ، نسل، خون کے بوتے پر زمین پر اکڑ اکڑ کر چلتا ہے۔ ایک گندے قطرے سے پیدا اور جس کے شاہ کی صفائی کے لئے بھی پانی اور جسم کو بار بار دھونا پڑتا ہے۔ وہ پھر بھی ....

270 دن تک خون اور دوسرے مادوں پر پرورش پانے والا انسان جب جسم کے اسی غلیظ ترین مقام سے برآمد ہوکر اپنی بڑائی کی ثنائی کرتا ہے اور دوسرے اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ اس کو خلق کرنے والے خدا کی بھی نافرمانی کرتا ہے تو قدرت اس کو ''فبای الاء ربکما تکذبٰن'' کہہ کر جھنجھوڑتی ہے۔ جو اہل شعور ہوتے ہیں وہ شرمندگی سے سرنہیں اُٹھاتے اور سربسجود رہتے ہیں اور اس کے ذکر سے سکون اور آرام کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ اور اہل دنیا اس سے درخور اعتناء کرکے سب کچھ زور بازو کا کمال تصور کرکے عمر بھر ادھر اُدھر سر پٹختے رہتے ہیں اور اپنی بے چینیوں اور بے تابیوں کے ہاتھوں دربدر اور رسوا ہوتے رہتے ہیں!

غرور وتکبر ہر دو کی فطرت کا خاصا ہے اور جہاں غرور تکبر اور انا ہو وہاں محبت فروغ نہیں پا سکتی۔ کیونکہ یہ خودنمائی اور بڑائی کی بجائے خود کی نفی پر پروان چڑھتی ہے۔ محبت کی منزل کا پہلا قدم اور زینہ ذات کی راکھ کی دھول پر قدم رکھ کر سفر کا آغاز کرنا ہے۔ محبوب کی راہ کی خاک اور اس کے اشارۂ ابرو اور جنبش لب سے پہلے اس کی سوچ اور دل ودماغ میں پیدا ہونے والے خیال سے ماقبل اس کی تکمیل اور تعمیل کرنا محبت ہے۔ محبت میں، میں اور تُو، کیا، کیوں، کیسے، کس لئے اور کب نہیں ہوتا۔ اس میں بلاسوال، جواب، نفع نقصان، دھیان صرف محبوب کے احکام کی من وعن تعمیل پر ہوتا ہے۔ اسی لئے اوّالذکر پوری زندگی دوری میں حضوری کو ڈھونڈتے ہوئے لعنت اور ملامت کے ساتھ جبکہ موخرالذکر وقفہ وقفہ سے چھوٹی چھوٹی محبتیں کرکے اصل اور ابدی محبت سے دُور اور رسوا بے قرار رہیں گے۔ اور ہر دو کے خمیر میں اضطراب اور اضطرار محبوب کے وجود کی طرح قائم اور دائم رہے گا۔ تاوقتیکہ وہ یکجا ہوکر اصل کا جزو نہ بن جائیں۔ کیونکہ ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے ہاں وقت اور سمے کی قید اس میں شامل نہیں ہوتی!

قدرت نے انسان کو تمام نعمتیں عطا کیں ماسوائے سکون اور اطمینان کے۔ اور انسان جسم کے ہر حصے کا سکون تلاش کرنے کے لئے دریا کی موجوں کی طرح سر مارنے لگا۔ اس دوران کبھی دیوانگی، فرزانگی اور بیگانگی اور کبھی حیوانگی اس پر غالب آجاتی ہے۔ مگر اس کی تلاش جاری ہے! اس سفر میں کچھ لوگ جسمانی اور کچھ روحانی طور پر مسلسل سفر (suffer) کرتے رہتے ہیں۔ نامکمل سے مکمل تک کی جست طے کرنے کے لئے سب کے راستے جدا جدا ہیں۔ نروان اور سکھ کی تلاش میں کتنے دکھ انسان کے راستے میں آتے ہیں اس کا شمار ہم اور ہمراہ کے علاوہ کسی کو نہیں ہوتا۔ ہم میں وہ میرے ساتھ ہوتا ہے اور ہمراہ کسی قسمت والے کو نصیب ہوتا ہے۔ جب ہم اکٹھے ساتھ چلتے ہیں تو کانٹوں کا احساس، آبلوں میں مٹھاس، کنکروں میں پھولوں کی باس اور دشنام میں آلام کی بجائے آرام محسوس ہوتا ہے۔

ایک لمحہ بھر کے سکھ کے لئے انسان عمر بھر اور صدیوں کے دُکھ خرید کے اپنی جھولی میں ڈال لیتا ہے۔ صحرا کے ذروں کی طرح دُور سے پانی مگر قریب آنے پر تپش میں اضافہ، جسم کی نقاہت، پیاس کی شدت، گرمی کی حدت اور اُمید کی جگہ ناامیدی و نامرادی کی شدت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ انسان نڈھال ہوکر گرنے لگتا ہے۔ مگر ایک بار پھر قدرت اس کو اٹھاتی ہے، ساکن اور مُردہ جسم میں زندگی کی ایک لہر آتی ہے۔ آنکھوں میں ہلکی سی روشنی آتی ہے اور ایک نئی آس، امید اور لگن کے ساتھ انسان پھر اپنے قدم اٹھاتا ہے اور اس اُمید ناامیدی کے عالم

میں ہر انسان اپنے اپنے خدا کو ڈھونڈنے کی بجائے اپنے اپنے حصے کے دُکھ جھیلتا رہتا ہے۔ مضطرب رہتا ہے! مگر سفر (suffer) جاری رہتا ہے! انجانی منزل کا سفر (suffer)..... !

زندگی کے اس سفر (suffer) میں کچھ لوگ آغاز میں ہی ایک سے لو لگا کر ہمیشہ کے لئے من کو مار کر، من، من والے کے حوالے کر کے، اپنی ذات کو ختم کر لیتے ہیں۔ پھر وہ موت اور زندگی کی قید سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ کچھ زندہ رہ کر موت کو گلے لگا لیتے ہیں اور کچھ مر کر بھی زندہ رہتے ہیں۔ کچھ قبروں میں رہ کر بھی زندوں سے بہتر اور کچھ محلات میں رہ کر بھی قبر کے عذاب میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہوتا ہے جو سکون کی تلاش مال و زر اور جواہرات میں کرتا ہے۔ پُر آسائش زندگی، زن، زر اور زمین کی فراوانی ہوتی ہے۔ مگر نیند کی گولیاں، شوگر، بلڈ پریشر، ہائپر ٹینشن کی ارزانی ہوتی ہے۔ یہ لوگوں کو عمرہ کروا کر، محفل نعت ﷺ میں پیسے لٹا کر، گیارہویں کا لنگر، محرم کی نیاز اور پھر عید میلادالنبی ﷺ کی لائٹوں میں سکون تلاش کرتے ہیں! کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو سکون کے لئے کبھی ایک جسم کے اندر چھپتے ہیں اور کبھی دوسرے سے کھیلتے ہیں۔ پھر روتے پیٹتے، ماتم کرتے گناہ کے خوف سے خدا کی طرف بھاگتے ہیں۔ توبہ کرتے ہیں، کچھ وقت نماز، روزہ، صوم و صلوٰۃ اور تسبیح کے ساتھ گزارتے ہیں بعض تو داڑھی بڑھا کر شلوار ٹخنوں سے اوپر کر کے تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ نفلی روزے اور سہ روزے پر بھی جاتے ہیں پھر کوئی چیز ان کو اپنی اور کھینچ لیتی ہے اور

انسانی احساسات کا پتا چلانے والی عینک کی تیاری

اگر آپ اپنے اردگرد موجود لوگوں کے احساسات اور جذبات جاننا چاہتے ہیں تو اس کے لئے پریشان ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں کیونکہ مائیکروسافٹ نے ایک ایسی عینک کی تیاری پر کام شروع کر دیا ہے جسے پہن کر آپ اپنے اطراف میں موجود لوگوں کے موڈ اور ان کے احساسات کے بارے میں پتہ لگا سکیں گے۔ امریکہ کے پیٹنٹ اینڈ ٹریڈ مارک آفس کے مطابق مائیکروسافٹ اس وقت ایک ایسے چشمے کی تیاری میں مصروف ہے جس کو پہن کر آپ اپنے اردگرد موجود لوگوں کے احساسات کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں گے۔ جدید ترین ٹیکنالوجی کا شاہکار یہ نظام ایک عینک، سر پر پہنے جانے والے ایک شفاف ڈسپلے اور ایک سینسر پر مشتمل ہوگا جو اپنی مقررہ حد میں آنے والے انسانوں کے صوتی اور بصری تاثرات بھانپ لیتا ہے۔ یہ نظام اپنے مائیک، کیمرے اور دیگر حساس سینسرز کو استعمال کرتے ہوئے انسانی چہرے کے تاثرات، حرکات، انداز گفتگو اور ماحول میں ہونے والی تبدیلیاں مثلاً درجہ حرارت اور آواز کی کوالٹی کو بھی سمجھ سکے گا۔

(مرسلہ: حیدر ناظم۔ لاہور)

اچانک پھر چند دن، ہفتے یا مہینے گناہ یا زنا کرتے ہیں، خدا کو بھول جاتے ہیں، جیسے وہ تھا ہی نہیں۔ مگر پھر اچانک کسی چھوٹی سی ٹھیس، ٹھوکر اور کسی سے اُلجھ کر پھر تو یہ یاد آجاتی ہے تو اللہ کی طرف بھاگ کر سکون حاصل کرتے ہیں، روتے ہیں، دکھوں سے نجات حاصل کرتے ہیں اور کچھ عرصہ خدا تعلقی کے اس حصار میں گزار کر دوبارہ پہلی ڈگر پر چل پڑتے ہیں۔ یوں گناہ اور ثواب کے درمیان پینڈولم (Pandolum) کی طرح جھولتے رہتے ہیں۔ مضطرب اور پرسکون۔ اضطراب سے سکون اور سکون سے اضطراب کا وقت بہت مختصر اور کچھ کا طویل تر ہوتا ہے۔ مگر یہ اپنے اپنے مقدر اور نصیب کی بات ہے۔ تاریخ، بحر میں جل کر اور خاکی خاک میں مل کر بھی عمر بھر خوار ہی رہتا ہے۔ جب تک ہر دو کا تکبر اور غرور خاک میں مل کر خاک اور تر میں مل کر نارنہ ہوجائے!

جستجو انسان کی فطرت کا خاصا ہے۔ اور شجر ممنوع کا پھل ہمیشہ ہی اپنی اور کھینچتا ہے اور اندر کی ''کھوج'' کے سامنے جتنے مرضی بند باندھیں سنگل ماریں، قفل زنی کریں یہ اس کی اور ایسے ہی لے جاتی ہے جیسے لوہے کی ہر چیز اپنے کعبے ''بوتھیا'' کی اور کھنچی چلی جاتی ہے۔ بنا ڈور، بنا ہوا لہراتی، بل کھاتی۔

ممنوع ہر دور میں مقبول اور ممدوح رہا ہے۔ اور اس کو حاصل کرنے کے لئے انسان ہمیشہ بے صبرا اور ندیدہ رہا ہے۔ حاصل کے بعد کے نقصانات، دکھ، تکلیف اور مشکلات اور پیش آمدہ حالات سے یکسر ماورا صرف ایک لگن ہوتی ہے! حاصل کر لینا، پا لینا، کھا لینا۔ یہ الگ بات ہے کہ حاصل کی اس کشش، کوشش، مشقت اور مجاہدے میں [illegible] پہنچے یا خلد سے نکلے

اور عمر بھر بیابانوں، دشت و دریا اور بحر و بر میں ''ربنا ظلمنا'' کے نعرے، ''انفسنا'' پر ملامت، ''تغفرلنا'' کی تسبیح، ''ترحمنا'' کی استدعا اور ''لنکونن من الخسرین'' کی ندا بلند کرتا رہتا ہے۔ عمر روتے ہوئے گزارتا ہے۔ قانون قدرت کی خلاف ورزی اور رحم کی اپیلوں کی آنکھ مچولی، تخلیق آدم سے تکمیل آدم اور تحلیل آدم تک جاری رہے گی۔ جس دن انسان کے اندر کی یہ شرارت، ''کھلنڈرا پن'' اور اضطراب ختم ہوگیا وہ دن قیامت کا ہوگا۔ کیونکہ جب انسان، انسان بنانے والے کے آگے سرنگوں ہوجائے گا اس کی رضا کو اپنی رضا اور قبا تصور کرے گا اس دن انسان کا امتحان ختم ہوجائے گا۔ اسی لئے جو لوگ زندگی میں، ''میں'' کو ختم کرکے ''تو'' کو اپنا لیتے ہیں اور اس کو اپنا اوڑھنا، بچھونا اور ہونا بنا لیتے ہیں تو پھر ان کا کچھ بھی اپنا نہیں رہتا۔ سب کچھ ''تو'' ہی ''تو'' ہوجاتا ہے۔ ان کی ذات مرجاتی ہے اور وہ جسد خاکی کی قید سے آزاد ہوجاتے ہیں۔ ذات کی نفی، گناہ اور لذت سے آزاد کردیتی ہے اس لئے ان کا نروان اور آرام ہر وقت یار سے آنکھیں چار کرکے دوام پاتا ہے اور وہ زندہ رہ کر بھی زندگی سے ماورا ہوتے ہیں۔ جبکہ موت والے کو ان کی ضرورت نہیں ہوتی! زندگی کے آرام کے لئے ضروری ہے کہ زندگی، زندگی والے کو دان کردی جائے ہمیشہ کے لئے۔

مگر کیا کریں! انسان بے بس ہے۔ ''میں'' سے ''میر'' کی لڑائی میں انسان نڈھال ہوجاتا ہے۔ نہ سانس کی ڈوری ٹوٹتی ہے اور نہ سکون اور آرام میسر آتا ہے۔ قانون قدرت کی خلاف ورزی کی لذت گرچہ وقتی ہے مگر اس کا سواد اور چسکا انسان کو جانتے بوجھتے بھی آگ میں چھلانگ لگانے، گلے پر چھری چلانے، جسم اور دل کو رجھانے، لمس کے بل پر محبت کی پینگیں بڑھانے اور عشق، محبت کے نام پر پرائی

سیجیں سجانے پر مجبور کرتا ہے۔ ''نہی عن المنکر'' میں ایک عجیب قوت پنہاں ہے۔ جانتے بوجھتے بھی انسان اس زہر ہلاہل کو آبِ حیات سمجھتے ہوئے ندیدوں کی طرح منہ میں انڈیل لیتا ہے اور پھر گھٹا گھٹ پی جاتا ہے۔ مگر اس کے اثرات جب خون اور نسل میں نمودار ہوتے ہیں تو پھر ''نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن'' حکم عدولی گناہ ہے خدائی ہو یا خدا نمائی......!

چار بار قسم کھانے کے بعد خلق کیا جانے والا ''احسن التقویم''، کبریائی اور خودنمائی نہ کرے تو اور کیا کرے۔ ہاں مگر عالمین پر تخلیقی برتری حاصل ہونے والے خاکی اور شبانہ روز تسبیح اور تقدیس بیان کرنے والے ناری دونوں نے خالق کی محبت کا صلہ انکار کی صورت میں دیا۔ ہر دو امر بالمعروف کے منکر ہوئے۔ ہر دو کو دیس نکالا دیا گیا۔ مگر ناری نے سجدے سے انکار کو مشیت کا اظہار کہا اور دھتکار دیا گیا! جب کہ خاکی سیانا نکلا اس نے سوال و جواب اور توضیح کی بجائے وہیں ہاتھ جوڑ دیئے اور آنسوؤں کی بارش سے عصیاں کے چند قطرے، چند برسوں کا ننگے پاؤں سفر، عرش کے خزانوں سے چرائے گئے چند الفاظ کا ورد، مسلسل آٹھوں مقام زمین پر ٹکا کر گریہ زاری کرتا رہا۔ روتا اللہ کی محبت، دوری، جنت کی تن آسانی کا چسکا یا زمین پر پیش آنے والے دکھوں کا تھا یہ تو معلوم نہیں، مگر معافی ضرور مل گئی۔

ہونی کی خوبی یہ ہے کہ یہ ہو کر رہتی ہے۔ معافی تو گناہ کی ملی مگر مقام کی نہیں ملی۔ سو خلد سے ایسے نکلے کہ آج تک رسوائیاں ساتھ ہیں۔ جس ''فساد فی الارض'' کا دعویٰ ابلیس نے کیا تھا وہ بھی تو پورا ہوتا تھا۔ ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ جو ''اسماء'' آدم کے حصے میں آئے وہ فرشتے کو بھی سکھائے جاتے ... معافی کا ورد انسان کو سکھایا گیا وہ پوری انسانیت کو نار سے بچانے کے لئے ایک ناری کو بھی عطا ہو جاتا۔ مگر شاید ایسا ممکن نہ تھا کیونکہ انسان اور انسانیت کا سفر (suffer) ابھی باقی تھا۔ مگر مشیت نہیں تھی شاید اور انسان کی تخلیق سے حاصل مقاصد، تخلیق کائنات کا گورکھ دھندہ اور ''میں''، ''تو'' اور ''وہ'' کا رول پھر شاید بھی نہ ہوتا۔ ہر انسان اپنے حصے کے عذاب ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ جنت اور دوزخ ہر انسان کا اپنا اپنا، پیدائش کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا ہے اور قبر تک ساتھ چلتا ہے اس عذاب کی ضرورت خدا کو کب تھی!

غیر مشروط اقرار محبت کی انتہا ہے محبوب کے حکم سے انکار کفر ہے۔ اور ہم سب محبت کے منکر اور کافر ہیں۔ مجاز تو ہماری طرح دنیادار ہوتے ہیں۔ ہم مجاز تو دراصل حقیقت سے محبت کو بھی مشروط رکھتے ہیں۔ سر تسلیم خم ہو تو محبت کی تکمیل ہوتی ہے۔ مگر سانپ اور انسان کا سر کب خم رہ سکتا ہے۔ اسی لئے ہر دو جتنے بھی بے ضرر ہوں پھر بھی لوگ خوف زدہ رہتے ہیں اور اوقات فرصت میں بلاتوقف سر کچلنے کی سعی کرتے ہیں۔ محبوب کی راہ میں جھکا ہوا سر امر ہو جاتا ہے۔ ورنہ سر کچلنے والے اور سر کو خاک آلود کرنے والے ہاتھ بہت! ''میں'' جب تک ''میں''، میں قید ہو کر ''میں'' رہوں گا۔ تو میری ''میں'' مجھ کو بے قرار و اضطرار میں رکھ کر خوار اور خوار کردے گی۔ اور دل، آنکھ، روح، ہاتھ، سانس، سب کا سفر (suffer) کبھی ختم نہیں ہوگا۔ لیکن اگر ''میں'' کی سرنج اُتار کر ''تو'' کے سامنے ''تو'' ہو کر ''تو'' کے پاؤں تلے پیشانی رکھ دے تو پھر دل کا سکھ، چین، روح کا آرام اور نروان کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ ورنہ، انسان ختم ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا سفر جاری رہتا ہے۔ تمام سفر (suffer)......!

”خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں“



قلندر ذکی سید [illegible] ڈائجسٹ کے دیرینہ قاری اور مستقل تبصرہ نگار ہیں۔ [illegible] کی رو سے [illegible] بہت [illegible] قارئین [illegible] ہیں [illegible] ان کے خصوص [illegible] بے شمار [illegible] اور انٹرنیٹ سے استفادہ [illegible] ہوتی ہے۔ [illegible] سید [illegible] قارئین [illegible] کے لیے [illegible] مطالعہ اور [illegible] پیسا [illegible] پیچیدہ [illegible] خدا اقتباسات [illegible] انتخاب کو زیر نظر سلسلے میں یکجا کر دیا ہے۔ ان تحریروں میں شہد جیسی مٹھاس، [illegible] کی کڑواہٹ اور زہر ہلاہل کی آمیزش [illegible] ہے۔

”دیکھا، پڑھا اور طاق نسیاں کر دیا“

O انسان اللہ تعالیٰ کی وہ مخلوق ہے جس کا زہر اس کی زبان میں ہوتا ہے۔ (حضرت علیؓ)

O وقت کی قدر پیدا کیجئے اور فضول باتوں، فضول کاموں، فضول دوستوں سے گریز کرنے کا ذہن بنائیے۔

O آسمان تلے شورش بپا ہے اور حالات بہترین ہیں (ماؤزے تنگ)

O پاکستان سے ایرانی ریال پر پلنے والے [illegible] اور سعودی ریال پر پلنے والے مولویوں کو اگر یمن بھیج دیا جائے تو یمن میں امن قائم ہو نہ ہو لیکن پاکستان میں امن قائم ہو جائے گا۔

O بعض لوگ اچھا بننے کے لئے اتنی کوشش نہیں کرتے جتنی اچھا نظر آنے کے لئے کرتے ہیں۔ (ٹالسٹائی)

O جہالت کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو مقدس بنا دیتی ہے جو مقدس جھوٹ بولنے میں ماہر ہوں۔

O بیمار جسم سے زیادہ خطرناک بیمار ذہن ہوتا ہے۔

O ایک ہی جسم میں بعض جگہ کے بال ہمیشہ بڑھتے رہتے ہیں اور بعض جگہ کے بالکل نہیں

بڑھتے۔ اللہ کی قدرت کو دیکھ۔

O اپنے جسم میں نظام انہضام اور اعصابی نظام پر غور کر اور بتیس دانتوں کے درمیان نرم و نازک زبان کی حرکات پر غور کر۔ ایک ہی ماں باپ کی اولاد میں قد و قامت کا فرق دیکھ' اپنے بچپن' جوانی اور بڑھاپے کو دیکھ' سورج کے ذریعے بننے والے سایہ کے گھٹنے' بڑھنے پر غور کرو۔

O بھوکا سو رہنا مقروض ہو کر اٹھنے سے بہتر ہے۔

O زندگی کا اپنا ہی رنگ ہے۔ دُکھ والی رات سویا نہیں جاتا اور خوشی والی رات سونے نہیں دیتی......

O ہم وہ بدنصیب قوم ہیں جس کا آئین ہمیں قومی زبان میں تعلیم دینے کا پابند کرتا ہے لیکن ہم پر مسلط سول سروس اور اشرافیہ کا انگریزی دان طبقہ یہ ہونے نہیں دیتا۔ (اوریا مقبول جان)

''ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنا ایک عالمگیر مشغلہ ہے''

ڈاک کے یادگاری ٹکٹ جمع کرنا ایک عالمگیر مشغلہ شمار ہوتا ہے۔ عالمی سطح پر اس موضوع پر مختلف کیٹلاگز بنائی' کتابیں' مضامین لکھے گئے ہیں اور اس حوالے سے متعدد رسائل و جرائد بھی شائع ہوتے ہیں۔ یہ ایک بامقصد مشغلہ ہے جس سے دلچسپی رکھنے والوں کی تعداد دنیا میں بلامبالغہ کروڑوں میں ہوسکتی ہے۔ متعدد عالمی شخصیات بھی اس مشغلے میں دلچسپی رکھتی ہیں جن میں سرفہرست برطانیہ کی ملکہ ایلزبتھ ہیں۔ یہ مضمون ادب دوستوں کے لئے مفید معلومات فراہم کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ زیرنظر مضمون میں ادبی شخصیات کے علاوہ دیگر شخصیات کا بھی تذکرہ دیا گیا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی بیسویں برسی کے موقع پر حکومت پاکستان نے 21 اپریل 1958ء کو تین یادگاری ٹکٹ جاری کئے۔ ان ٹکٹوں پر ''معمار حرم باز بہ تعمیر [illegible] کے نیچے علامہ اقبالؒ کے دستخط ہیں۔ ان ٹکٹوں پر علامہ اقبالؒ کی پیدائش کا سال 1873ء درج تھا۔ یہ تینوں ٹکٹ لندن سے پرنٹ ہوئے۔ یہ پاکستان کا کسی ادبی شخصیت کے حوالے سے جاری کیا جانے والا پہلا یادگاری ٹکٹ ہے۔ 21 اپریل 1976ء کو بھی علامہ اقبالؒ پر دو یادگاری ٹکٹ جاری کیے گئے تھے۔

سندھ کے صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے دوسوسالہ عرس کے موقع پر 25 جون 1964ء کو ایک یادگاری ٹکٹ جاری کیا گیا' اس ٹکٹ پر شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مزار کی تصویر بنی ہوئی ہے۔

بنگالی زبان کے عظیم شاعر قاضی نذرل اسلام پر ان کی زندگی میں دو یادگاری ٹکٹ 25 جون 1968ء کو حکومت پاکستان نے جاری کیے۔ ان ٹکٹوں پر ان کی تصویر ہے اور اشعار درج ہیں۔

مرزا اسد اللہ غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر دنیا بھر میں ان کی یاد میں جہاں کتابیں' ان کے دیوان اور رسائل کے خصوصی نمبرز شائع ہوئے وہاں کئی ملکوں نے ڈاک کے یادگاری ٹکٹ بھی جاری کیے۔ حکومت پاکستان نے بھی دو یادگاری ٹکٹ 15 فروری 1969ء کو جاری کیے۔ ابن انشا اردو کے مشہور شاعر و ادیب تھے جن کا انتقال جنوری 1978ء میں ہوا۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں 15 جون 2013ء کو ایک یادگاری ٹکٹ جاری کیا گیا۔

پروین شاکر اردو کی مشہور شاعرہ تھیں جو ایک ٹریفک حادثے میں دنیائے فانی سے رخصت ہوگئیں۔ ان کی یاد میں حکومت پاکستان نے ایک یادگاری ٹکٹ کا اجراء کیا۔ یہ ٹکٹ 26 دسمبر 2013ء کو ان کی برسی کے موقع پر جاری ہوا۔ خواجہ غلام فرید صرف شاعر ہی نہیں ایک روحانی شخصیت بھی تھے۔ ان کی یاد میں حکومت پاکستان نے 25 ستمبر 2001ء کو ایک یادگاری ٹکٹ جاری کیا اس ٹکٹ پر ان کی تصویر ہے۔

جوش ملیح آبادی اردو کے ایک عظیم شاعر شمار کیے جاتے ہیں۔ انہیں شاعر انقلاب کا لقب دیا گیا ہے۔ وہ ایک سچے اور کھرے انسان تھے۔ اپنی سوانح ''یادوں کی برات'' میں انہوں نے بڑی بے باکی سے اپنے حالات زندگی بیان کئے ہیں ان کی صد سالہ سالگرہ پر 5 دسمبر 1999ء کو یادگاری ٹکٹ کا اجراء کیا گیا۔ ٹکٹ پر جوش ملیح آبادی کی تصویر ہے۔

(محمد باسط اللہ بیگ کے کالم سے اقتباس)

''اسے کیا کہئے؟''

○ ہم جو اس وقت چار محاذوں فاٹا، اندرونی دہشت گردی، بلوچستان اور لائن آف کنٹرول کو دیکھ رہے ہیں کیا یہ محاذ ریاست کے اتنے قابو میں ہیں کہ ہم پانچویں محاذ یمن کا بوجھ بھی سہار سکیں گے۔

○ قابل رحم ہے وہ قوم جو جنازوں کے ہجوم کے سوا کہیں اور اپنی آواز بلند نہیں کرتی اور ماضی کی یادوں کے سوا اس کے پاس فخر کرنے کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔

(خلیل جبران)

○ کیا بھلا دور تھا جب ماں کہتی تھی کہ بیٹا! اٹھ جاؤ فجر کی اذان ہورہی ہے۔ صد افسوس، زمانے نے کیسی کروٹ لی کہ آج ماں کہتی ہے بیٹا! اب تو سو جاؤ کہ فجر کی اذان ہورہی ہے۔

○ مدتوں بعد پوچھا اس نے اب کہاں رہتے ہو؟ میں نے کہا کہ جناب! اپنی اوقات میں.....!

○ حضرت بایزید بسطامیؒ کے زمانے میں لوگوں نے ایک آتش پرست سے، جو ان کا معتقد اور ان کی عظمت کا معترف بھی تھا مسلمان ہونے کو کہا، اس نے کہا اگر اسلام اس مذہب کا نام ہے جو حضرت بایزید کا ہے تو اس کو قبول کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں اور جس طرح کے تم مسلمان ہو یہ اسلام مجھے پسند نہیں۔

بقول شخصے

[illegible] زندگی دے کر

دیا پھر شوق جنت کیوں؟ یہ حیرانی نہیں جاتی

''یمن''

امریکیوں کے مستقبل کے نقشے میں عراق اور یمن دونوں کئی ٹکڑوں میں تقسیم دکھائی دیتے ہیں۔ ابھی چند دن پہلے امریکہ کے مرکزی خفیہ ادارے (سینٹرل انٹیلی جنس ایجنسی سی آئی اے) کے سابق سربراہ مائیکل ہیڈن نے ایران کے جنگ زدہ عراق میں بڑھتے ہوئے اثرورسوخ پر تشویش کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ ایران کے کردار سے ''آسودہ'' نہیں ہیں۔ یہ بات بھی اب خفیہ نہیں رہی کہ داعش کو اسلحہ کہاں سے مل رہا ہے اور لطف کی بات بھی یہ ہے کہ انصار اللہ کے مجاہدین کے ہاتھوں میں جو اسلحہ ہے وہ بھی امریکی ہے۔ تقریباً پانچ ارب روپے کا اسلحہ جو یمن کی حکومت نے امریکہ سے ابھی ابھی خریدا تھا وہ تمام اسلحہ انصار اللہ کے استعمال میں ہے۔ دراصل نومبر دو ہزار چودہ میں انصار اللہ تحریک کے حوثی جنگجوؤں کو باقاعدہ فوج میں شامل کرلیا گیا تھا اور 33 سالہ حکمراں صدر علی صالح کے خلاف چلنے والی انصار اللہ کی عوامی تحریک کا یمن کے فوجی حکام نے پورا ساتھ دیا تھا۔ یعنی موجودہ انصار اللہ کی حکومت کے ساتھ صرف اپنے جنگجو ہی نہیں یمن کی فوج بھی ہے۔ پھر ایران بھی انصار اللہ کا پوری طرح ساتھ دے رہا ہے۔ یعنی سعودی عرب یہ جنگ آسانی کے ساتھ نہیں جیت سکتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ عراق اور شام کے بعد یمن کی مکمل تباہی کے دن قریب ہیں اور اس کے بعد سعودیہ کا نمبر ہے۔ مگر میرے خیال میں یمن تو پہلے سے تباہ حال ہے وہاں کئی سالوں سے خانہ جنگی جاری ہے۔ یہ جنگ تو سعودیہ کی تباہی کیلئے شروع کرائی گئی ہے۔ سعودیہ کا یمن کے ساتھ اٹھارہ سو میل لمبا بارڈر ہے۔

(منصور آفاق کا کالم
جنگ ڈاٹ کام سے اقتباس)

”فرق“

دیہی علاقوں اور بڑے شہروں کے مضافات میں سینکڑوں افراد میڈیکل پریکٹیشنرز بن کر لوگوں کا علاج معالجہ کر رہے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ قانون سے بچنے کے لئے ڈگری درج نہیں کی جاتی صرف میڈیکل پریکٹیشنرز تحریر ہوتا ہے۔ نسخہ دیتے نہیں قیمت وصول کر کے دوا دے دیتے ہیں۔

تاریخ خود اپنے آپ کو دہراتی ہے۔

پہلی بار بطور المیہ' دوسری بار بطور مزاح

.........مارکس...

”اسلحے کا سب سے بڑا خریدار کون؟“

الیکٹرانک میڈیا پر بی بی سی کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا میں اسلحے کی خریداری میں سعودی عرب بھارت سے سبقت لے گیا ہے اور 2014ء میں سعودی عرب اسلحہ خریدنے والا سب سے بڑا ملک بن گیا۔ عالمی منڈی اور معیشت کے بارے میں تحقیق کرنے والی کمپنی آئی ایچ ایس نے اپنی ایک رپورٹ میں بتایا ہے کہ گزشتہ چھ برسوں سے دنیا میں دفاعی تجارت میں مسلسل اضافہ دیکھا گیا ہے اور کل 6414 ارب ڈالر کی تجارت ہوئی جس میں سب سے زیادہ حصہ سعودی عرب کا رہا۔ آئی ایچ ایس کے مطابق اسلحہ کی تجارت میں ریکارڈ اضافے کی وجہ دنیا کی ابھرتی ہوئی معیشتوں کی جانب سے فوجی طیاروں کی مانگ میں اضافہ اور مشرق وسطیٰ اور ایشیائی بحرالکاہل کے خطے میں بڑھتی ہوئی کشیدگی ہے 2013ء کی طرح 2014ء میں بھی اسلحے کی فروخت میں امریکہ پہلے نمبر پر رہا جبکہ اس کے بعد روس' فرانس' برطانیہ اور جرمنی ہے۔ اس کی عالمی تجارت کی سالانہ رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے سعودی عرب کی جانب سے اسلحے کی مانگ میں ڈرامائی اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔ کمپنی کے ماہر تجزیہ کار بین مورز کا کہنا ہے کہ اگر سعودی عرب کے ماضی کے اسلحے کے سودوں کو مدنظر رکھیں تو یوں لگتا نہیں کہ آئندہ سالوں میں بھی اس میں کوئی کمی ہو۔

زندگی اپنے سہارے بسر کرتے سیھو غیروں کے کاندھے پر تو جنازے ہی اٹھا کرتے ہیں

”عالم کفر متحد ہے“

فیصلے کئے نہیں کرائے جا رہے ہیں۔ طاقت کے مراکز تبدیل ہو رہے ہیں۔ ترجیحات اوپر نیچے ہو رہی ہیں۔ ایک محاذ پر پورا کنٹرول ہوتا نہیں ہے۔ دوسرا بھی کھول لیا جاتا ہے۔ بھیڑوں کی نگہبانی بھیڑیئے ہی کر رہے ہیں۔ میگا اسکینڈلز کے قصے وہ سنا رہے ہیں جن کے خلاف فائلیں کھلی ہوئی ہیں

اب بین الاقوامی بحران بھی ہمیں اپنی لپیٹ میں لے رہے ہیں۔ ہم اپنے ہاں تو دہشت گردی اور انتہاپسندی کو جڑ سے نہیں اکھاڑ سکے۔ ہمارے قبائلی علاقے اب بھی آتش فشاں ہیں۔ افغانستان سے دراندازی ہو رہی ہے۔ بھارت بھی افغانستان میں اپنے آنکھوں قونصل خانوں کے جال سے میر جعفر اور میر صادق بھیج رہا ہے۔ ہماری حکومت اور اس کی مشینری دہشت گردی کو اپنا شعبہ ہی نہیں سمجھتی۔ اسے تو لگتا ہے سو ارب روپے کے منصوبوں کی فکر ہے۔ یہ ذمہ داری تو مسلح افواج کو سونپ کر منتخب رہنما اپنے پرانے دھندوں میں مصروف ہیں۔ اب سعودی عرب کی سالمیت خطرے میں پڑی ہے تو سیاسی اور فوجی قیادت کے ہم آہنگ ہونے کی خبریں آ رہی ہیں۔ پاکستان کے عوام کو اپنی فوجی قیادت پر تو اعتماد ہے لیکن سیاسی قیادت کی بصیرت اور ادراک پر بے شمار شکوک و شبہات ہیں۔ اس لئے بجا طور پر خیبر سے گوادر تک آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ ہوشیار! احتیاط! دام ہم رنگ زمین بہت خطرناک ہوتا ہے۔ امریکہ نے افغانستان

عرقِ گلاب

نیم، بطرز، دستری کا استعمال کریں

مرحبا عرق گلاب کا شمار ان [illegible] میں ہوتا ہے جس نے **مرحبا** [illegible] عرصہ [illegible] پہنچا دیا ہے۔

SINCE 1976

مرحبا کا عرق گلاب اپنی واتی خوشبو اور اثر انگیزی کی وجہ سے دیگر تمام کمپنیوں کے عرق گلاب پر سبقت لے گیا ہے۔ ہر طرح کے مصنوعی ایسنس سے پاک ہے جس کی وجہ سے اس کی خوشبو آخر تک برقرار رہتی ہے۔ مفرح اور مقوی دماغ، آشوب چشم اور کان کے درد کو فائدہ بخشتا ہے۔ نفقان، غشی اور ضعف قلب کو دور کرتا ہے۔ معدہ، جگر اور امعاء کو قوت دیتا ہے۔ قبض رفع کرتا ہے۔ پسینے کی کثرت کو روکتا ہے اور اس کی بدبو کو زائل کرتا ہے۔ جلد کی حفاظت کرتا اور بے مثال موئسچرائزر اور میک اپ ریموور ہے۔ جلد کی بیماریاں جیسے Erythroderma, Atopic Psoriasis, eczema میں بے حد مفید ہے۔ **مرحبا** عرق گلاب کھانے پینے کی اشیاء کو خوشبودار اور خوش ذائقہ بنانے کے لیے بکثرت استعمال ہوتا ہے۔

مرحبا عرق گلاب کی ڈسٹلیشن میں جو گلاب استعمال ہوتے ہیں ان کے اثر پذیر اجزاء اور دوائی استعمالات حسب ذیل ہیں

دوائی استعمال (Parmacological Actions)	[illegible] (Active Constituents)	[illegible] (Ingredients)
[illegible]	[illegible]	Rosa [illegible] damascena

خوراک و طریقہ استعمال

[illegible] (2.5 [illegible]) [illegible]
[illegible] (10 [illegible]) [illegible]
[illegible] (10 [illegible] 15 [illegible]) [illegible]
[illegible]
[illegible]
ممنوعات (Contra indications) **مرحبا** عرق گلاب [illegible]
احتیاطیں (Precautions)
[illegible]
[illegible] Loose motions کا باعث بنتا ہے۔
ہدایت (Instructions) [illegible]
[illegible]
[illegible] **مرحبا** [illegible]
[illegible] استعمال [illegible]
نوٹ: **مرحبا** عرق گلاب [illegible] دستیاب ہے۔
(i) [illegible] (ii) 50 [illegible] (iii) 50 [illegible] (iv) 120 [illegible] 240 [illegible]
(v) [illegible] (vi) 750 [illegible]



سے اپنی فوجوں کی مکمل واپسی ابھی ملتوی کر دی ہے۔ یمن سے اُٹھنے والی شورش کے کیا مقاصد ہیں۔ کوئی ہے جو تاریخ اسلام کے اوراق اُلٹے' لارنس آف عریبیہ کو یاد کرے۔ 1940ء کے عشرے میں مشرق وسطٰی میں امریکہ اور یورپ نے جو کھیل کھیلا۔ کس طرح نقشے بدلے گئے۔ کیسے کیسے نئے ملک اور نئے خاندان سامنے لائے گئے۔ فلسطینیوں پر زمین کس طرح تنگ کی گئی۔ وہ اپنے ہی وطن میں غیر بن کر رہ گئے۔ پھر اسلامی سربراہ کانفرنس لاہور میں شرکت کرنے اقتصادی اور دفاعی شعور پر سر اُٹھا کر چلنے والے مسلم حکمرانوں کو 1977ء سے لے کر اب تک کس طرح اپنے ہی لوگوں سے ہلاک کروایا گیا۔ اب طوفان کا رُخ حرمین الشریفین کی طرف موڑا جا رہا ہے۔ کیا خطرہ مملکت کو ہے یا ملوکیت کو ہے۔

قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں ہے دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے۔ عالم کفر متحد ہے۔ مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو ہلاک کر رہے ہیں۔ ان کا اللہ بھی ایک ہے۔ رسول بھی ایک قرآن بھی ایک۔ پھر بھی ایک دوسرے کے خلاف ہوا میں سونتے ہوئے ہیں۔ امریکیوں انگریزوں کا اسلحہ بک رہا ہے۔ ان کی مارکیٹیں گرم ہیں۔ علمائے حق کہاں ہیں قوموں کی رہنمائی کرنے والے کہاں مصروف ہیں۔ اہل علم و دانش حرکت میں آئیں۔ سوچیں کہ اس محشر کی گھڑی میں پاکستان کو کیا کردار ادا کرنا چاہئے۔ عوام کوئی فیصلہ کریں گے یا اشرافیہ۔

(محمود شام کا کالم
خطرے کی گھنٹیاں سے اقتباس)

"عجب کہانی اور عجب تاریخ ہے"

نتیجہ پھر وہی نفرت' آگ' خون' بٹوارہ' قافلے اور کیمپ' اب نفرت کا سبب عبادت گاہیں نہیں اور بہت ساری باتیں ہیں مگر اصلی بات آج بھی سامنے نہیں آئی۔ 1857ء' 1947ء اور 1971ء نے کتنا کتنا خون دیا۔ آزادی کے لئے کوئی حساب نہیں۔ عجب کہانی اور عجب تاریخ ہے۔ اب اسے کیا کہیں اس زمین پر جہاں اُداس نسلیں عرصے عرصے بعد پیدا ہوتی تھیں اب تسلسل سے پیدا ہونے لگی ہیں۔ یہ نسلیں اور آئندہ نسلیں اسی طرح اُداس رہیں گی جب تک جب تک...... پتہ نہیں کب تک۔ اس خوفناک منظر کے سامنے کھڑے ہو کر چیخ تو نہیں کی جا سکتیں مگر سوچنے کی بات ہے آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟ کب تک یہ لوگ قتل اور تقسیم ہوتے رہیں گے۔ مسائل کا حل لوگوں کو اجاڑنے اور تقسیم کرنے میں کیوں دیکھا جاتا ہے۔ کسی اور طرح کیوں نہیں۔ ڈیڑھ صدی سے دنیا کے اس خطے میں جس کا نام ہندوستان تھا یہی ہو رہا ہے۔ جتنی تحریکیں لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لئے اٹھیں انہیں اجاڑنے اور مزید دُکھی کرنے کے نتائج پر ختم ہوئیں۔ آج یہاں تین سلطنتیں قائم ہیں۔ پاکستان' بھارت' بنگلہ دیش۔ یہ سب لوگوں کے لئے اور لوگوں کے برتے پر قائم ہوئیں' بظاہر یہ تینوں ملک ایک دوسرے سے مختلف یا متضاد نظریوں پر چلتے ہیں' کسی بات میں یکساں نہیں ہیں مگر ان تینوں آزاد ملکوں کے لوگ یکساں طور پر دُکھی اور اُداس ہیں اچھے وقت کا انتظار کرتے کرتے ان کی نسلیں بوڑھی ہو جاتی ہیں کس کس سے اُمیدیں نہیں لگائیں انہوں نے پتہ نہیں یہ لوگ خود کیوں نہیں سوچتے یہ لوگ' ہم لوگ' وہ لوگ پاکستان لوگ' بھارت کے لوگ' بنگلہ دیش کے لوگ آپس میں کیوں بات نہیں کرتے۔ یہ سب مل کر کیوں نہیں سوچتے' اپنے مسائل کے لئے' اپنے دُکھوں کے

لئے' مگر اس میں بھی شاید ہمارے ماضی کی کارفرمائی کا دخل ہے کہ ہم ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کر سکتے غیروں کی بات مانتے ہیں اور ختم ہوتے چلے جا رہے ہیں...... روز بروز اور نسل بہ نسل۔

1947ء سے 1971ء تک قوم کا قافلہ جانے کہاں بھوتا بھٹکتا رہا' ایسا گھور اندھیرا' کتنی لمبی رات کہ وقت [illegible] دوسرے لوگ کتنے آگے نکل گئے [illegible] اور ہم کبھوں [illegible] 1947ء [illegible] پاکستان [illegible] پاکستان میں [illegible] 1971ء تک پاکستان تو [illegible] بنگلہ دیش [illegible] پاکستان کی [illegible] ہے۔ درمیان میں [illegible] بھارت کے [illegible] میں گزرے کہاں؟ خبر نہیں وہاں یہ لوگ [illegible] مجھے یہاں لیا ہیں؟ پتہ نہیں [illegible] عجیب پاگل [illegible] باتیں مگر یہ تاریخ پاگل کر دینے والی تھی [illegible] ہے۔ یہ اداس نسلوں کا سفر ہے [illegible] کا دریا ہے خبر نہیں!!

کئی دانا کہتے ہیں کہ لڑنا ہی تھا تو یہ ملک کیوں بنایا۔ اس سے تو وہی لڑائیاں اچھی تھیں جو مذہب کے نام پر ہوا کرتی تھیں کچھ مزا تو تھا ان میں، کچھ جواز تو تھا ان کا، یہاں تو ان گنت باتیں ہیں' پتہ نہیں ان داناؤں کو وہ اندر کی بات معلوم ہے یا نہیں وہ بات جس کے لئے لوگ لڑوائے جاتے ہیں اور تقسیم کئے جاتے ہیں جرمنی' ویت نام' کوریا' کشمیر' فلسطین اور پاکستان نہ مذہب کے لئے توڑے پھوڑے گئے' نہ لوگوں کے لئے فقط اسی ایک بات کے لئے جو صرف خداؤں کو معلوم ہے۔ تقسیم کی لکیر کے دونوں طرف لوگوں میں باہم لڑائیاں شروع ہو چکی تھیں مہاجر اور مقامی کے جھگڑے' زبان اور کلچر کے تعصب' علاقوں اور صوبوں کی الجھنیں لوگوں کی آبادکاری سے پہلے ہی شروع ہو گئیں۔ یہ بات تو ان کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ سارے تضاد مذہب سے پیدا نہیں ہوتے مگر اندر کی بات جو سارے جھگڑوں کی جڑ تھی وہ ابھی تک ان سے پوشیدہ تھی۔ شاید اس لئے کہ یہ سمجھنے سمجھانے کا قصہ سب لوگوں کا تو نہیں ہوتا۔ آبادیوں میں بستے ہوئے یا قافلوں میں چلتے ہوئے سارے لوگ ایک جیسے کہاں ہوتے ہیں۔ ان میں اکثر لوگ وہی ہوتے ہیں جن کی زندگیوں کا مقصد [illegible] زمین کی بوتے یہ لوگ [illegible] ہیں اور فصل کاٹ لیتے ہیں [illegible] چھوٹی سوچیں سوچتے ہیں [illegible] بڑی سوچیں سوچنے والے دوسرے لوگ ہیں جو تاریخ بدلنے کا مشن بناتے ہیں تہذیب کی دیکھ بھال اور زبان و کلچر کی سدھار کرتے ہیں اور بہت [illegible] کر کے اکثر ناکام و ناخوش [illegible] مر جاتے ہیں اس لئے تاریخ چند لوگوں کی کہانیاں باقی وہ تو ادھر کو چلتی ہے جدھر بہت سے لوگ چلیں۔ جانے کس طور [illegible] چلیں' عبداللہ حسین کا بوڑھا پروفیسر بھی ایسے ناکام لوگوں میں سے ہے۔

("اندھیروں کا سفر"
افضل توصیف کی کتاب سے اقتباس)

"جیون خاں کی کتاب
"جیون دھارا" سے

پہلی بار ملک سے باہر نکلے... بنگلہ دیش جانا ہوا تھا۔ مگر یہ خطہ زمین اس وقت مشرقی پاکستان تھا۔ اپنا دیس' سندر' سریلا اور سرسبز' کاش پاکستان نہ ٹوٹا ہوتا کیا خبر ہم وہیں جا بستے۔ سندربن کے کہیں قریب یا سلہٹ میں چائے کے باغات میں گھرے ہوئے یا کوہستانی کی سرسبز پہاڑیوں پر۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت

تھی داموں کے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے۔ توڑنے والوں نے توڑا ہم تو اپنے تئیں جوڑنے میں لگے رہے۔

اگلا سٹاپ یونان کے صدر مقام ایتھنز میں تھا۔ سقراط افلاطون اور ارسطو کا ایتھنز۔ جہاز سے باہر آنے کو جی چاہا۔ جہاز کی سیڑھیوں پر قدم رکھا ہی تھا کہ روک دیئے گئے جہاز میں ہی رہنے کا حکم ہوا۔ منت سماجت کی تو وہیں زینہ پر کھڑے کھڑے یونانی فضا میں سانس لینے کی اجازت ملی۔ [illegible] نہ صرف باقی رہی بلکہ پیاس بڑھ گئی۔ آنکھیں بند کیں کتابوں میں مذکور پرانے شہر کو آئینہ دل میں اتارا اور لمبے ڈگ بھرتے ہوئے گلیوں کی خاک چھاننا شروع کی۔ سقراط کے کئی رنگ ڈھنگ دیکھے' کبھی گلیوں میں چند نوجوانوں سے مکالمے میں مصروف پایا۔ پھر عوامی عدالت کے سامنے مقدمہ بھگتتے دیکھا۔ ایک منظر قید خانے کا تھا' اور پھر...... زہر پیالہ لبوں سے یوں لگانے تھا جیسے امرت پی رہا ہو...... شاید تھا بھی ایسا ہی' وہ سو گیا مگر ساتھ ہی امر ہو گیا۔ حق کا متلاشی جان کا نذرانہ دے کر واصل برحق ہو گیا۔ موت کو یوں گلے لگایا جیسے وہ مدتوں سے روٹھی ہوئی محبوبہ تھی۔ ابھی افلاطون اور ارسطو کی درسگاہوں کی زیارت کو جانا تھا کہ جاگتی آنکھوں دکھائی دینے والا خواب ٹوٹ گیا جہاز اُڑنے کو تیار تھا۔

جہاز اُڑا تو چھوٹی سی کھڑکی سے باہر جھانکا کئے۔ بادلوں کی سیاہ چادر اوڑھے یورپ نیچے تھا۔ بدلیوں کی اوٹ سے کہیں کہیں بحیرہ روم کے نیلے پانیوں کی جھلک دکھائی دیتی۔ یہ وہی سمندر تھا جس کے کنارے طارق بن زیاد نے کشتیاں جلائی تھیں...... ساحل پر اُترتے ہوئے کہا تھا کہ ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدا ماست...... دوسرے لفظوں میں مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا' لگ بھگ آٹھ سو سال اندلس پر سبز پرچم لہرایا تھا۔ انہی علاقوں سے صلیبی لشکر یروشلم [illegible] نکلے تھے جن سے صلاح الدین ایوبی نے [illegible] تھی۔ تاریخ یوں یلغار [illegible] تھی جیسے اسے اس [illegible] سے [illegible] صدیوں کا حساب چکانا [illegible] کا حساب چاہتی تھی۔ بتاتی تھی کہ [illegible] کہاں پر [illegible] غاصب اور لٹیرے کون کون تھے [illegible] تھے [illegible] تھے؟ یاد آیا [illegible] ماضی [illegible] کا تعلق آج [illegible] اور [illegible] کوتاہیوں اور [illegible] میں یاس و حسرت کے سوا [illegible] خیال آتا کہ کاش [illegible] ہوتے۔ جانے اس زمانے میں وارد ہوئے ہوتے جس میں فاران کی پہاڑیوں سے طلوع ہونے والے آفتاب جہانتاب کی کرنیں دنیا کے ظلمت کدوں کا رخ کر رہی تھیں اور مقدور بھر قافلہ سالاروں کا ساتھ دیتے۔

ہزاروں حسرتیں دل میں لئے لندن سے چلے۔ افسوس اس کا نہیں تھا کہ حور و قصور جن کے یہاں ہر طرف ٹھٹھ لگے تھے ہمارے حصہ میں کیوں نہ آئیں۔ دل روتا تھا اس پر کہ صنعتی انقلاب اپنے ہاں کیوں نہ آیا۔ ہمارے جہانداروں کو یونیورسٹیوں کی کیوں نہ سوجھی سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اتنا پیچھے کیوں رہ گئے اور کاروان حیات کے ہراول دستے میں شامل ہونے کے لئے نہ ساربان نے حدی کے لے بلند کی نہ قافلے کی رفتار میں تیزی آئی۔ سبک ساران مغرب ہوا کے دوش اڑتے رہے اور ہم کچھوے کی طرح رینگتے رہے اور وہ بھی بے سمت دو قدم کبھی آگے کو چلے تو ایک آدھ اُلٹ پڑ گیا...... امت پر تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے۔

جہاز جنوبی مشرق کی طرف اُڑ رہا تھا یورپ' بحیرہ روم' ترکی' مشرق وسطیٰ' کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا'

تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ ہسپانیہ کے ساحل پر کشتیاں جلائی تھیں۔ جبرالٹر (جبل الطارق) آج بھی گواہی دے رہا ہے ان فضاؤں میں مدتوں اذانیں گونجی تھیں پھر پانسا پلٹا اور ہم یوں سمٹ گئے کہ اپنے گھر تک میں غیروں کے محتاج ٹھہرے۔ بھول گئے کہ نان جویں پر ہے مدار قوت حیدری کیا خبر جاگنے کا وقت آیا چاہتا ہو۔ پردہ غیب سے ندا آئے اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو اور یہ گرانبار آنکھیں ملتے ہوئے اٹھنے لگیں۔ یہ خیال آتے ہی سوچا کہ جس دربار عالی میں حاضری کے لئے جا رہے تھے وہاں عرض گزاریں گے کہ اے خالق کون و مکاں اگر وہ وقت قریب ہے تو اس انقلاب حیات آفریں کے ورود مسعود تک مجھے زندہ رکھ اور اس کا حق ادا کرنے کی توفیق کامل عطا کر۔

جدہ کے ایئرپورٹ پر قاضی صاحب لینے آئے تھے۔ نہایت نفیس انسان، نہ پیتے ہیں نہ پلاتے ہیں نہ اور کسی ہنگامے میں پڑتے ہیں۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند دونوں۔ دو ہر صورت چار سادگی اور سادہ دلی سے زندگی یوں مرتب کہ خدام تو کیا باورچی اور بیرہ تک کے جھنجھٹ سے آزاد... سارا بوجھ بیگم کے کندھوں پر ان کا ہاتھ بٹانا پڑے تو خود ہر دم تیار۔

وہ گھڑی آ گئی۔ نگاہیں اٹھیں تو خانہ خدا سامنے تھا۔ دنیا کیا اپنا آپ بھول گیا۔ گم شدگی کے عالم میں حرم پاک میں داخل ہوا اور بے خودی کے عالم میں طواف کرنے لگا۔ نہ دعائیں یاد رہیں نہ زباں سے کلمات کا ورد جاری ہوا۔ حیرت کا عالم نہ صرف 'میں' میں نہ تھا بلکہ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ پرکاہ سے بھی بے وزن جو تھا فقط وہی تھا کون و مکاں اس کے ارض و سماوات پر اس کی قدرت...... اور یہ جان حقیر' فقط بلبلہ ہے پانی کا' یاد نہیں کتنے طواف کئے' کب سعی کی' کتنی بار حضرت ہاجرہ کی تقلید میں تیز دوڑے' کب کب حجر اسود کو بوسہ دیا' محویت کے عالم میں دن تمام ہوا۔

درد کا تحفہ دامن میں چھپائے مدینہ کو جا لیا۔ روضہ مبارک پر حاضر کیا ہوئے سارے بند ٹوٹ گئے۔ خانہ کعبہ میں کئی بار چاہا تھا کہ آنکھیں تر ہوں مگر بوند تک نہ ٹپکی تھی۔ حضورؐ کے ہاں پہنچ بھی نہ پائے تھے کہ جھڑی لگ گئی۔ اتنا پانی کب سے کہاں جمع تھا آنکھوں کا برسنا اچھا لگا دیر تک روتا رہا۔ اپنے گناہوں کی معافی' اپنوں پر کرم کی التجاء' قوم کا عروج' ملت کی دستگیری' صراط مستقیم کی بھیک" صراط الذین انعمت علیہم ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرا انعام ہوا...... سب کچھ ہی مانگ لیا۔ بہت کچھ ملا' تو سخی' سخی تیرا دربار ہے' منگتے کی جھولی بھر دی یوں لگا کہ حاضری قبول ہوئی اس سے بڑا انعام کیا ہو سکتا تھا۔

......ایضاً......

"کلام شاعر"

کیسی بخشش کا سامان ہوا پھرتا ہے
شہر سارا پریشان ہوا پھرتا ہے
ایک بارود کی جیکٹ اور نعرہ تکبیر
راستہ خلد کا آسان ہوا پھرتا ہے
جانے کب کون کسے مار دے کافر کہہ کر
شہر کا شہر مسلمان ہوا پھرتا ہے
شب کو شیطان بھی مانگے ہے پناہ جس سے
صبح وہی صاحب ایمان ہوا پھرتا ہے
ہم کو جکڑا ہے یہاں جبر کی زنجیروں نے
اب تو یہ شہر ہی زندان ہوا پھرتا ہے

(فیس بک ڈاٹ کام سے)

"قول امام محمد باقر"

اگر میں بھوکوں کو کھانا کھلاؤں' ان کے بچوں کو پالوں' ننگوں کو لباس دوں' ان کی عزت لٹنے سے بچاؤں تو یہ بات مجھے اس بات سے کہیں زیادہ پسند ہے کہ میں حج پر حج کروں۔



[illegible]

کیٹرنگ کمپنیوں کی لوٹ مار

شادی بیاہ کی تقریبات میں ریڈی میڈ کھانوں کے معیار اور بچ جانے والے کھانے کے استعمال کے بارے میں انکشافات سے بھرپور رپورٹ



ایک زمانہ تھا جب شادی کے موقع پر کھانا اپنی نگرانی میں پکوایا جاتا تھا مگر اب کیٹرنگ کمپنیوں کو ایک بڑی رقم کا چیک دے کر تمام کام ان کے سپرد کردیا جاتا ہے اور خود کوئی ذمہ داری نہیں لی جاتی۔ شادی کی تقریبات کے بعد بڑی مقدار میں بچنے والے مٹن، چکن کو سرخ حلیم اور سرخ چنے والوں کے ہاتھ بیچ دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف شادی کی تقریب کا اہتمام کرنے والے دلہن کے جوڑے، جہیز اور سرچیز پر تو توجہ دیتے ہیں مگر کھانے کے معیار کو نظر انداز کردیا جاتا ہے۔

ایک وقت تھا جب بیٹی بیٹے کی شادی پر سب سے زیادہ توجہ کھانے پر دی جاتی تھی۔ کھانا بہترین دیسی گھی، چاولوں کی قسم بہترین ہو کھانوں میں استعمال کیے جانے والے مصالحہ جات عمدہ کوالٹی کے

ہوں والدین کی اولین خواہش یہی ہوا کرتی تھی۔ جہیز، کپڑے اور دیگر لین دین کے معاملات کو بھی اہمیت دی جاتی تھی مگر باراتیوں میں نیک نامی اور تعریف اسی صورت ہوتی تھی جب انہیں اچھا کھانا کھانے کو ملتا تھا۔ پھر جب باورچی کھانا بنا رہا ہوتا تو خاندان کا کوئی بڑا اور سیانا باورچی کے سر پر سوار رہتا تھا۔ مصالحے کوٹنے بتانے اور ان کی ترکیب استعمال پر اس کی خاص نظر رہتی تھی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کسی طرف سے بھی باراتیوں کو یہ شکایت نہ ملے کہ کھانا بدمزہ تھا یا اسے تھوڑی مقدار میں کھانے کو ملا۔ آج کے دور کی طرح اس زمانے میں فی باراتی کھانے کا حساب نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ اس کی جگہ ایک تو سیانا اندازہ ہوا کرتا تھا دوسرا اگر سو باراتیوں کی آمد متوقع ہوتی تھی تو احتیاطاً ڈیڑھ سو باراتیوں کے لئے کھانا تیار کیا جاتا تھا تاکہ وقت پر کوئی پریشانی نہ ہو مگر اب تو کیٹرنگ کمپنیوں کو بتانا پڑتا ہے کہ باراتی کتنے ہونگے اگر زیادہ آ جائیں تو اس حساب سے اضافی ادائیگی ہوتی۔

یہ تو خیر وقت پارینہ کی باتیں ہیں اب ایسے کہاں سنا اور کہاں دیکھا اب تو شادی کے رسم و رواج اور ساری روایات ہی یکسر تبدیل ہو چکی ہیں۔ پہلے شادی میں بنیادی چیز کھانا ہوا کرتی تھی۔ شادی سے کئی دن پہلے اس حوالے سے ذمہ داریاں سونپ دی جاتی تھیں۔ مگر اب یہ معاملات کیٹرنگ کمپنیوں یا شادی ہالز والوں پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ ان کو مینو بتا کر باراتیوں کی تعداد کے حساب سے ادائیگی کر کے گھر والے فارغ ہو جاتے ہیں۔ شادی کے دیگر تقاضوں، لوازمات اور ضروریات پر پورا زور لگا دیا جاتا ہے مثلاً یہ کہ مہندی، شادی اور ولیمہ کے جوڑے کہاں سے اور کتنی بھاری مالیت کے خریدنے ہیں دلہن کے لئے فرنیچر سٹار پلس ڈراموں کے سٹائل کا کس کمپنی سے خریدنا ہے۔ جیولری کا وہ سیٹ جو ٹی وی کی دلہن نے پہنا ہوتا ہے وہ شہر کے کس بڑے جیولر سے خریدنا ہے۔ اس کے علاوہ مہندی، شادی اور دعوت ولیمہ کے الگ الگ کارڈز کہاں سے اور کتنے مہنگے تیار کروانے ہیں۔ کس مہنگے ہوٹل یا شادی ہال میں شادی یا ولیمہ کے لئے بکنگ کروانی ہے گاڑی کی سجاوٹ کس کار ڈیکوریٹر سے کروانی ہے۔ دودھ پلائی کا مہنگا اور خوبصورت گلاس کہاں سے منگوانا ہے یہ بھی خاص طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اگر لڑکے کی شادی ہے تو بینڈ فوج کا بلوانا ہے یا پولیس کا اور مہندی کی تقریب ہے تو اچھے ڈھول والوں کو کس چوک سے اٹھانا ہے اب تو لڑکیاں بھی ڈھول بجانے لگی ہیں اگر کوئی ڈھول بجانے والی خوبصورت لڑکی مل جائے تو سونے پر سہاگہ والی بات ہوگی۔

مقام حیرت ہے کہ شادی کے ہر کام، مسئلے پر گھر کی عورتیں اور عورتوں کے کہنے پر مردوں کو بھرپور توجہ دینا پڑتی ہے۔ مگر کھانے کا اہتمام کرنے والی کمپنی کے بارے میں کسی کو فکر نہیں ہوتی۔ اب وہ کمپنی سیاہ کرے سفید کرے مٹن کے نام پر بیف کا پلاؤ بنا دے دیسی مرغی کے نام پر مردار یا نیم مردہ برائلر کی ڈش تیار کر دے اسے کوئی چیک نہیں کرتا صرف خوش رنگ برتنوں میں سجے سجائے کھانوں پر لوگ ٹوٹ پڑتے ہیں چاہے بعد میں سو باراتی باسی بریانی کھانے کے باعث ہیضہ کا شکار ہو جائیں۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس کا سبب کیا تھا حقیقت یہ ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر سب سے زیادہ فائدہ کیٹرنگ کمپنیاں ہی اٹھا رہی ہیں جو آم کے آم

گٹھلیوں کے دام والا معاملہ جاری ہے یہ سب
دردات ایسے ہوتی ہے کہ ایسے میں بارے بھی کچھ
بات ہو جائے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ باراتیوں میں
خواہ وہ ان پڑھ ہوں یا پڑھے لکھے مہذب اور
تہذیب یافتہ افراد جب کھانے کی میز پر آتے ہیں
تو کھانے پر یوں جھپٹتے ہیں جیسے یہ ان کی زندگی کا
آخری کھانا ہو جس طرح چرنے کے وقت صحت
مند جانور کمزور کو ٹکر مار کر ایک طرف لگا دیتا ہے
اسی طرح کھانے کی ٹیبل پر نام نہاد معزز افراد میں
بھی یہی منظر دیکھنے کو ملتا ہے اس یقین کے ساتھ
کہ کھانا سب کو ملتا ہے ان کے دل کی بے صبری
اور آنکھوں کی بھوک بتاتی ہے کہ شاید ان افراد کی
نیت بھی بھرنے والی نہیں پیٹ میں دس پلیٹیں
بھی اتار لیں گے مگر نہیں بھرے گی یہ مناظر تو عام
دیکھے جاتے ہیں تقریباً ہر باراتی ایک پلیٹ میں
چار افراد کا کھانا ڈال کر ایک کونے میں لگ کر بیٹھ
جاتا ہے اور جب معدہ بھی ہاتھ جوڑ دیتا ہے تو وہ
نصف سے زیادہ مٹن کی پلیٹ وہیں چھوڑ کر اٹھ
کھڑا ہوتا ہے۔ اس طرح شادی کے منتظمین کے
پیسے اور رزق کا بے دریغ ضیاع ہوتا ہے۔ چلیے
شادی ہوگئی رسمیں بھی ادا کردی گئیں زیورات،
بری کی نمود و نمائش، لڑکی لڑکے کو لاکھوں کی نقد
سلامی بھی ہوگئی دس بج گئے اور شادی ہال والوں
نے روشنیاں بھی گل کردیں۔ گھر والوں نے
قرآن کے سائے میں دلہن کو بھی دولہا کے ساتھ
ایک لمبی گاڑی میں ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ
رخصت کردیا۔ یہ تو سب ہوگیا مگر اب اصل کام
کیٹرنگ والوں کا شروع ہوتا ہے جنہیں ہر ٹیبل پر
چکن، مٹن اور کبابوں کی نصف پلیٹیں نظر آتی ہیں
چکن بریانی میں بڑے بڑے لیگ پیس بھی دکھائی
دیتے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ کیٹرنگ کمپنی
والے یہ مختلف انواع و اقسام کے کھانے غریب
بچوں کے مدرسے میں دے آتے ہیں یا یتیم
خانے بھجوا کر اپنی سخاوت کے جھنڈے گاڑ دیتے
ہیں ایسا ہرگز نہیں ہے جناب یہ سارا کھانا کیٹرنگ
کمپنیوں کے ملازمین بڑے بڑے شاپرز میں
بریانی میں موجود چکن مٹن کے بڑے بڑے پیس
بھی الگ کر کے شاپرز میں بھرے جاتے ہیں جو
اگلے دن ریڈی میڈ حلیم اور بریانی تیار کرنے
والوں کو فروخت کر دیے جاتے ہیں اور شہری اگلے
ہی روز باراتیوں کا چھوڑا چکن کی بوٹی اور مشہور
حلیم کی دکان سے مزے مزے سے کھا رہے
ہوتے ہیں یا مرغ چنے کی دکان پر کھڑے ہو کر
اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں مختلف ہوٹلوں میں
بکنے والی بریانی میں بھی باراتیوں کی چھوڑی بوٹیوں
سے ہوتی ہے ہم 120 روپے کی بریانی کی پلیٹ
کسی ہوٹل میں بیٹھ کر فخر سے چٹ کر رہے ہوتے
ہیں اسی لیے ہم نے سطور بالا میں لکھا تھا کہ
کیٹرنگ کمپنیاں آج کل آم کے آم گٹھلیوں کے
دام والا معاملہ کر رہی ہیں۔ ایک طرف پارٹی کو مینو
کے نام پر لوٹ لیا دوسری طرف باراتیوں کے بچے
کھچے کھانے کے بھی دام کھرے کر لیے سو کہنے کا
مقصد یہ ہے کہ ظاہری چمک دمک اور نمود و نمائش
نے ہمیں اپنی شاندار روایات سے بھی بہت پیچھے
کر دیا ہے مصنوعی نمود و نمائش نے ہمیں نہ صرف
حقیقی خوشیوں سے دُور کر دیا ہے بلکہ دولت کی
فراوانی نے ہماری عقل پر بھی پردے ڈال دیئے
ہیں روشن خیالی اور جدت کے نام پر ہم نام نہاد خود
کلچر کے اندھیروں میں گم ہوتے جا رہے ہیں۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ

عدیل الرحمن [illegible]

داستانِ عشق

اور جیسے ہی جب شہزادہ بھاگمتی کے گاؤں میں داخل ہوا تو مضطرب ہونے لگا۔ وہ جس بستی میں سدا بہار رہتا تھا آج وہ تباہ ہو چکا تھا۔ شہزادے جیسے تو وہاں ہمہ وقت بہار رہتی تھی چاہے خزاں کا موسم ہو یا گرما ہو۔ اب وہ گاؤں قبرستان میں بدل چکا تھا۔ شہزادے نے دیکھا کہ سارا گاؤں لاشوں کا ڈھیر بنا پڑا ہے۔

اُردو کے پہلے شاعر کے حالات زندگی اور عشق کی تاریخی داستان!



اردو شاعری کی ابتداء اور ارتقاء کے بارے میں جاننے سے پہلے اردو کی ابتداء اور ارتقاء کا علم ہونا لازم ہے۔ اردو کی ابتداء اور ارتقاء کے بارے میں مختصر خلاصہ آپ کی نذر ہے۔ شروع میں اردو زبان کو ہندوی، ہندی یا ہندوستانی کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں ریختہ اور پھر یہ اردوئے معلّی کہلائی۔ دراصل اس کی مستند شکل شہاب الدین شاہ جہاں مغلیہ بادشاہ کے عہد میں تشکیل پائی۔ 1447ء (1647ء) میں جب شاہ جہاں نے آگرہ کے بجائے دہلی کو اپنا دارالخلافہ بنایا تو لشکر کی زبان بولنے والے اور دہلی کی زبان بولنے والے ایک ہی بازار میں رہتے تھے۔ شاہ جہاں نے اس بازار و اردوئے معلّی کے نام سے پکارنا تجویز کیا۔ اس کے بعد سے یہ اردوئے معلّی یا دہلوی زبان کے نام سے

مشہور ہوئی۔ پھر یہ ترقی کرتے کرتے برصغیر پاک و ہند میں پھیل گئی۔

اگر تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو اردو شاعری کے پہلے دیوان مرتب کنندہ شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ گردانے جاتے ہیں۔ وہ قطبی خاندان کے فرماں رواؤں میں سے پانچویں فرماں روا تھے۔ چوتھے فرماں روا ابراہیم قلی قطب شاہ کے تیسرے برخوردار تھے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ 1565ء میں پیدا ہوئے۔ بعدازاں عمر نوخیزی میں ایک طوائف کے عشق میں مجبوراً انھیں نفاست تصنع کی بنا پر لپٹنا پڑا۔ اس مقامی طوائف کا نام بیگماتی تھا۔ جس کا رقص اور خوش گلو آواز سبب تسکین تھا۔ شہزادہ محمد قلی قطب شاہ بیگماتی کا رقص دیکھ کر اس کا عاشق ہوگیا۔ بیگماتی ایک گاؤں کی مکین تھی وہ گاؤں حیدرآباد دکن میں موجود دریائے موسیٰ کے کنارے پر واقع تھا۔ محمد قلی قطب شاہ اب ایک معمول بنا چکا تھا کہ وہ روزانہ بیگماتی کا رقص دیکھتا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوتا اور گولکنڈہ سے دریائے موسیٰ کی طرف بڑھتا ہوا اسے پار کر جاتا۔ بعدازاں عبور دریا کے بعد وہ اس کی نفیس آواز اور رقص سے لطف اندوز ہوتا۔ محمد قلی قطب شاہ کو اس کے گاؤں تک پہنچنے کیلئے جان خطرے میں ڈالنا پڑتی۔ دریائے موسیٰ جیسی رکاوٹ کو وہ جذبہ عشق کے ساتھ عبور کرلیتا جیسا کہ فرہاد کو جذبہ عشق میں کوہ کو چیرنا اور جوئے شیر بہانا کسی اہمیت کا حامل نہ تھا۔ اسی طرح شہزادے کے ساتھ بھی یہ ماجرا درپیش ہوا اور اسے دریا عبور کرنا کچھ مشکل نہ لگا۔ ایک عشق ہی ایسی چیز ہے جو انسان سے ناممکن کو ممکن کروا دیتی ہے۔

ایک مرتبہ دریائے موسیٰ کے کنارے پر واقع بیگماتی کے گاؤں میں سیلاب آ گیا اور دریائے موسیٰ نے بیگماتی کے چمن کو گورستان کی شکل دے دی۔ جب یہ خبر شہزادے محمد قلی قطب شاہ کے کانوں میں پڑی تو وہ نہایت مضطرب ہوا۔ اس کے ذہن میں بیگماتی کے چمن کے بارے میں سوالات اُٹھنے لگے۔ بے قراری اس کے دل کا آشیانہ بن گئی۔ بیگماتی اس کی الفت جانچنے کیلئے ایک سوالیہ نشان بن گئی۔ آخر کار اس کے جذبہ عشق نے یہ فیصلہ لینے پر اتفاق کیا کہ وہ بیگماتی کو تلاش کرنے ضرور جائے گا۔ آیا کہ وہ بچی بھی ہے کہ نہیں؟ یا اس دارفانی سے کوچ کر گئی ہے؟ شہزادے کا اضطراب حد سے بڑھ گیا۔ اس نے اسی وقت گھوڑے کو تیار کیا اور بیگماتی کے گاؤں کی طرف روانہ ہوگیا۔ محمد قلی قطب شاہ کو اس کے والد ابراہیم قلی قطب شاہ نے بہت روکا کہ وہ بیگماتی کے گاؤں نہ جائے۔ مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ شہزادے کو بڑے بڑے درباریوں اور وزراء نے بھی روکنا چاہا مگر سب بے سود۔ وہ اسی گاؤں کی طرف روانہ ہوگیا۔ آخر کار جب اس کے گھوڑے نے اپنے پیر دریائے موسیٰ میں رکھے تو اس کے والد کو فکر ہونے لگی کہیں شہزادہ ڈوب ہی نہ جائے مگر یہ دریا عبور کرنا تو شہزادے کے لیے معمول کی بات ہو چکی تھی۔ دریا عبور کر کے جب شہزادہ بیگماتی کے گاؤں میں داخل ہوا تو مضطرب ہونے لگا۔ وہ چمن جس میں موسم بہار رہتا تھا آج وہ تباہ ہو چکا تھا۔ شہزادے کیلئے تو وہاں موسم بہار ہی رہتا خواہ خزاں، سرما، یا گرما ہو۔ اب وہ چمن قبرستان میں بدل چکا تھا۔ شہزادے نے دیکھا کہ سارے کا سارا گاؤں لاشوں کا ڈھیر بنا پڑا ہے۔ شہزادے کا اس وقت کوئی پرسان حال نہ تھا۔ وہ خود ہی سے سوال جواب کئے جا رہا تھا۔ تلاش کرتے کرتے اسے بیگماتی زندہ مل گئی جس سے شہزادے کی جان میں جان آ گئی۔ اس کے تشنہ لبوں کو کوثر و تسنیم کا جام مل گیا اور اس کے دل کا چمن پھر سے شاد ہو گیا۔ دوبارہ حور، طوطے، کوئل وغیرہ جیسے پرندے اس کے چمن میں چہکنے لگے۔ شہزادہ بیگماتی کو دیکھ کر باغ باغ

ہو گیا۔ اس کے بعد بھی یہی دریا عبور کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اگرچہ شہزادے کے والد نے اس کی توجہ بگھماتی سے ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر یہ کوشش بھی بے سود رہی۔ شہزادے محمد قلی قطب شاہ کے والد ابراہیم قطب شاہ نے ایران اور برصغیر سے بڑے بڑے فصحاء کو بلوایا تاکہ شہزادے کی توجہ بگھماتی سے ختم کی جائے مگر فصحاء کا بھی شہزادے پر کچھ اثر نہ ہوا۔ شہزادہ معمول کے مطابق دریا عبور کرتا اور بگھماتی کے رقص سے لطف اندوز ہوتا۔ جب شہزادے کے والد کی سب کوششیں رایگاں گئیں تو آخر کار اس نے شہزادے کی حفاظت کے لئے دریائے موسیٰ پر پل تعمیر کروایا تاکہ کہیں شہزادہ دریا عبور کرتا کرتا ڈوب ہی نہ جائے۔ بگھماتی غیر مسلم تھی اس لئے اس نے اسلام قبول کیا اور پھر شہزادے سے شادی کر لی۔

اس جنونِ عشق اور جذبات نے خود کو ظاہر کرنا چاہا جس کیلئے شہزادے نے شاعری کو منتخب کیا۔ اس کے

تاریخ کے جھروکوں سے اپنی نوعیت کا ایک منفرد واقعہ!

سلطان نورالدین زنگی عشاء کی نماز پڑھ کر سوئے تھے کہ اچانک اُٹھ بیٹھے اور نم آنکھوں سے فرمایا۔ میرے ہوتے ہوئے میرے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کون ستا رہا ہے۔ آپ اس خواب کے بارے میں سوچ رہے تھے جو مسلسل تین دن سے انہیں آ رہا تھا اور آج پھر چند لمحوں پہلے انہیں آیا جس میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو افراد کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ یہ مجھے ستا رہے ہیں۔ اب سلطان کو قرار کہاں تھا، انہوں نے چند ساتھی اور سپاہی لے کر دمشق سے مدینہ جانے کا ارادہ فرمایا اس وقت دمشق سے مدینہ کا راستہ بیس پچیس دن کا تھا مگر آپ نے بغیر آرام کیے یہ راستہ 16 دن میں طے کیا۔ مدینہ پہنچ کر آپ نے مدینہ آنے اور جانے کے تمام راستے بند کروائے اور تمام خاص و عام کو اپنے ساتھ کھانے پر بلایا۔ اب لوگ آ رہے تھے اور جا رہے تھے۔ آپ ہر چہرہ دیکھتے مگر آپ کو وہ چہرے نظر نہ آئے۔ اب سلطان کو فکر لاحق ہوئی اور آپ نے مدینے کے حاکم سے فرمایا کہ کیا کوئی ایسا ہے جو اس دعوت میں شریک نہیں۔ جواب ملا کہ مدینے میں رہنے والوں میں سے تو کوئی نہیں مگر دو مغربی زائر ہیں جو روضہ رسولؐ کے قریب ایک مکان میں رہتے ہیں تمام دن عبادت کرتے ہیں اور شام کو جنت البقیع میں لوگوں کو پانی پلاتے ہیں عرصہ دراز سے مدینہ میں مقیم ہیں۔ سلطان نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، دونوں کو بلایا گیا ان پر نظر پڑتے ہی سلطان بُری طرح چونک گئے کیونکہ یہ وہی دو چہرے تھے جو خواب میں سلطان کو دکھائے گئے تھے۔ سلطان نے ان کے گھر کی تلاشی لی۔ گھر میں تھا ہی کیا ایک چٹائی اور دو چار ضرورت کی اشیاء۔ یکدم سلطان کو چٹائی کے نیچے کا فرش لرزتا محسوس ہوا۔ آپ نے چٹائی ہٹا کر دیکھا تو وہاں ایک سرنگ تھی۔ آپ نے اپنے سپاہی کو سرنگ میں اُترنے کا حکم دیا وہ سرنگ میں داخل ہوا اور واپس آ کر بتایا کہ یہ سرنگ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مبارک کی طرف جاتی ہے۔ یہ سُن کر سلطان کے چہرے پر غیظ و غضب کی کیفیت طاری ہوگئی آپ نے دونوں زائرین سے پوچھا کہ سچ بتاؤ کہ تم کہاں سے ہو؟"

حیل و حجت کے بعد انہوں نے بتایا کہ وہ نصرانی ہیں اور اپنی قوم کی طرف سے تمہارے پیغمبر کے جسم اقدس کو چوری کرنے پر مامور کیے گئے ہیں۔ سلطان یہ سن کر رونے لگے۔ اسی وقت ان دونوں کی گردنیں اُڑا دی گئیں۔ سلطان روتے جاتے اور فرماتے جاتے کہ میرا نصیب کہ پوری دنیا میں سے اس خدمت کے لئے اس غلام کو چنا گیا۔ اس ناپاک سازش کے بعد ضروری تھا کہ ایسی تمام سازشوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کیا جائے، سلطان نے معمار بلائے اور قبر اقدس کے چاروں طرف خندق کھودنے کا حکم دیا یہاں تک کہ پانی نکل آیا۔ سلطان کے حکم سے اس خندق میں پگھلا ہوا سیسہ بھر دیا گیا، سیسے کی یہ خندق آج بھی روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد موجود ہے۔ (از تاریخ مدینہ)

والد نے شہزادے کی تعلیمی میدان میں بھی اچھی خاصی تربیت کی تھی۔ اس وجہ سے اسے فن شعروشاعری سے بھی آگاہی تھی۔ لہٰذا اس کے پاس جذبات اور فن بھی تھا اور وہ شاعری کے اصول وضوابط سے اچھی طرح آشنا تھا۔ چونکہ شاعری دلی جذبات وخیالات کا اظہار ہے اور اس طرح کرنا کہ انہیں ضوابط شاعری میں نظم کرنا شاعری کہلاتا ہے۔ شعر کی موزوں تعریف آج تک کوئی بھی نہیں کرسکا۔ تاہم اس کی تعریف اس طرح بھی کی جاتی ہے کہ۔ شعر کے لغوی معنی (دانستیں و دریافتن) ہیں۔ اصطلاح میں "سخن موزوں" کو کہتے ہیں کہ قصد متکلم سے صادر ہوا ہو اور معنی پر دلالت کرے اور صحیح الوزن ہو یعنی بے معنی سخن موزوں کو شعر نہیں کہتے اور اگر قائل کا ارادہ اس کے موزوں کرنے کا نہ ہو تو وہ بھی شعر نہیں ہوسکتا جیسا کہ قرآن کریم میں اگرچہ کئی مقامات پر موزوں کلام وارد ہوا ہے مگر اسے شعر نہیں کہیں گے شعر کی تعریف میں قصد اور ارادے کی قید و پابندی اس لئے لگائی ہے کہ اکثر نثر بھی موزوں ہوجاتی ہے لیکن اسے شعر نہیں کہہ سکتے۔

بات کو واپس داستان عشق کی طرف لاتے ہیں۔

آخر کار سلطان محمد قلی قطب شاہ 1611 کو اس دارفانی سے کوچ کرگیا۔ چونکہ سلطان محمد قلی قطب شاہ فن شعروشاعری سے آگہی رکھتا تھا اور ساتھ ساتھ جذبات ولطیف زباں کا بھی حامل تھا اس لئے وہ شعروشاعری میں مہارت رکھتا تھا۔ اسی بات کی تائید اثر لکھنوی اپنی زبان میں اس طرح کرگئے ہیں۔

شاعری لطیف زباں تک نہیں محدود
ساتھ ہی ساتھ فروانی جذبات بھی ہو

یا پھر اثر اس جوش عشق کی بات کچھ ایسے اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

جام خالی کو چھلکتے کبھی دیکھا ہے اثر
شعر میں جوش کہاں دل میں اگر جوش نہ ہو

یہ دونوں باتیں سلطان محمد قلی قطب شاہ میں موجود تھیں شعر کہنے کیلئے جذبات و جوش دونوں بدرجہ اتم موجود تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ مصنوعی تخیل نہیں رکھتا تھا بلکہ عشق مجازی کا حامل بھی تھا۔ وہ تمام میرے جیسے افراد جو قواضی و رویف کو تھوڑا سیدھا کرکے لکھ لیتے ہیں اسے شعر اور خود کو شاعر تصور کرتے ہیں جبکہ یہ ہماری صریح غلطی ہے۔ شعروشاعری میں علم عروض، بحور، قواضی وغیرہ کے ساتھ ساتھ اوزان کو بھی زیر نظر رکھنا پڑتا ہے۔ اس علم پر عمل کرتے وقت بڑے بڑے شاعر بھی کبھی کبھی بھٹک جاتے ہیں۔ علم عروض نہایت دقیق اور پیچیدہ علم ہے۔ اس لئے اکثر شعراء کو ایک غزل کہنے کیلئے کافی عرصہ بھی لگ جاتا تھا اور جلدی بھی کامیابی سے ہمکنار ہوتے تھے۔ شعر یا غزل اکثر شعراء کا خون پی کر اُترتے ہیں۔ اسی لئے امیر مینائی نے اپنے تجربے اور شعراء کی محنت اور حالت سے واقف کیا۔

امیر اک مصرع تر تب کہیں صورت دکھاتا ہے
تن شاعر میں ہوتا خشک ہے جبکہ لہو برسوں

اب سلطان محمد قلی قطب شاہ کی اس تاریخی داستان کے بعد میں آپ کو ان کے دیوان سے چند اشعار پیش نظر کرتا چلوں۔

ہے معنی سے رُخ زردی ہماری دُور کر ساقی
مجالس زہرہ رقاصی سے تو پرنور کر ساقی
جو کوئی عشق میں ثابت ہے جینا ہے سدا اسکا
سو اس کے نام سے میخانہ معمور کر ساقی
بہشتی باغ میں میری مراداں کے کھلے ہیں گل
میری مجلس کو مست نغمہ بنور کر ساقی
نظر کی حرمت سے دیکھ مجھ مسکین کو یک پل
پیا کی کیائی تگ سے فغفور کر ساقی

(سلطان محمد قلی قطب شاہ)

نوشابہ اختر

کہیں کاسہ لیے گدا دیکھا

"[illegible] کے ہاتھوں میں [illegible] سب والے عبدالوہاب کی ایک ماہ بعد شادی تھی۔ کیونکہ [illegible] شادیاں [illegible] اپنے بیٹے [illegible] عبدالوہاب کا [illegible] جس [illegible] گھر میں داخل ہوتے [illegible] آذان [illegible] دیکا تھا۔ [illegible] سب کے بچے یتیم ہو گئے۔ [illegible] ایک جملہ دہرائے جا رہے تھے۔

ایک صاحب حیثیت شخص کا ماجرا جو ایک خاص گھڑی میں مانگنے نکل کھڑے ہوئے تھے



آج [illegible] سے [illegible] وہ پھر [illegible] کا حسن اخلاق ہوگا۔

اب وہ [illegible] قائل ہو سکتے ہیں۔ جو [illegible] وہ تھے [illegible] تو یہ ٹھیک ہے کہ آپ اس کی شخصیت سے اس کی بات چیت سے اس کے [illegible] حالات سے متاثر ہوتے ہیں

وہ ایک خوبصورت دن تھا۔ [illegible] سردی کی شدت میں کمی آ گئی تھی اور دھوپ نے بکھری ہوئی آنکھوں سے زمین کو منور کرنے کی کوشش کی تھی۔ [illegible] بے شمار [illegible] کے چہرے [illegible] کی [illegible] گھر سے نکلنا مشکل ہو رہا تھا۔ [illegible] سوئٹر پہن کر میں نے [illegible] اور گاڑی کی چابی لے کر باہر نکل آیا۔

سردی تھی مگر میں نے اپنی سوچوں کے زاویئے بدلتے ہوئے سردی کو کم کرنے کی کوشش کی۔ گاڑی کا ہیٹر میں نے کبھی نہیں چلایا نہ جانے کیوں مجھے گرم گاڑی میں الجھن سی ہونے لگتی ہے۔ بہر حال ہمیشہ کی طرح میں مختلف دعائیں پڑھتی گاڑی لے کر نکل گئی۔

لبرٹی پہنچ کر میں نے پارکنگ ایریا میں گاڑی کھڑی کی۔ باہر قدم رکھا تو سامنے ایک بہت مدبر قسم کے شخص کو اپنے بالکل قریب پایا۔ میں تھوڑا سا گھبرائی پہلے سوچا گاڑی میں بیٹھ کر لاک کروں اور کہیں اور پارک کردوں لیکن ایک انتہائی شائستہ آواز نے مجھے روک لیا۔

''بیٹی! کیا آپ میری بات سننا پسند کریں گی۔''

میری اپنی عمر اس وقت ستر سال سے اوپر تھی مخاطب کرنے والا میرے اندازے کے مطابق اسی سال سے کچھ کم ہوگا۔ میں نے ان کی طرف دیکھا اور دوسری طرف مڑتے ہوئے کہا۔

''جی میں ذرا جلدی میں ہوں پلیز مجھے راستہ دے دیں۔'' ''جی بہت اچھا آپ جائیے۔ لیکن اگر آپ مجھ مصیبت زدہ کو کوئی سہارا دے سکیں تو یہ احسان عظیم ہوتا۔''

بہت ہی شائستگی سے ادا کئے ان الفاظ نے میرے قدم روک لئے۔

''جی۔ میں آپ کی کیا مدد کرسکتی ہوں۔'' میں نے سوال کیا تو وہ مجھ سے کچھ دور ہوکر بولے۔

''بس! میرے بیٹے کے یتیم بچوں کے لئے ایک روز کی روٹی کا انتظام کردیجئے۔ کل کا اللہ وارث ہے''۔

میں نے پرس کھول کر ایک نوٹ ان کی طرف بڑھایا جسے انہوں نے بصد احترام غور سے دیکھا اور شکریہ کہتے ہوئے بولے۔

''اللہ تعالیٰ آپ کو اس کے عوض پانچ لاکھ عطا فرمائے گا۔''

اس وقت تو مجھے جلدی تھی کئی کاموں کی لسٹ اور دو تین گھنٹے اوپر سے بڑھتی ہوئی ٹریفک کا خوف بہر حال میں نے ان کی بات پر غور کئے بغیر اپنے کام شروع کردیئے۔

دوپہر کھانے کے دوران میں نے جب یہ بات اپنے گھر والوں کو سنائی تو سبھی بول اٹھے۔

''بس آپ کو متاثر کرنے کے لئے کوئی بھی دو الفاظ اچھی طرح بول دے تو آپ اس پر سب کچھ لٹانے کو تیار ہوجاتی ہیں۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''اماں جانی! یہ فراڈ کا زمانہ ہے ٹھگ ہمارے چاروں طرف موجود ہیں اور آپ اپنا پرس کھول کر کھڑی ہوگئیں وہ صاحب! اگر پرس ہی چھین کر لے جاتے تو کیا تھا سب کچھ گھر کی چابیاں' سارے کارڈ وغیرہ وغیرہ اور موبائل بھی۔''

''بیٹا تھوڑی سی انسانوں کی پہچان مجھے بھی ہے۔ اپنے ابو سے اس کی تصدیق کرلو۔'' میں نے جوابا کہا تو میرے شوہر نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور سر ہلا کر تصدیق کردی۔ کیونکہ بولنے کے معاملے میں وہ بے حد کنجوس واقع ہوئے ہیں۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ زندگی کے معمولات بھی کبھی رکے ہیں۔ یعنی

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
زندگی یوں ہی تمام ہوتی ہے

سوچتی ہوں آج کے مصروف دور کی مصروف ترین زندگی میں نماز پڑھنا بہت سے لوگوں کو کتنا مشکل لگتا ہے انتہائی دشوار گزار کام لیکن اگر یہی نماز ہم ادا کرکے دشوار زندگی کو آسان بنانے کا گر جان لیں تو شاید ہماری کوئی نماز بھی قضا نہ ہو۔

بہت سے کام نمٹانے کے باوجود جب سونے کے لئے لیٹتی ہوں ایک کمی اور خلش کا احساس رہتا ہے۔ خود احتسابی میرا ہمیشہ وطیرہ رہا اور یہ خود احتسابی کا عمل رات سونے سے پہلے ہوتا تھا۔ تاکہ اگلے روز غلطی کا امکان کم ہوسکے۔ کیونکہ انسان خطا کا پتلا ہے اور دانستہ اور نادانستہ بھی اس سے اغلاط کا ارتکاب ہوجاتا ہے۔

بہرحال میں ذکر کررہی تھی اس شخصیت کا جس نے مجھ سے پانچ سو روپے کا نوٹ لے کر مجھے پانچ لاکھ کی واپسی کی دعا دی تھی اور جنہیں میں بھلا چکی تھی۔

تقریباً چھ آٹھ ماہ بعد میرا پھر اسی مارکیٹ میں آنے کا پروگرام بنا۔ تقریباً وہی وقت اور اسی جگہ کی پارکنگ۔ اور آپ یقین جانیں وہی ہستی' بہترین استری شدہ سفید شلوار قمیض پہنے وہ میری گاڑی کے قریب آئے اسی شائستگی اور تہذیب کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''بیٹی کیا آپ میری بات سننا پسند کریں گی؟''

اس روز کی طرح میں نے جلدی مچانے کے بجائے اپنے لہجے میں شائستگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''جی فرمائیے۔ میں آپ کی کیا مدد کرسکتی ہوں۔''

''بس۔ میرے مرحوم بیٹے کے یتیم بچوں کے لئے ایک روز کی روٹی کا انتظام کردیجئے۔ کل کا اللہ وارث ہے۔''

وہی لہجہ' وہی الفاظ' وہی انداز مخاطب میں سوچ میں پڑ گئی۔ کیا کروں' دوں یا نہ دوں کی سولی پہ لٹکی میں کوئی فیصلہ نہیں کرپارہی تھی کہ وہ مخاطب ہوئے۔

''کوئی مجبوری نہیں بیٹا! اللہ مسبب الاسباب ہے آپ جائیے۔ کوئی تو ہوگا جسے میرا رب بھیج دے گا۔''

آواز اور لب ولہجہ کی کاٹ اور سوز نے میرے پاؤں جکڑ لئے اور میں نے فوراً پرس کھول کر ایک نوٹ ان کو پکڑادیا۔

''اللہ تعالیٰ آپ کو اس کے عوض پانچ لاکھ عطا فرمائے۔'' وہی دعا' وہی خلوص بھرا لہجہ۔

دعا دیتے وہ پلٹ گئے اور میں حیران سوچتی رہ گئی کہ یہ سب کیا ہے؟ یہ کون ہیں اور کیا ان کے آگے پیچھے بھی کوئی ہے؟

بہرحال اب کی بار بھی بات آئی گئی ہوگئی کیونکہ میرے پاس اتنا وقت تو نہیں تھا کہ میں ان کا پیچھا کرکے دیکھتی کہ وہ اور کہاں جاتے اور کیا کرتے ہیں۔

ان دنوں میرے پاس لندن سے بہن آئی ہوئی تھیں اور انہیں کچھ زیور دے کر نیا بنوانا تھا۔ میں انہیں لے کر ایک جیولری شاپ پر پہنچی جس کے بہترین ہونے کا بہت تذکرہ میری ایک دوست نے کئی بار مجھ سے کیا تھا۔ بڑے مہذب انداز میں وہاں سب لوگ بات چیت کررہے تھے۔ ہمیں بھی ایک لڑکے نے بٹھایا۔ فوراً ٹھنڈا منگوایا اور بات چیت شروع ہی ہوئی تھی کہ گارڈ نے مین ڈور کھولا اور وہی ہستی جو میرے لئے معمہ بنی ہوئی تھی اندر داخل ہوئی۔ سب نے بڑے ادب سے انہیں سلام کیا اور وہ ایک شیشہ کے دفتر کے اندر جاکر ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں حیران نگاہوں سے ان کا تعاقب کررہی تھی ہمیں اٹینڈ کرنے والے لڑکے نے کچھ محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''یہ اس شاپ کے مالک ہیں جی! بہت ہی پیارے انسان''۔ میں نے بمشکل تمام اپنے جذبات کو قابو کیا اور باجی کے ساتھ اصل کام کی طرف متوجہ

ہوگئی۔ لیکن الجھا ہوا ذہن کچھ کرنے ہی نہیں دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد باجی نے مجھے کہا کہ ادھر ادھر دیکھو تا اور میں ذرا سی الرٹ ہوجاتی۔

بہرحال اسی کھینچا تانی میں ہم دونوں بہنیں اپنا آرڈر بک کروا کے باہر آئیں۔ میں نے گاڑی کھولی تو بیٹھتے ہی باجی الجھ پڑیں "کیا مسئلہ ہے تمہارا؟ ذرا بھی یکسوئی سے تم نے میرا کام نہیں کیا۔ کیا پیٹ میں درد ہو رہا تھا۔؟"

"نہیں باجی! بس کچھ سر میں درد ہو رہا تھا۔" میں نے بہانہ گھڑا کیونکہ میں انہیں اصل الجھن بتا نہیں رہی تھی۔

"تم ذرا سنبھل کر جھوٹ بولا کرو میری بہن کیونکہ تمہیں جھوٹ بولنا نہیں آتا۔" یہ میری پیاری باجی کے الفاظ تھے اور میں مسکرا کر گاڑی موڑنے میں مصروف ہوگئی۔

بعض اوقات کوئی عام آدمی بھی کسی بات کو اس انداز میں بیان کر جاتا ہے کہ صدیوں کی رکی ہوئی دانش خشک پتھریلی زمین میں چشمے کی طرح جاری ہوجاتی ہے پر یہ تو میری بڑی سی باجی تھیں جنہوں نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی گرہ لگ گئی ہے تمہارے دماغ میں۔ اس بڑی معزز سی شخصیت نے شاید تمہیں مسحور کردیا۔ ویسے وہ واقعی قابل صد احترام لگ رہے تھے۔ مگر تھوڑے سے پراسرار بھی۔"

اور یہ پراسرار کا نقطہ مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کررہا تھا۔ باجی تو چلی گئیں۔ ان کے آرڈر کی چیزیں مجھے ہی وصول کرنا تھیں اس لئے پھر وہی ہیرا اور میں نے عین اسی وقت کا خیال رکھتے ہوئے گاڑی وہیں پارک کی۔ میں گاڑی سے نکلی تو آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ لیکن مجھے جیسے کسی کا انتظار تھا۔ اس لئے ذرا آہستگی سے اپنے کام کررہی تھی۔ ڈگی میں سے دو شاپر نکال کر ڈگی بند کی اور پیچھے مڑی تو وہ ہستی اسی مخصوص شان سے بصد احترام میرے قریب موجود تھی۔ وہی انداز تخاطب وہی محبت سے بھری ہوئی دعا اور سبھی سے واپسی کا سفر۔

آج مجھے کوئی بھی جلدی نہیں تھی۔ کام صرف یہی تھا اس لئے میں ذرا سا فاصلہ رکھ کر ان کے پیچھے چل پڑی۔ انہوں نے کسی اور کو نہیں دیکھا۔ کسی اور گاڑی کے قریب نہیں رکے اور چلتے چلتے اپنی ہی شاپ میں داخل ہوگئے۔ میں ذرا سا رک کر ان کے پیچھے ہی اندر داخل ہوئی وہ سب کے سلام کا جواب دیتے اپنے آفس میں جاچکے تھے۔

آپ کو بھی یقیناً یہ سارا قصہ عجیب لگ رہا ہوگا لیکن میں جس کیفیت سے گزر رہی تھی شاید آپ پر وہ ابھی طاری نہیں ہوئی۔ میرے سامنے وہی لڑکا کھڑا تھا صاف ستھرا نکھرا نکھرا سا۔ باادب بہت ہی پیارے سے اس نے مجھے متوجہ کیا اور میرے سامنے الائچی سے بھری پلیٹ رکھ دی۔

"اپنی آرڈر سلپ مجھے دیجئے گا۔ جی جی!" اس نے اسی احترام سے مجھے مخاطب کیا۔ اور یہ سب و لہجہ اس ہستی کا ہی تھا جس نے مجھے شدید الجھن میں ڈال دیا تھا۔ جیولری شاپ کا مالک اور..... اس سے آگے کچھ کہنا شاید ان کی شان کے خلاف ہوجائے۔

"میرا نام حذیفہ ہے اور یہ بزرگ ہستی میرے دادا جان ہیں۔" اس نے شاید میری نظروں کا بار بار اس طرف اٹھنا پہچان لیا تھا۔"

"اور آپ کے والد صاحب؟ میں اپنے اندر کے ہیجان کو چھپا نہ سکی۔"

"وہ شہید کردیئے گئے تھے۔" اس کی آنکھوں میں جیسے نمی سی آنے لگی تھی۔"

''کب؟ کہاں؟ کیسے'' میں نے بڑی بے تابی سے پوچھا تو شاید وہ زیرک سا لڑکا بہت کچھ سمجھ گیا۔ تھوڑا سا میری طرف جھکتے ہوئے بولا۔

''دادا جان نے کبھی آپ سے کچھ طلب تو نہیں کیا۔ اگر کیا ہے تو پلیز بتا دیجئے۔ میں ابھی ادا کر دیتا ہوں۔''

''نہیں بیٹا! ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے شفقت سے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ''بس مجھے پتہ نہیں کیوں آپ کے داداد سے انسیت سی ہو گی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے میں ان کے متعلق بہت کچھ جان سکوں۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں نا بیٹا جن کی ہستی رشتوں کی بقاء کے لئے رابطے بناتی ہے اور جو اپنے ہاتھوں سے لگائے ہوئے درختوں کی ہمیشہ آبیاری کرتے رہتے ہیں تا کہ وہ سوکھ نہ جائیں۔''

وہ میرے الفاظ کی گہرائی کو جانچتے ہوئے مسکرا دیا۔

''لگتا ہے آپ لکھاری ہیں۔ آپ بھی میرے غریب خانے پر تشریف لایئے۔ (اس نے اپنا کارڈ مجھے تھما دیا) شاید میری والدہ سے آپ کی ملاقات رشتوں کے رابطے اور رشتوں کی گہرائیوں کی گرہیں کھول سکے اور میری دادی ماں تو آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔''

''اس زمانے میں اتنی اچھی اردو آپ کی زبان سے سن کر میں بہت خوش ہوئی ہوں۔'' میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا بہرحال میں ضرور آؤں گی۔ ایک انمول داستان سننے کیلئے۔''

یہ کہتے ہوئے میں اٹھی وہ دروازے تک میرے ساتھ آیا۔

''آنے سے پہلے فون کر لیجئے گا اتوار کا دن ملاقات کیلئے بہترین رہے گا۔ اللہ حافظ۔''

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس مہذب لڑکے کا حلیہ میری نظروں میں گھسا چلا آ رہا تھا۔ مناسب الفاظ کا بروقت استعمال اس کی شاندار شخصیت کا مظہر تھا۔ طلب اور مانگنا ہم معنی الفاظ سہی لیکن مانگنے والا تو گداگر' بھکاری یا فقیر ہوتا ہے اور طلب گار تو معزز ہی ہو سکتا ہے نا۔ اس نے اپنے دادا ابا کو فقیر کی گدڑی میں گھسنے سے بچالیا میں یوں ہی تو ان کی طرف ملتفت نہیں ہوتی جا رہی تھی۔

کئی روز کیا کئی ماہ گزر گئے۔ پرس میں رکھے کارڈ کو دیکھتی تو جی چاہتا فوراً ان کی طرف چلی جاؤں اور میری مصروفیات کہیں رکنے کا نام لیتی ہی نہ تھیں۔ اس لئے اتوار پر اتوار گزرتے چلے گئے۔ پھر خوش قسمتی سے ایک اتوار آ ہی گیا۔ میرے شوہر کسی کانفرنس پر جا رہے تھے اور بچے کوئی فلم دیکھنے کے موڈ میں تھے۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور فوراً فون ملایا۔ وہی مانوس سی آواز وہی مہذب انداز گفتگو' سلام دعا کے بعد اس نے کہا۔

''آپ تو بھول ہی گئیں اور میں منتظر ہی رہا دراصل آپ بھی مجھے کچھ منفرد سی خاتون لگیں ورنہ میں یوں کسی کو اپنے ہاں آنے کی دعوت نہیں دیتا کیونکہ لوگ اصل میں وہ نہیں ہوتے جو نظر آ رہے ہوتے ہیں۔''

''ارے ارے کچھ ملاقات کے لئے بھی گلہ گزاری باقی رکھ لو۔ بھئی! کچھ یہاں بھی معاملہ کچھ ایسا ہی ہے لیکن مصروفیات نے سر اٹھانے ہی نہیں دیا۔ بہرحال اگر اس وقت آپ لوگ فارغ ہوں تو میں آ جاؤں۔'' میں نے بڑے پیار سے اسے مخاطب کیا' کہ وہ اسی کے لائق تھا۔

''بسر و چشم۔ چشم ماروشن دل ماشاد۔'' اس کی آواز میں ایک کھنکھناہٹ تھی۔

''تو جناب! میں حاضر ہوتی ہوں۔'' میں نے بھی اسی انداز سے جواب دیا اور گاڑی پکڑ ان کی

طرف جا پہنچی۔ میں ان کی جائے رہائش وغیرہ کے متعلق کچھ نہیں بتاؤں گی۔

ایک انتہائی شاندار چائے میری منتظر تھی اور اس سے زیادہ شوق اضطراب اس کی والدہ اور دادی کے انداز میں تھا۔

''بھئی! ہم نے اتنا طویل انتظار کبھی کسی کا نہیں کیا۔ جتنا آپ نے کروایا ہے۔ ہماری تو خواہش تھی ہم ہی آپ کے دولت کدے پر چلے آئیں۔'' اس کی دادی ماں نے میرا ماتھا چومتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''جیسا سنا تھا اس سے زیادہ بہتر ہی پایا۔''

''جی میں کچھ کہا'' میں نے حیرانگی سے کہا تو وہ مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے بیٹھ گئیں۔ ''یہ میرا پوتا تعریف کرنے میں کچھ کمزور واقع ہوا ہے لیکن پتہ نہیں آپ نے اس پر کیا جادو کردیا کہ ہر وقت آپ ہی کا رطب اللسان رہتا ہے۔''

''اب آپ مجھے شرمندہ کررہی ہیں۔'' میں نے ذرا نروس سا ہوکر کہا تو اس کی امی نے کول ڈرنک میری طرف بڑھادیا۔

''یہ لیجئے۔ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔''

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں اپنے موضوع کی طرف آگئی۔ ''آپ سے اتنی ساری باتوں کے بعد آپ میرے لئے کافی کھلی کتاب کی طرح ہوگئی ہیں۔'' میں نے اس کی دادی ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا لیکن پیاز کی پرتوں کی طرح کچھ اندرون خانہ بھی تو ہے۔ کیا میں وہ پوچھنے کی جسارت کرسکتی ہوں۔''

پہلی ہی ملاقات کو یوں کھل کھیلنا کچھ مناسب تو نہ تھا مگر جانے پھر کب آسکوں۔ اس لئے لب کھولنے پڑے۔ دادی ماں جن کی عمر اس وقت سو سال کے قریب تھیں پرنم آنکھوں سے مسکرا رہی تھیں۔ عجب دھوپ چھاؤں کا سماں تھا۔ ''تم لکھاری لوگ بھی نا بڑی ہوشیاری سے پیاز کو چھیلتے ہو۔ پوچھو کیا پوچھنا ہے۔''

میں شیر ہوگئی۔ ''صرف ایک پرت اُتار دیں جس نے مجھے الجھنوں کے گورکھ دھندے میں پھنسا رکھا ہے۔ جیولری شاپ کے مالک اور۔''

مجھے زیب نہ دیا کہ کچھ اور کہوں مگر وہ جیسے سب کچھ جانتی تھیں مسکراتے ہوئے گویا ہوئیں۔

''اس ایک پرت کے اندر ہی تو سب کچھ ہے میری جان! مگر تمہارے پاس وقت ہے تو بولوں۔''

''میں تو وقت لے کے آئی ہوں۔ آپ فرمایئے۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

ایک صدی بھر کی عمر کے نقوش کچھ بہت زیادہ نہ تھے گورچی وہ خاتون صحت مند اور بقائمی ہوش و حواس تھیں ان کی آواز میں کوئی لڑکھڑاہٹ نہ تھی۔

''سنو میری دوست! وہ داستان جو ابھی تک سات پردوں میں چھپی ہوئی تھی شاید کوئی اس سے استفادہ حاصل کرسکے۔ ہم انڈیا کے ایک بہت ہی اچھے علاقے کے رہنے والے بہت کھاتے پیتے لوگ تھے۔ ہمارا پشتوں سے سونے کا کاروبار تھا۔ ہمارے بڑے مٹی میں ہاتھ ڈالتے تو سونا بن جاتا۔ نیتوں کے سچے' کاروبار کو دین و ایمان کی راہوں پر چلانے والے' اللہ والے لوگ۔ جن کے در سے سینکڑوں لوگوں کا رزق رب نے جوڑ رکھا تھا۔ ہم تو اس رب کے دیئے میں سے بانٹتے تھے اور بہتے سمندر کے پانیوں کی طرح کبھی اس میں کمی نہیں آتی تھی۔

جب ''بن کے رہے گا پاکستان'' کے نعرے لگنے شروع ہوئے تو ہمارے جوان لڑکے اور لڑکیاں میدان میں نکل آئے۔ میرے نکلنے پر پابندی لگ گئی۔ کیونکہ میں ماں بننے والی تھی۔ سارے دن کی روداد سن کر میرا جی چاہتا میں فوراً ان سب کے ساتھ نکل پڑوں اور اپنے دوپٹے کا پرچم بنا کر

پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کے نعرے لگاؤں۔ یہ سب قائداعظمؒ کے جلسوں میں بھی شریک ہوئے اور میں تشنہ لب صرف دعائیں کرتی رہی۔ پھر تصادم شروع ہوگئے۔ ہندو سکھ مسلمانوں کا قتل عام کرنے لگے۔ مسلمانوں کی دکانیں لوٹی جانے لگیں۔ لیکن میرا بیٹا پھر بھی منہ میں سونے کا چمچہ لئے دنیا میں آیا۔ ہم نے دھیرے دھیرے اپنا کاروبار سمیٹنا شروع کردیا۔ تاکہ ہم پاکستان ہجرت کرجائیں۔

میری جان! کہنے اور سننے اور دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ آج کی جوان نسل احساس کی سوئی کے اس سوراخ میں اپنے آپ کو نہ داخل کرسکتی ہے نہ نکال سکتی ہے جس سوئی کے ناکے سے ہم لوگ گزرے۔ آگ اور خون کی ہولی تھی۔ عصمتوں کی دھجیاں بکھیری جارہی تھیں۔ جوان ماؤں کے پیٹ چاک کرکے بچے نکالے اور تلواروں کی نوک میں پروئے جارہے تھے۔ عجب بے بسی کا عالم تھا۔ کوئی بھی تو انہیں روکنے والا نہیں تھا۔ ہمارے بڑوں کو یہی مشورہ دیا جارہا تھا کہ رک جائیے۔ یہ سیلاب بلا بہت جلد دم توڑ دے گا۔ پاکستان بن ہی نہیں سکتا اور بن گیا تو جلد ہی ختم ہوجائے گا۔ ہرلڑکا ہرلڑکی کا بھائی بن چکا تھا۔ دوئی کے تمام تاثر مٹ گئے تھے۔ ہم مسلمان تھے اور پاکستان لینے کیلئے ہر قربانی دینے کو تیار تھے۔ وہ ہندو اور سکھ تھے اور ان کی پشت پناہی انگریز کررہا تھا جو پاکستان اور اس کے نام لیواؤں کو جڑ سے کاٹ پھینکنا چاہتے تھے۔ میری بنو! جانے وہ کیسا جذبہ تھا جنون تھا اور اس جذبہ وجنون کی پشت پناہی رب العالمین کررہا تھا۔ جانے کب کب اور کس کس نے اس پاک سرزمین کے خواب کتنا پہلے سے دیکھ رکھے تھے۔ جو نسلوں کے خون میں مچل مچل کر امنڈتے آرہے تھے۔

میرے بیٹے کی پیدائش تک کچھ امن تھا۔ اس لئے باپ دادا نے اس کی آمد کی خوشی میں دیگوں کے منہ کھول دیئے۔ لنگر لگا دیئے۔ سبھی کھانے کو آرہے تھے۔ ہندو بھی سکھ بھی عیسائی اور مسلمان بھی۔ رزق دینے والی ذات تو رب کی ہے نا۔ بے امتیاز سب کو رزق دیتا ہے۔ پھر ہم کیوں پھیر لگا دیتے۔ صرف مسلمان ہی کھائیں گے۔ حضرت ابراہیمؑ کے پاس ایک غیرمسلم مہمان آیا اور بسم اللہ نہ پڑھنے پر آپ نے اسے دسترخوان سے اٹھا دیا۔ وحی اتری۔ ابراہیم میں اس بندے کو کئی سال سے کھلا رہا ہوں حالانکہ میں جانتا ہوں کہ اس نے میرے شریک بنا رکھے ہیں میں نے تو اس کا رزق نہیں روکا تم اسے ایک وقت کا کھانا نہیں کھلا سکے۔ ہمارے پیارے نبیؐ نے بھی تو ہر مسلک کے لوگوں کی مہمان نوازیاں کی تھیں اور یہ ہمارے آباؤاجداد تھے جو انہیں اصولوں پر زندگیاں گزار رہے تھے۔ آج کے دور کی نسل پرستی نہیں تھی کہ دوسرے مذہب والوں کو مارڈالو۔ جلادو۔

تفصیل میں جانے لگوں میری جان! تو کتابوں پہ کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ اور بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ میں تو آپ بیتی سنا رہی تھی۔" اسی وقت ملازمہ تازہ دم چائے لے کر آگئی۔ ان کے اشارے پر شکریہ کہہ کے ایک کپ میں نے لیا۔ دوسرا انہوں نے اپنی تپائی پر رکھ کر میری طرف دیکھا۔

"آپ لوگوں نے بھی کیا ہجرت کی تھی۔"

"نہیں آپی جان! ہم تو ادھر پاکستان میں ہی تھے۔ لیکن آپ کو اتنا ضرور بتادوں کہ دل کی آنکھ سے اور کتاب کے اوراق سے میں سب کچھ جان اور سمجھ چکی ہوں۔ میرے والد فوج میں تھے۔ اور اس وقت جبل پور میں ان کی پوسٹنگ تھی ہمیں انہوں نے واپس بھیج دیا تھا خود وہ ایک ٹرین لے کر پاکستان پہنچے تھے۔ اسے خوش قسمتی کہیے کہ یہ وہ واحد ٹرین تھی

جو سلامتی سے یہاں پہنچ گئی تھی۔“

جب میں نے انہیں یہ بتایا تو وہ مسکرا دیں۔ ”یہ تو بہت ہی خوبصورت بات بتائی تم نے۔ یہ ملک تو ہے ہی چاہے جانے کے لائق۔ اس تحفہ اصول کے لئے ہم لوگ رب کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔“ انہوں نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ بات جاری رکھی۔ ”ہم نے یعنی ہمارے بڑوں نے بڑے طریقے سے اپنے اثاثے پاکستان منتقل کرنے کی جدوجہد مکمل کر لی تھی۔ ارادہ تو یہ ہی تھا کہ ہم لوگ پہلے ہی ہجرت کر جائیں گے لیکن ہوتا تو وہی ہے نا جو رب چاہتا ہے۔ نانا شدید بیمار ہو گئے ان کی خواہش تھی کہ ہم لوگ کراچی شفٹ ہو جائیں اور وہ تندرست ہو کر وہاں آ جائیں گے۔ لیکن ہم میں سے کوئی بھی انہیں یوں چھوڑنا نہیں چاہ رہا تھا۔

اسی کشمکش و پیچ میں وقت گزرتا گیا۔ شاید ہماری ہجرت ہم سے قربانیاں مانگ رہی تھی۔ ایک بلوے میں ہمارے دو کزنز شہید ہو گئے۔ نانا کی طبیعت بہت بگڑ گئی۔ اور ہمارا سفر ملتوی ہوتا گیا۔ اور پھر نانا بھی ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔ یہ تینوں اموات بہت بڑا نقصان تھیں لیکن یہ تو اب ہر مسلمان گھرانے کی کہانی بنتی جا رہی تھی۔

پھر جہاز سے کراچی روانگی کی سیٹیں ریزرو ہو گئیں۔ بہت قیمتی سامان ساتھ رکھ گیا۔ اپنے پیاروں کی قبروں کو الوداع کہتے ہوئے ہم سب حویلی کو مقفل کر کے اپنے سفر کے لئے نکل پڑے۔ یہ چند جملے میرے جذبات کی صحیح عکاسی نہیں کر سکتے میری جان! لیکن اپنے آباؤ اجداد کی ساری نشانیوں کو الوداع کہنا بہت مشکل تھا۔ بڑے دادا نے بڑے تحمل سے ہم سب کو سمجھایا۔

”ذرا تصور میں لاؤ' مکہ سے مدینہ والوں کی ہجرت کو اس مقدس و رفیع و اعلیٰ ذات کی ہجرت کو جو رات کی تاریکی میں چھپ چھپا کر رب عظیم کے حکم پر چل پڑے تھے۔ وہ ہستی جو براق کی سواری تھی۔ فرشتوں نے جس کے قدم چومے غار ثور میں چھپ گئی۔ بچو! کیا رب ان کے لئے آسانیاں پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن قدرت کے سارے نظام تو فطری اصولوں پر چل رہے ہیں نا۔ ہم اپنے تین دفن شدہ افراد کے ہمراہ بھی عازم سفر ہو سکتے تھے۔ لیکن یہ اللہ ہے جو بندے میں عجز پیدا کرنے کیلئے اس کی راہیں بھی کھوٹی کر دیتا ہے اور کبھی بدل دیتا ہے۔ ہمیں تو راضی برضا رہنا ہے نا۔ اللہ کے ساتھ اپنی ساری امیدیں جوڑ کر۔“ انہیں تنہا کر کے اللہ کی آس پر چل نکلو ابھی تو نہ جانے قدم قدم پر آزمائشوں کا سامنا کرنا ہے۔

ہمارا سفر طویل تھا۔ ایئرپورٹ پہنچنے کے لئے پانچ سے سات گھنٹے کا سفر طے کر کے جب ہم ایئرپورٹ پہنچے تو میری جان! ہم مٹھی بھر افراد تھے بلوائیوں نے صرف قافلہ لوٹا ہی نہیں جوان لڑکوں کو مولی گاجر کی طرح کاٹ دیا۔ اور دراصل ان جوان لڑکوں کے لباس میں خاندان کی لڑکیاں بھی تھیں۔ ہمارا لٹا پٹا قافلہ جب کراچی پہنچا تو ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ وہ شاندار حویلی' نہ ہی وہ حویلی کے باسی' پتہ نہیں رب رحیم و کریم نے ہمیں کیسے یہاں تک پہنچا دیا اور پھر ہم بھی ریفیوجی کیمپ میں پہنچا دیئے گئے۔ میں ان لوگوں کی آخری وقت کی چیخیں اور ان چیخوں سے رسنے والے خون کا حساب نہیں بتا سکتی کہ میری زبان لڑکھڑا جاتی ہے۔ اس بات کا بہت شکر ہے کہ ہم نے اپنی جوان بیٹیوں کو بیٹوں کے لباس پہنا کر ان کی آبرو عفت و عصمت کی حفاظت کر دی۔ اللہ نے انہیں رسوا ہونے سے بچا کر شہیدوں کے ٹولے میں ملا دیا۔“ انہوں نے اپنے دوپٹے

پلو سے آنسو صاف کئے۔ ''پھر کہیں کوئی بہت ہی پرانے جاننے والے ہمیں اپنے گھر لے گئے وہ خود بھی جیولر تھے اور ہمارے گھر کے مردوں نے وہیں پر نوکری کرنا شروع کردی۔ اور وہ جس کے کرم سے ہم عاجز اور منکسر المزاج بنے اس نے پھر ہمیں بلندیوں کی طرف پرواز کے راستے دکھا دیئے۔ آہستہ آہستہ اس رب کریم نے ہمیں فرش سے اٹھا کر تخت پر بٹھا دیا اور ہم اس کا شکر ادا کرنے سجدے میں گر گئے۔''

ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ شاید شکرانے کے ہی تھے۔ ان کی بہو شہیرہ بانو اٹھ کر ہمارے قریب آگئیں۔ انہوں نے اپنی ساس کو محبت سے ساتھ لگایا اور پانی کا گلاس انہیں تھماتے ہوئے گویا ہوئیں۔

''اگر تاریخ یہیں تک رقم کردی جاتی میری بہن! تو شاید وہ تصویر جو خالق کائنات نے ہمارے لئے بنائی تھی نامکمل رہ جاتی۔ ہماری جیولری شاپ چل پڑی اور اس کے ساتھ ہی فراخ دلی سے خیرات وصدقات کا سلسلہ بھی چل پڑا کہ یہ سب، تو ہم رب کے دیئے میں سے دے رہے تھے۔ لیکن ابھی ایک اور آزمائش ہماری منتظر تھی۔ کام شروع ہوئے کئی سال بیت گئے۔ اسی دوران ہماری شادی بھی ہوئی۔ بچے پیدا ہوئے سب رحمتیں اللہ کی تھیں۔ میرے شوہر وہی ہستی تھے جن کو ان کی اماں سینے سے لگائے برستی گولیوں میں سے لے کر نکل آئی تھیں۔ دکان میرے دونوں دیور اور میرے شوہر چلا رہے تھے۔ ہم ایک ہی گھر میں پیار و محبت سے رہ رہے تھے۔ ننھے منے بچوں کی شرارتیں، ذرا بڑے بچوں کے سکول بیگ اور کتابیں، حلوئے گھر پوری گہما گہمی سے چل رہا تھا اور ہم اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے تھکتے نہیں تھے کہ وہ گھڑی آگئی جو بہت بڑی آزمائش تھی۔

کالج سے واپسی پر میرا بڑا بیٹا کبھی کبھی اپنے بابا کی مدد کرنے شاپ پر رُک جاتا تھا اور بابا بھی اسے اپنا بازو کہا کرتے تھے۔ اس روز وہ بھی شاپ پر ہی تھا کہ چار ڈاکوؤں نے حملہ کردیا سب کو آفس میں بند کرکے انہوں نے شاپ لوٹ لی میرے میاں اور ان کے دونوں بھائی بے بسی سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ جانے عبدالوہاب کو کیا ہوا کہ وہ کرسی دھکیل کر کھڑا ہوگیا۔ ایسے نہیں ہوسکتا۔ یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے ہی تھے کہ اس کا سینہ چھلنی کردیا گیا۔ اور ڈاکو فرار ہوگئے۔ پولیس پہنچی لیکن وقت گزر چکا تھا''۔ حوصلہ مند خاتون کے آنسو بہے جا رہے تھے اور میں بھی اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روک نہیں سکتی تھی۔

''عبدالوہاب شہید کردیا گیا۔ باپ کے ہاتھوں میں دم دینے والے عبدالوہاب کی ایک ماہ بعد شادی تھی۔ کیونکہ ہمارے یہاں شادیاں جلدی کردی جاتی تھیں اپنے سینے پر عبدالوہاب کا خون سجائے جب میرے شوہر گھر میں داخل ہوئے تو ان کا دماغی توازن بگڑ چکا تھا۔ ''عبدالوہاب کے، میرے بیٹے کے بچے یتیم ہوگئے۔'' بس یہی ایک جملہ وہ بولے جارہے تھے۔

پھر دکھ کی ایک نئی داستان رقم ہونے لگی کافی علاج کے بعد میرے شوہر ٹھیک ہوگئے لیکن بضد تھے لاہور چلو، ہمیں یہاں نہیں رہنا اور دونوں بھائیوں نے ان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے وہاں جو کچھ تھا بیچ دیا اور یوں ہم ایک بار پھر ایک اور ہجرت کے لئے تیار ہوگئے۔

اب سب کچھ اللہ کے کرم سے ٹھیک چل رہا ہے گھر کے ساتھ ہی ان لوگوں نے ایک کمرہ بنا کر اس میں چند لوگوں کے صبح شام

کھانے کا اہتمام بھی کردیا ہے۔ تینوں بھائی بڑی سلیقہ مندی سے اپنا کاروبار سنبھال چکے ہیں لیکن جانے کیوں ایک خاص روز ایک خاص گھڑی میں انہیں کیا ہوتا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے ہزاروں روپے بانٹنے والے میرے میاں صاحب کی کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلا دیتے ہیں سمجھ نہیں آتا کہ کیا یہ انکساری کی کوئی لہر ہے یا عاجزی کا پیمانہ ہے۔ صرف ایک نوٹ سو کا ہو یا پانچ سو کا ہو یا ہزار کا۔ بس وہ شاپ میں آکر وہ نوٹ آفس کی ٹیبل پر رکھ دیتے ہیں جو ہم شام کے لنگر میں شامل کر دیتے ہیں لیکن میں کیا ہم سب اس راز کو سمجھ ہی نہیں سکے۔" "تو سمجھنے کی ضرورت بھی کیا ہے" اس وقت وہی بے حد باوقار ہستی میرے سامنے تھی۔ وہ میرے قریب آگئے۔ "میری بہن آئی ہیں۔ چشم ماروشن دل ماشاد" ان کی خاطر مدارت کی ہے نا اتنے عرصے بعد تو یہ آئی ہیں۔"

وہ اپنی والدہ اور رفیقہ حیات کو یہ کہتے ہوئے چلے گئے۔ وہ تناؤ جو ماحول پر چھا رہا تھا ایک دم سے جیسے کم ہوگیا۔

"لو بھئی! اس نے تو تمہیں اپنی بہن کہہ دیا ہے۔" ان کی والدہ بولیں۔ اب تم کسی روز اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ آؤ تاکہ بچے اپنے ماموں اور نانی سے ملاقات تو کریں۔"

"جی انشاء اللہ! اب مجھے اجازت دیں۔ بچوں کے ہزاروں پیغام آچکے ہیں۔" میں نے اجازت طلب نظروں سے سب کی طرف دیکھا تو وہ میرے بھائی اپنی تمام تر عاجزی و انکساری کے ساتھ چلتے میری طرف آئے۔

"بہنیں بھائیوں کے گھر سے خالی ہاتھ تو نہیں جاتی نا۔" انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پانچ ہزار کا ایک نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

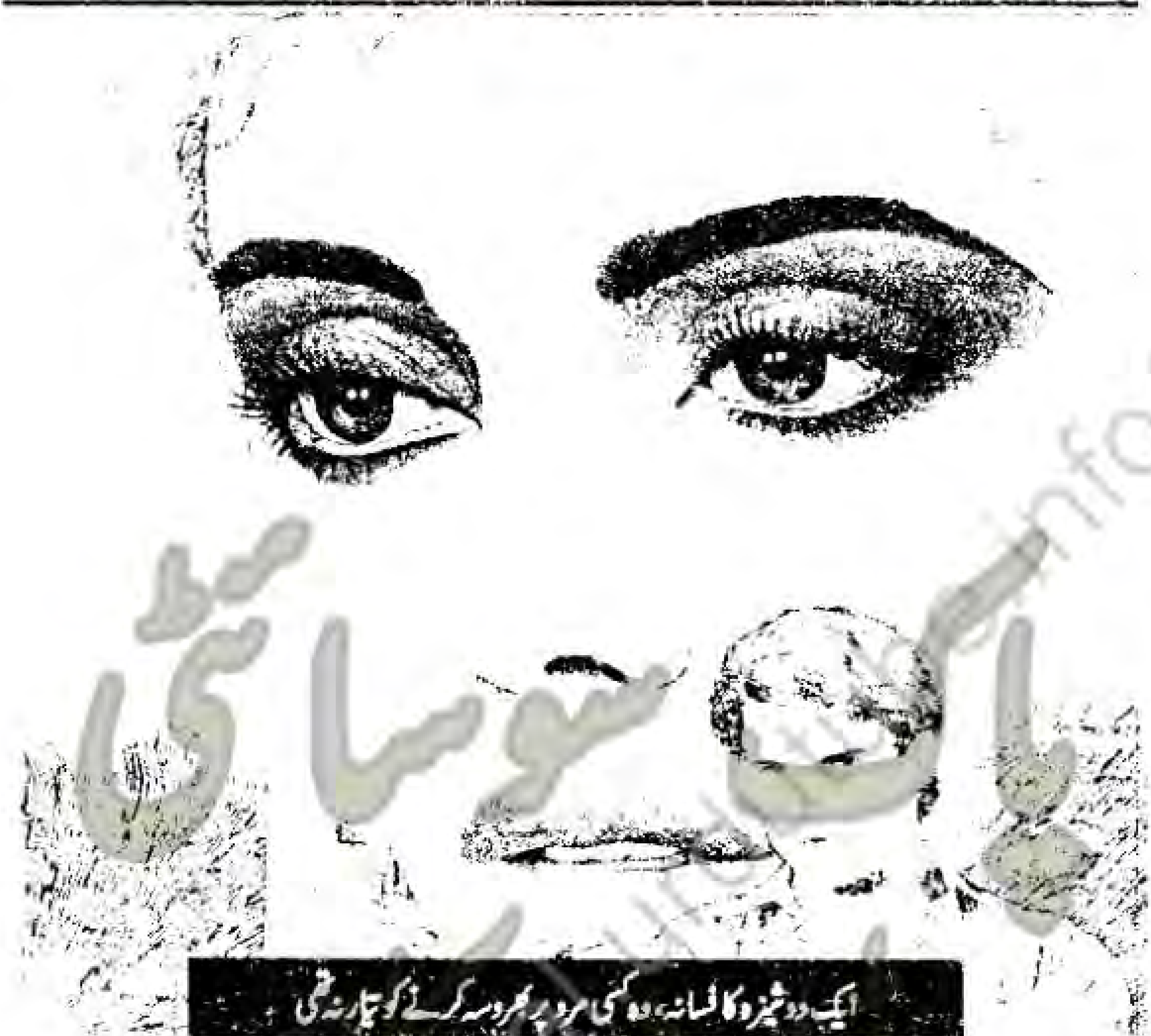
"اپنے بھائی کے سامنے انکار نہ کرنا۔ ورنہ یہ ٹوٹا ہوا اجڑا اجڑا سا دل بیٹھ جائے گا۔"

سمجھ نہ آنے والے کئی لمحے گزر گئے تو والدہ صاحبہ گویا ہوئیں۔ "لے لو میری بچی۔ جب اس نے تمہیں بہن کہا ہے تو بھائی کا مان نہ توڑو۔ لے لو۔ شاید یہ گداشاہ بن کر رب کے ان بھیدوں کو سمجھ سکے۔ جنہوں نے اسے کڑی سے جانے تیں پھنسی کبھی بنا دیا ہے۔ اس کی خفتیں وہ ہی جانے لیکن میرے اس بیٹے کے گرد رات کی تاریکیوں میں کوئی نور کوئی روشنی ہوتی رہے۔ یہ سوتا ہی کب ہے کبھی سجدے میں سر رکھے اور کبھی کرسی پر تسبیح پڑھتے۔"

میں نے حیران نگاہوں سے مڑ کے ان کی طرف دیکھا۔ "میں تو پہلی ملاقات میں ان کی گرویدہ ہوگئی تھی۔ یقیناً یہ خود طلب نہیں کرتے۔ کوئی جذب ہے وجہیں ہے جو طلب کی حاجت پیدا کر کے انہیں کسی میری جیسی گنہگار کو اپنے گناہ دھونے کا موقع دے دیتا ہے۔" آپی جان! وہ صوفیانہ کلام جس کا بھی ہے میرے اس بھائی کی ذات پر جچ رہا ہے۔

یار کو ہم نے جا بجا دیکھا
کہیں ظاہر کہیں چھپا دیکھا
کہیں وہ بادشاہ تخت نشیں
کہیں کاسہ لئے گدا دیکھا

اور ہم آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے خدا حافظ کہہ رہے تھے...... پھر کسی اچھی سی ملاقات کی گھڑیوں کا سوچتے ہوئے۔



ایک دوشیزہ کا فسانہ، وہ کسی مرد پر بھروسہ کرنے کو تیار نہ تھی

بے اعتباری



[illegible] رشتے کی بات چل رہی تھی۔ وہ اس کا ماموں زاد [illegible] مطلب ہے تمہارا [illegible] ہے۔

میرا بھائی اور پھر آج کل تم دونوں کے رشتے کے متعلق ہمارے بزرگ غور و خوض کر رہے ہیں۔" وہ شمعہ کچن میں جاتے ہوئے بولی۔ مگر اس کا دم گھٹنے لگا۔ انجانے سے خوف نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔ "اچھا لیکن ابھی تو برا لگے گا نا" اس نے بودا سا بہانہ بنا کر

فرخ کے ساتھ'' اس نے فرخ کھینچ کر بولا۔

فون بند کرنے کے بعد صنم نے اپنی وارڈ روب کھولی اور اس میں سے ہلکے رنگ کا نہایت سادہ سا سوٹ نکالا اور بے دلی سے تیار ہونے لگی۔ صنم نے بڑا سا بلیک اسکارف اپنے بالوں کے اردگرد لپیٹا اور پرس اٹھا کر کوریڈور میں آ گئی۔ فرخ کی گاڑی کے ہارن نے اس کی آمد کی خبر اس کے کمرے تک پہنچا دی تھی۔ فرس خالدہ بیگم کے ساتھ باتوں میں مشغول تھا اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ خالدہ بیگم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے گھورا کہ یہ کیا پہن رکھا ہے تم نے۔ مگر اس نے لاپروائی سے کندھے اچکا کر فرخ کے پیچھے قدم بڑھا دیئے۔ کار میں بیٹھتے ہی فرخ نے منہ بنا کر کہا، "ایسے لگ رہا ہے کسی اسلامک سنٹر میں درس لینے جا رہی ہو''۔ اس نے سر اٹھا کر فرخ کو دیکھا۔ صنم کی دو منگنیاں ٹوٹ چکی تھیں ایک جہیز کی ڈیمانڈ کی وجہ سے اور دوسری اس کی سادہ بے رنگ اور اچاٹ سی شخصیت کی وجہ سے۔ اس کا رنگ گندمی تھا نقوش تیکھے اور پرکشش تھے۔ بال بے پناہ سیاہ، گھنے اور لمبے تھے۔ لیکن وہ اپنے بالوں کو چھپا کر رکھتی تھی۔

"تم ایسا کرو یہ سیاہ اسکارف اُتار دو''۔ فرخ نے حکم دینے کے انداز میں کہا۔ اس نے بغور فرخ کا چہرہ دیکھا وہ نہایت سنجیدہ لگ رہا تھا۔

"اور اگر نہ اُتاروں تو کیا کار سے باہر نکال دو گے؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ کڑوا ہو گیا۔ لمحہ بھر کو فرخ چپ ہو گیا۔ پھر ایک پھیکی سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا اور فرخ نے لاؤڈ انگریزی میوزک آن کر دیا۔ اب وہ اسے نظرانداز کر کے ریش ڈرائیونگ کرنے لگا۔ اس کا دل ہر شے سے بے زار اور اچاٹ ہو گیا۔ فرخ ایک شوخ مزاج اور زندگی کی رنگینیوں سے لبریز لڑکا تھا۔ نجانے وہ درحقیقت کیسا تھا۔ صنم کو تو وہ چھچھورا اور بُری نیت کا ہی لگتا تھا۔ دو رشتے ٹوٹنے اور بچپن سے لے کر جوانی تک مردوں کی حریص و ہوس سے بھرپور نگاہوں اور دل چھلنی کرنے والے چھچھورے جملوں کا نشانہ بننے کی وجہ سے وہ مرد ذات سے متنفر ہو چکی تھی۔ اس کا اعتماد ختم ہو چکا تھا۔ آفس میں بھی جب کسی مرد کا سامنا کرنا پڑتا تو اندر ہی اندر خوف سے اس کا دل کانپنے لگ جاتا۔ وہ چھبیس برس کی ہو چکی تھی ایک بینک میں ملازمت کر رہی تھی۔ لیکن اعتماد اور یقین سے عاری تھی۔ فرخ نے شہر کے ایک مہنگے سے ریسٹورنٹ کے سامنے کار روکی تو وہ اپنی سوچوں سے چونکی۔ فرخ نے بے دلی سے کار کا دروازہ کھولا تو وہ باہر نکل آئی۔ آگے بڑھنے لگی تو فرخ نے پیچھے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ صنم کو کرنٹ سا لگا۔ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ "یہ کیا کر رہے ہو تم؟'' وہ گھبرا کر بولی۔ اب فرخ نے غصے سے منہ پھیر لیا۔ "کچھ نہیں کر رہا۔ چلو اب۔'' وہ اس سے چند قدم آگے نکل کر ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔ صنم کا دل چاہا کہ وہ وہیں سے پلٹ جائے مگر اچانک خیالوں اور سوچوں کے آئینے میں ماں کا عکس دیکھ کر اس نے خود کو ریسٹورنٹ میں داخل ہونے پر مجبور کر ہی لیا۔

وہ گہری سانس خارج کر کے فرخ کے سامنے والی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ "تم اتنی عام سی تو ہو لیکن نخرے ایسے دکھاتی ہو جیسے حور شمائل ہو''۔ کچھ دیر کے بعد بوجھل فضا میں فرخ کی طنزیہ آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ بغیر کوئی جواب دیئے پانی گھونٹ گھونٹ حلق میں اُتارنے لگی۔ پھر جب خاموشی بوجھل ہو گئی تو اس نے کہا "میں نے کب نخرے دکھائے ہیں آپ کو؟''۔ فرخ نے چھری کانٹے سے سلاد کھاتے ہوئے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ صنم کو دیکھا تو وہ شرمندہ سی ہوئی۔ "یہ اتنی دیر سے اور کیا کر رہی ہو۔ چلو میں مان لیتا ہوں نخرے نہیں ہیں تم میں''۔ اس کا انداز مذاق اُڑانے والا تھا۔ صنم اسے دیکھتی رہ گئی۔ کہنے کو بہت کچھ تھا مگر اس کی سوچوں کی ڈور ماں کے تصور سے بندھی ہوئی تھی۔ "یہ لو میرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دو''۔ فرخ نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے کیا وہ بے یقینی اور بے بسی سے اس کا ہاتھ دیکھتی رہ گئی۔

''اگر میں ایسا نہ کروں تو؟'' صنم نے بے خوف ہو کر فرخ کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا، اس کی آنکھیں ہنس رہی تھیں۔ ''صنم تمہیں سولہویں صدی میں پیدا ہونا

چاہیے تھا تم جیسی لڑکیاں آج کے دور میں نہیں جی سکتیں۔" صنم نے سر جھکا لیا۔ "اگر میں اپنا ہاتھ نہ دوں تو فرخ نے بلند و بانگ قہقہہ لگایا" تو...... تو پھر ساری زندگی اپنی ماں کے گھر بیٹھی رہ جاؤ گی تم سے شادی نہیں کروں گا میں"۔ وہ بلند آواز میں بولا نجانے اسے اس بات کا احساس بھی تھا کہ نہیں لوگ ان دونوں کو عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ آنسو پیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "چلو گھر چھوڑ دو...... مجھے" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز بوجھل ہوگئی۔ "چلو......" وہ ہنستا ہوا کھڑا ہوگیا۔ فرخ نے بل پے کرکے اس کے ہمراہ قدم بڑھا دیئے۔

عجیب سے احساس شکست اور کچھ کھونے کے جذبے نے اس کا حصار کرلیا تھا۔ فرخ ریش ڈرائیونگ کرکے اور لاؤڈ میوزک آن کرکے اسے چڑاتا رہا۔ وہ کار سے باہر دیکھ کر اپنے آنسوؤں کو باہر آنے سے روکتی رہی گھر کا راستہ بمشکل تمام ہوا۔ کانچ کے پل سے گزر کر اس نے اپنے لہولہان دل کی کرچیاں اپنی روح میں چبھتی محسوس کیں۔ لیکن مڑ کر اس بے مہر شخص کو نہ دیکھا کہ کہیں وہ اس کے چہرے پر لکھی شکست کی تحریر دیکھ کر مسکرانے نہ لگ جائے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ خالدہ بیگم نے اس کا چہرہ دیکھا تو چہرہ ایسے پھیر لیا جیسے ان کی اپنی کوئی غلطی ہو۔ اس کا چہرہ بڑی بھیانک کہانی سنا رہا تھا۔ صنم اپنے کمرے میں آکر بستر پر ڈھے گئی۔ پرانے زخم پھر سے تازہ ہوکر دہائی دے رہے تھے۔ اس کے منگیتر نے بھی تو فرخ کی طرح اس کا دل توڑا تھا۔ اس کے نازک جذبات کچلے تھے۔ چہرے بدلے ہوئے تھے مگر اندر سے وہی بھیڑیے نما انسان...... وہی جملے وہی نظریں وہی کردار نیا چہرہ پرانی کہانی۔

"صنم...... ساحر صاحب نے اکاؤنٹ کھلوانا ہے"۔ [illegible] تھی۔ اس کی کولیگ سیمہ نے اسے پکار کر کہا۔ اس نے لیجر سے نظریں اٹھا کر اپنے کاؤنٹر کے سامنے کھڑے شخص کو دیکھا تو حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔ رکشہ سے آفس آتے ہوئے اکثر وہ موٹر سائیکل لے کر اس کے رکشہ کے پیچھے آرہا ہوتا تھا۔ صنم کی چھٹی حس چلتے پھرتے متوجہ کرتی رہتی تھی کبھی کبھار اسے ایسا لگتا کہ کوئی اس کا پیچھا کررہا ہے۔ کبھی وہ بالکل رکشہ کے برابر بائیک لے کر آجاتا تھا۔ اس کا خون خشک ہونے لگا۔ اس نے سر جھکائے ہوئے تمام کام کیا۔ اکاؤنٹ کھول کر لیجر اس کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ "مس سائن کہاں کروں۔" اس نے مسکرا کر پوچھا "دیکھیں نشان لگایا ہوا ہے میں نے۔" وہ سخت اور چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ اس نے خاموشی سے سائن کرکے لیجر صنم کے سامنے رکھ دیا۔ اور کیشیئر کے کاؤنٹر کے سامنے جاکر ٹھہر گیا۔ اس کے جانے کے بعد صنم نے شکر کا کلمہ پڑھا۔ پھر اکثر وبیشتر وہ صنم کو بینک میں اکاؤنٹ کھلوانے اور روپے جمع کرانے کے لئے دکھائی دینے لگا۔ کبھی کبھار وہ اسے بینک کے ساتھ ملحق مین برانچ میں جاتا دکھائی دیتا۔ اسے دیکھ کر صنم کا حلق تک کڑوا ہوجاتا۔ اسے لگتا کہ وہ شخص مسلسل اس کا پیچھا کررہا ہے۔ اسے پھانسنے کی کوشش کررہا ہے۔ زندگی کے دیئے گئے کڑے تجربات نے صنم کے دل کا دروازہ ہر مثبت سوچ کے لئے بند کردیا تھا وہ شخص نجانے کیا تھا اچھا تھا یا برا۔ لیکن اسے دیکھ کر صنم کو فرخ یاد آجاتا تھا۔ وہی مسکراہٹ اور شوخ نگاہیں۔

وہ بینک سے نکل کر گیلری میں سے کینٹین جارہی تھی کہ اپنے سامنے سے آتے ہوئے اس شخص سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ صنم کے ماتھے پر ناگوار شکنوں کا جال بن گیا تھا۔ صنم کا ارادہ تو کینٹین کی طرف جانے کا تھا مگر اسے اپنے سامنے دیکھ کر اس کا موڈ غارت ہوگیا اور بھوک بھی مرگئی تھی۔ وہ خاموشی سے گزر گیا لیکن وہ وہیں رک کر اسے جاتا دیکھتی رہی۔ اس خیال سے کہ کہیں وہ صنم کے پیچھے نہ چل پڑے۔

اگلے دن وہ اسے پھر بینک میں نظر آگیا۔

اکاؤنٹ کھلوانے" وہ غصے سے کھولتی رہ گئی۔ اس نے صنم کو دیکھ کر دوستانہ اور اپنائیت سے بھرپور مسکراہٹ اچھالی تو صنم نے سیخ پا ہوکر سر جھکا لیا۔ دو دن کے بعد وہ کینٹین جانے کے لئے راہداری میں سے گزر رہی تھی تو اسے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ صنم نے خوفزدہ ہوکر پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کے پیچھے وہی تھا۔ صنم جان چکی تھی کہ اس کا نام سکندر ہے۔ "ہیلو مس" اس کے خوفزدہ چہرے کو دیکھ کر وہ مسکرا کر اپنائیت سے بھرپور لہجے میں بولا۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ "بات سنیں مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا"۔ اس کے لفظوں نے صنم کے قدم جکڑ لئے۔ وہ رک گئی اور مڑ کر چبھتی چبھتی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ "وہ میں، میں کہنا چاہتا تھا کہ......" اس کا انداز اور لہجہ اپنائیت سے چور تھا۔ آنکھوں میں محبت کی مشعل روشن تھی صنم کا سانس پھولنے لگا۔ غصہ، طیش اور ملال سب یکجا ہوگئے۔ "آپ مجھے اچھی لگتی ہیں"۔ صنم کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اب یہ مجھے بھی چلنے کو کہے گا پھر سے وہی کہانی دہرائی جائے گی، محبت کے نام پر منگنی کے نام پر اور شادی کے نام پر مجھے رسوائی سے نوازے گا۔ پھر تنہائی، اذیت بھری وحشت، محرومی اور طنزیہ باتیں ہونگی۔ وہ سوچ رہی تھی اور وہ کہہ رہا تھا "میں یہ کہنا چاہتا ہوں......" صنم [illegible] اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ "آپ کا دماغ خراب ہوگیا ہے مسٹر" وہ پھٹ پڑی۔ سکندر اسے بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ "دیکھیں وہ......" وہ ششدر ہوکر بولا۔ "کیا دیکھوں بہت دیکھ لیا ہے اور بھگت بھی لیا ہے آپ جیسے لفنگوں اور نوسربازوں کو، آپ کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ کافی دنوں سے میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ میرا پیچھا کررہے ہیں، کبھی بینک میں، کبھی راستے میں اور کبھی اس راہداری میں۔ میں آپ کا حشر کردوں گی منہ توڑ دوں گی [illegible]" میں چلا کر بولی۔

سکندر بھونچکا رہ گیا۔ اردگرد کوئی ذی روح نہیں تھا ورنہ سکندر کی اچھی خاصی درگت ہوجاتی۔ وہ نجانے کیا کچھ بغیر سوچے سمجھے بولتی گئی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد سکندر نے گہرا سانس لیا۔ "دیکھئے میں! آپ میری پوری بات تو سن لیتیں"۔ صنم نے چبھتی ہوئی نگاہوں سے سکندر کو دیکھا اس کا چہرہ متغیر ہوچکا تھا۔ "میں کہنا چاہتا تھا کہ آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔ بے حد قابل احترام اور مقدس لیکن آپ...... آپ نے تو نجانے کیا کچھ کہہ ڈالا ہے۔ مجھ پر کتنے گندے اور رکیک الزام لگائے ہیں۔ اس قدر زہر افشانی کی ہے کہ میں خود اپنی نظروں میں گر چکا ہوں۔ میں میں آپ کا پیچھا نہیں کررہا تھا یہاں کینٹین سے آگے جو چھوٹی سی فرم ہے میں اس فرم میں کام کرتا ہوں اور اسی فرم کے کام سے ہی میں بینک میں آتا تھا۔ آپ کو دیکھنے نہیں۔ آپ کو اس لئے روکا تھا کہ آپ سے کہنا چاہتا تھا میں آپ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ رشتہ بھیجنا چاہتا تھا لیکن یہ میری نا سمجھی اور بھول تھی۔ آپ کے اندر تو بے اعتباری اور شک کا زہر بہت زیادہ سرایت کرچکا ہے۔ آپ کو [illegible] کرنا چاہتے۔ اپنا [illegible] اللہ حافظ" دیکھتے دیکھتے [illegible] یکدم وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا اور صنم کے لئے اپنے قدموں پر ٹھہرنا دوبھر ہوگیا۔

اب جبکہ وہ اعتبار کرنا چاہتی تھی تو وہ اسے رد کرکے چلا گیا تھا۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی اس سے کہنا چاہتی تھی کہ بے اعتباری اور شک کا بیج بھی تم مردوں کے معاشرے نے بویا ہے۔ لیکن وہ...... وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔ صنم پر سکتہ سا طاری ہوگیا تھا۔ "میں آپ سے شادی کرنا چاہتا تھا" رشتہ بھیجنا چاہتا تھا" اس کے کہے ہوئے لفظ بازگشت بن کر صنم کے اردگرد گونج رہے تھے لیکن وہ سناٹے میں گم خود کو کھوج رہی تھی۔

عہدہ برآ

شرجیل

’’میں اس کی قوت ہوں اس کی توانائی ہوں۔‘‘ راجر نے بے خیالی میں اپنی بیوی کے الفاظ دہرائے۔ لیکن میں نے اسے کبھی کوئی خوشی نہیں دی۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔ یہ انصاف نہیں ہے۔ گلوریہ کہ میں اسے کوئی خوشی دیئے بغیر اس کی ساری دولت کا حق دار بن بیٹھوں۔ اس کے بدلے میں مجھے بھی تو کچھ دینا چاہیے۔‘‘

ایک امیر عورت کی کہانی، جسے زندگی کی تمام خوشیاں غریب ہو کر ملی تھیں



راجر ماہر نفسیات ڈاکٹر ملر کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ اس کی بیوی مارتھا کچھ عرصے سے ڈاکٹر ملر کے زیر علاج تھی۔ مارتھا نے چند روز قبل ڈاکٹر کی بتائی ہوئی مقدار سے زیادہ خواب آور گولیاں کھائی تھیں اور اس کی حالت نازک ہوگئی تھی۔ اب ڈاکٹر ملر نے ٹیلی فون کرکے راجر کو اپنے دفتر بلایا تھا تاکہ وہ اس معاملے سے متعلق گفتگو کر سکے۔ اس نے راجر سے کہا ’’مجھے احساس ہے کہ کسی شوہر کے لئے اپنی بیوی کے متعلق اس قسم کی بات سننا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن یقین کیجئے مسٹر راجر آپ کی بیوی نے زیادہ گولیاں غلطی سے نہیں کھائی تھیں یعنی وہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا۔ فرائڈ نے کہا ہے کہ حادثوں کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔‘‘

’’ڈاکٹر ملر!‘‘ راجر نے کہا۔ ’’میری بیوی نے قسم

کھا کے بتایا ہے کہ اس نے خواب آور گولیاں زیادہ تعداد میں محض غلطی سے کھائی تھیں اور اب آپ مجھے یہ بتانے کی کوشش کررہے ہیں کہ اس نے یہ حرکت دانستہ کی تھی آخر کیوں؟ اس کے پاس اس قدر دولت ہے کہ وہ اپنی ہر خواہش ہر وقت پوری کرسکتی ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں ایک مثالی شوہر ہوں لیکن اب اتنا بُرا بھی نہیں ہوں کہ وہ باقاعدہ خودکشی کی کوشش کرے"۔

میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ آپ کی بیوی نے ایسا دانستہ کیا تھا۔ ڈاکٹر طر نے کہا "یہ عمل دراصل ان کی لاشعوری خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ مانا کہ آپ کی بیوی اپنی ہر خواہش ہر وقت پوری کرسکتی ہیں مگر یہ بات اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ وہ اپنی زندگی سے خوش بھی ہیں۔ آپ نے غور فرمایا' میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟"

"مجھے اس کا احساس ہے ڈاکٹر مارتھا کوئی ہنس مکھ عورت نہیں ہے۔" راجر نے کہا۔ "مجھے پہلی ہی ملاقات میں اس کا اندازہ ہوگیا تھا پہلی ملاقات کے دو مہینے بعد ہی ہماری شادی ہوگئی تھی ان دو مہینوں میں مجھے پتہ چل گیا تھا کہ اس پر کبھی کبھی افسردگی کے دورے بھی پڑتے ہیں لیکن میں نے کبھی سنجیدگی سے اس پر توجہ نہیں دی تھی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ افسردگی کے دورے اتنے خطرناک بھی ہوسکتے ہیں"۔

اس کے دوستوں نے مارتھا سے شادی کرنے کے فیصلے پر اسے خوب طعنے دیئے تھے کہ وہ مارتھا سے صرف اس کی دولت کے لئے شادی کررہا ہے لیکن اس نے ان طعنوں کی پروا نہ کرتے ہوئے مارتھا سے شادی کرلی تھی۔

"ایک بار آپ کی بیوی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تین تین چار چار روز کے لئے خواب گاہ مقفل کرکے اس میں بند ہوجاتی ہے۔"

"درست ہے۔" راجر نے کہا۔ "وہ اب بھی ایسا کرتی ہے اور یہی اس کے دوروں کی علامت ہوتی ہے؟"

"لیکن وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟"

"پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے۔" راجر نے جواب دیا۔ "کس قسم کی پریشانیاں؟"

"کاروباری پریشانیاں۔ مارتھا کا مالی مشیر ہر وقت اس کے کان کھاتا رہتا ہے۔"

"میں آپ کو یہی بتانا چاہتا تھا کہ بے حساب دولت بھی کسی کے لئے خوشیاں نہیں خرید سکتی بلکہ دولت سے خوشی خریدی ہی نہیں جاسکتی۔ آپ کی بیوی کا سب سے بڑا مسئلہ ان کی دولت ہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟" راجر نے کئی بار پلکیں جھپکا کر ماہر نفسیات کو دیکھا۔ "آپ نہیں سمجھے مسٹر راجر؟" ڈاکٹر طر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کی بیوی نے جب ہوش سنبھالا تھا تو ان کے گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ ان کی ہر خواہش لمحوں میں پوری ہوجاتی تھی اس لئے انہیں عام بچوں کی طرح اپنی کوئی خواہش پوری ہونے پر خوشی نہیں ہوتی تھی۔ آپ یوں سمجھیں کہ ہمیں جب پیاس لگتی ہے تو ہم پانی پی لیتے ہیں اور ہماری پیاس بجھ جاتی ہے اس سے ہمیں مسرت کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن ذرا اس مسافر کا تصور کیجئے جو تپتے ہوئے صحرا میں سفر کررہا ہو اور پیاس کی شدت سے اُس کی زبان سوکھ کر کانٹا ہوگئی ہو ایسے میں پانی کے چند گھونٹ اسے ایسی مسرت بخشتے ہیں جیسے اسے غیر متوقع طور پر کوئی بہت بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ آپ کی بیوی کو چونکہ خوشی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ خوش نہیں رہتیں۔ وہ ان چیزوں سے بھی لطف اندوز نہیں ہوتی ہیں جن کے لئے پیسے خرچ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان میں خوش ہونے کا احساس زندہ کیا جائے۔ اسی طرح وہ خوش رہیں گی۔"

"میں سمجھ گیا۔" راجر نے دھیمے لہجے میں کہا۔
"لیکن کیا آپ کا خیال ہے وہ اپنی زندگی سے اتنی ناخوش ہے کہ خودکشی کرلے گی؟"
"ہاں بشرطیکہ اس ناخوشی کا سدباب نہ کیا جائے۔" ڈاکٹر ملر نے کہا "تین روز قبل جو حادثہ پیش آیا تھا وہ آئندہ بھی پیش آسکتا ہے اور مہلک ثابت ہوسکتا ہے۔"

راجر ڈاکٹر ملر کے دفتر سے باہر نکلا تو اس کے ذہن میں ایک ہی خیال گردش کررہا تھا کہ مارتھا زندگی سے اتنی ناخوش ہے کہ زندگی ہی کا خاتمہ کرسکتی ہے یہ خیال اس کے لئے اتنا سرور انگیز تھا کہ اگر سڑک پر راہگیر نہ ہوتے تو شاید وہ خوشی سے اچھلنا شروع کردیتا۔

راجر پر نظر پڑتے ہی گلوریا کو احساس ہوگیا کہ آج کوئی خاص بات ہوگئی ہے لیکن اس نے راجر سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ خود ہی اس کے سامنے سب کچھ اُگل دے گا۔ گلوریا قالین پر اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ راجر صوفے پر سیدھا بیٹھا ہوا اپنا چھوٹا سا بھورے رنگ کا سگار پی رہا تھا۔ اس نے رُک رُک کر گلوریا کو بتایا بدھ کی رات مارتھا نے ایک ساتھ پانچ خواب آور گولیاں کھالی تھیں حالانکہ اسے صرف دو گولیاں کھانی تھیں وہ کہتی ہے کہ اس نے غلطی سے ایسا کیا تھا اور وہ خواب آور گولیوں کو اسپرین کی گولیاں سمجھی تھی۔"

"اسپرین کی بھی ایک ساتھ پانچ گولیاں کون کھاتا ہے؟" گلوریا نے چہرہ اوپر کرتے ہوئے پوچھا۔
"یہی تو ڈاکٹر ملر بھی کہتا ہے۔" راجر نے بے اختیار کہا۔
"کون ڈاکٹر ملر؟"
"مارتھا کا معالج۔" راجر نے کہا۔ "اس کا کہنا ہے کہ اگر صورت حال یہی رہی تو ایک روز مارتھا خودکشی کرلے گی۔"

"مارتھا خودکشی کرلے گی؟ واہ کتنا عمدہ مذاق ہے۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔"
"گلوریا۔" راجر نے سنجیدگی سے کہا۔ "کیا میں ایسا مذاق کرسکتا ہوں؟ اور وہ بھی اس معاملے میں؟ ذرا سوچو کہ اس کا مطلب کیا ہوا؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب ہمیں مارتھا کو قتل کرنے کے لئے کسی منصوبے پر غور کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔"
"اوہ راجر!" گلوریا نے کراہتے ہوئے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ تم سے کتنی بار کہا ہے کہ یہ خوفناک لفظ نہیں سن سکتی اور تم اسے میرے ہی گھر میں دہرا رہے ہو؟ تمہیں معلوم نہیں دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"
"سنو، ہم پچھلے چھ ماہ سے مارتھا کو دنیا سے رخصت کرنے کے مختلف منصوبوں پر غور کررہے ہیں اب اس سلسلے میں ہمیں سر نہیں کھپانا پڑے گا۔ ڈاکٹر ملر کا کہنا ہے کہ وہ خودکشی کرلے گی۔"
"بیچاری مارتھا!" گلوریا نے تاسف سے کہا۔
"ہاں بیچاری۔" راجر نے کہا۔ "حالات میری توقعات سے کہیں زیادہ خراب ہیں۔ مارتھا کے اندر بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں وہ اپنی دولت سے نفرت کرنے لگی ہے۔ سنا تم نے؟ کتنا بڑا مذاق ہے، مارتھا اس دولت سے نفرت کرنے لگی ہے جس سے میں اتنی محبت کرتا ہوں۔"
"کوئی دیوانہ ہی دولت سے نفرت کرسکتا ہے۔" گلوریا نے کہا۔ ممکن ہے، مارتھا اس ڈاکٹر سے اپنے پاگل پن کا علاج کروارہی ہو؟"
"وہ پاگل نہیں ہے بلکہ اپنی زندگی سے ناخوش ہے۔" راجر نے سگار کا کش لیتے ہوئے کہا۔ "وہ بھی خوش نہیں رہی۔ دولت چونکہ اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی اس لئے وہ دولت سے کوئی خوشی

نہیں خرید سکتی۔ جبکہ میں اسی دولت سے دنیا کی ہر خوشی خرید سکتا ہوں۔''

''اور میں بھی۔'' گلوریا نے برجستہ کہا۔

''اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کب خودکشی کرے گی۔'' راجر نے کہا ''ممکن ہے آئندہ ہفتے کرلے یا آئندہ سال کرے یا تین سال بعد یا......''

''بس راجر! بس کرو میں اتنا انتظار نہیں کرسکتی آنے والا کوئی دن میری خوبصورتی میں اضافہ نہیں کرسکتا تم دیکھنا صرف ایک سال بعد میرے معاوضے میں کمی ہونے لگے گی۔''

گلوریا شہر کی مشہور ماڈل ایجنسی میں ایک انتہائی مہنگی ماڈل تھی۔ اس کا ایک گھنٹے کا معاوضہ کئی سو ڈالر سے کم نہیں ہوتا تھا۔ اس کی آمدنی راجر کے جیب خرچ سے کہیں زیادہ تھی۔ کیونکہ مارتھا کا مالی مشیر اسے حسب خواہش جیب خرچ دینے کیخلاف تھا۔ ان حالات میں بسااوقات راجر کو گلوریا کا قریب ترین دوست ہونے پر خود بھی تعجب ہوتا تھا۔ گلوریا سے اس کی ملاقات اسی ماڈلنگ ایجنسی میں ہوئی تھی جب خود اس نے بھی وہاں ملازمت اختیار کی تھی۔ پھر جب اس نے اچانک مارتھا سے شادی کرلی تھی تو گلوریا گلا پھاڑ کر خوب چیخی چلائی تھی یہاں تک کہ اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ وہ اتنی غمزدہ تھی کہ دوسرے روز ایک ملبوساتی کمپنی کی اشتہاری فلم میں بھی کام نہیں کرسکی تھی۔ راجر نے گلوریا کو ایک بے حد قیمتی کنگن کا تحفہ دے کر منایا تھا کنگن کی قیمت اس کی بیوی کے مالی مشیر نے ادا کی تھی اور وہ آج تک اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ راجر نے وہ کنگن اپنی بیوی کے لئے خریدا تھا۔

''ڈاکٹر طر وقت کے بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہہ سکتا۔''

راجر نے کہا۔ ''اس کا کہنا بس یہ ہے کہ اگر صورت حال میں کوئی خوشگوار تبدیلی نہ ہوئی تو ممکن ہے مارتھا ایک روز خودکشی کرلے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ خودکشی کا انحصار اس کی ناخوشی پر ہے' تم اپنی بیوی کو بڑی آسانی سے مزید ناخوش کرسکتے ہو راجر۔''

''واہ واہ کتنا عمدہ مشورہ ہے بھئی اس طرح تو مارتھا کی دولت ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ ہے۔ کیا وہ انتقاماً مجھے اپنی دولت سے محروم نہیں کردے گی؟ کیا وہ مرنے سے پہلے اپنی وصیت تبدیل نہیں کردے گی؟ گلوریا! میں اس وقت ایک بے حد نازک دھاگے پر چل رہا ہوں یہ دھاگا ذرا سی غلطی سے ٹوٹ سکتا ہے تم میری بیوی کے مالی مشیر کو نہیں جانتیں وہ موقع کی تاک میں کینچی لئے ہر وقت میرے آگے پیچھے پھرتا رہتا ہے میں اسے کوئی موقع دینا نہیں چاہتا اس کے علاوہ میں بیچاری مارتھا کو بھی کوئی تکلیف نہیں دے سکتا تمہیں نہیں معلوم کہ جب میں اسے دیکھتا ہوں تو مجھے اس پر کتنا ترس آتا ہے وہ بیچاری کتنی دولت مند ہے پھر بھی ایک معمولی سی خوشی کے لئے ترستی ہے۔''

''راجر تمہاری انہی باتوں نے مجھے تمہارا دیوانہ بنا دیا ہے۔'' گلوریا نے اپنے رخسار اس کے گھٹنوں پر رکھ دیئے۔ تم بہت رحم دل ہو۔''

''ہمارے مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ میں کسی طرح مارتھا کو اتنی تعداد میں خواب آور گولیاں کھلا دوں کہ وہ اس فانی دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوجائے۔ ڈاکٹر طر پولیس کو یہ حلفیہ بیان دے گا کہ مارتھا کی ذہنی کیفیت ایسی تھی کہ اس کے خودکشی کرنے کے امکانات بہت روشن تھے اس کا یہ بیان پولیس کو مطمئن کردے گا''۔

راجر اپنی بیوی کی خواب گاہ میں داخل ہوا وہ آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ ''مارتھا!'' راجر نے قریب پہنچ کر سرگوشی کی۔

''میں جاگ رہی ہوں۔'' مارتھا نے آنکھیں کھول

دیں چند لمحوں تک وہ اپنے شوہر کی آنکھوں میں جھانکتی رہی' میں تمہاری واپسی کا انتظار کر رہی تھی ڈاکٹر ملر نے میرے بارے میں تم سے کیا باتیں کیں راجر؟''

''ڈاکٹر ملر؟ میری تو اس سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔''

''ٹیلی فون کے پاس پیغامات نوٹ کرنے کے لئے جو نوٹ بک رکھی ہے' اس میں تمہاری تحریر میں ڈاکٹر ملر کے دفتر کا پتہ لکھا ہوا ہے۔ ظاہر ہے اس نے تمہیں ٹیلی فون کر کے اپنے دفتر آنے کی ہدایت کی ہوگی۔''

''تمہارے بارے میں تو اس نے کچھ نہیں کہا۔'' راجر نے مسکراتے ہوئے کہا۔'' وہ مجھ پر بگڑ رہا تھا کہ میں آخر کیسا شوہر ہوں جو دوا کھاتے وقت اپنی بیوی کی نگرانی نہیں کرتا؟''

''اس کی یہ مجال؟ کیا اس نے تمہیں برا بھلا کہنے کی جرأت کی؟'' لیکن مارتھا' اس نے غلط تو نہیں کہا۔'' راجر نے مسکراتے ہوئے کہا میں واقعی بہت نالائق شوہر ہوں ذرا دیکھو تو میرے گھر آنے کا کیا وقت ہے؟ اگر میں اس رات دس بجے سے پہلے گھر آ جاتا تو تم سے وہ غلطی سرزد نہ ہوتی۔''

''مجھے معلوم ہے تم دفتر میں بہت دیر تک کام کرتے ہو۔ کام کی زیادتی تمہیں جلدی گھر آنے سے روکے رہتی ہے۔ مارتھا نے بڑی معصومیت سے کہا اسے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا اس نے یہ فرض کر لیا تھا کہ اس کا شوہر رات گئے تک دفتر میں کام کرتا رہتا ہے۔ اس نے یہ اندازہ اپنے مرحوم باپ کی عادتوں کے پیش نظر لگایا تھا اس کا باپ بے حد مجبوری کے عالم میں گھر آیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنی موت سے قبل سات کروڑ ڈالر کی جائیداد بنائی تھی جس کی وہ تنہا وارث تھی اور اب اس کا انتظام اس کے شوہر کے ہاتھ میں تھا۔ دفتر والے بھی راجر سے بہت خوش تھے۔ ایک بے پروا باس کبھی کے لئے رحمت ہوتا ہے۔

''مجھے بہلاؤ نہیں راجر! میں حقیقت جاننا چاہتی ہوں۔'' مارتھا نے کہا۔'' اس نے میرے بارے میں تمہیں کیا بتایا ہے؟''

''کچھ نہیں' وہ بس یہ کہہ رہا تھا کہ ایک اتنی عمدہ عورت کو بھی اس امر کا موقع نہیں ملا کہ وہ خود کو بچائے یہ بہت بڑا ظلم ہے۔''

''میرے اندر ضرور کوئی گڑ بڑ ہے راجر' سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مجھے خوشی کا احساس کیوں نہیں ہوتا؟ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں اندر سے بالکل کھوکھلی ہوں' راجر مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟''

''ڈارلنگ تم خوانخواہ پریشان ہو رہی ہو۔'' راجر نے کہا' ''بس اب آنکھیں بند کر لو اور جلدی سے سونے کی کوشش کرو صبح تمہیں اپنے مالی مشیر سے بھی ملاقات کرنی ہے۔ اس کے لئے تمہیں زیادہ سے زیادہ توانائی کی ضرورت ہوگی۔''

''میری قوت میری توانائی تو تم ہو راجر!'' مارتھا نے ہاتھ بلند کر کے اس کا چہرہ ہتھیلیوں میں تھام لیا۔ راجر کا دل بھر آیا وہ منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ آنسو پینے کے بعد جب اس نے مڑ کر دیکھا تو مارتھا آنکھیں بند کئے پرسکون انداز میں لیٹی ہوئی تھی۔

دوسرے روز دفتر پہنچ کر راجر نے فیصلہ کن انداز میں ٹیلی فون اٹھایا اور اپنی محبوبہ گلوریا کا نمبر ملانے لگا۔

''گلوریا! مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں میں وہ باتیں فون پر نہیں کر سکتا تم گھر کب تک رہو گی؟''

''دن بھر۔''

''تو پھر میں آ رہا ہوں۔''

اطلاعی گھنٹی کی آواز سن کر گلوریا نے دروازہ کھولا اور مسکراتی ہوئی نظروں سے راجر کی پذیرائی کے لئے بڑھی۔ راجر کے چہرے پر سنجیدگی دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ راجر اندر داخل ہو کر قالین پر ٹہلنے لگا وہ کسی

گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ گلوریا کوچ پر بیٹھ گئی اور متوقع نظروں سے دیکھتی رہی۔

”میں یہ کام نہیں کرسکتا گلوریا۔“ راجر ٹہلتے ٹہلتے اچانک رُک گیا۔

”کون سا کام؟“

”دیکھو ناراض نہ ہونا۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں یہ کام کروں گا نہیں میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے یہ معاملہ فی الحال التواء میں ڈال دیا ہے اس وقت مارتھا کو راستے سے ہٹانا اس کے ساتھ بڑا ظلم ہوگا۔“

”بڑا ظلم ہوگا؟“ گلوریا نے حیرت سے اس کے الفاظ دہرائے' لیکن تم نے تو خود کہا تھا کہ یہ موقع بے حد مناسب ہے کیونکہ ڈاکٹر...... کیا نام ہے اس کا......؟ وہ اس امر کی شہادت دے گا کہ مارتھا نے ایک بار پہلے بھی خودکشی کی کوشش کی تھی اور اس میں خودکشی کا میلان بہت پایا جاتا تھا“۔ راجر نے اثبات میں سر ہلایا۔ گلوریا نے کہا ”تو پھر اب انتظار کس بات کا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ آج کل وہ اپنی زندگی سے بے حد ناخوش ہے۔ یہی موقع اس کی خودکشی کے لئے مناسب ترین ہوگا۔“

”اور یہی وجہ ہے کہ میں نے فی الحال یہ معاملہ التواء میں ڈال دیا ہے۔ آج کل وہ بہت اُداس اور مغموم رہتی ہے۔ اس بیماری کی وجہ سے پوری زندگی میں ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جو مسرتوں سے بھرپور ہو۔ شادی کے روز بھی وہ صرف ایک بار میرے ایک لطیفے پر مسکرائی تھی۔ اس کے بعد میں نے آج تک اسے مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔“

”وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ تمہیں حاصل کرکے تو اسے بہت خوشی ہوئی ہوگی۔“

”میں اس کی قوت ہوں اس کی توانائی ہوں۔“ راجر نے بے خیالی میں اپنی بیوی کے الفاظ دہرائے۔ لیکن میں نے اسے کبھی کوئی خوشی نہیں دی۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔ یہ انصاف نہیں ہے۔ گلوریا کہ میں اسے کوئی خوشی دیئے بغیر اس کی ساری دولت کا حق دار بن بیٹھوں۔ اس کے بدلے میں مجھے بھی تو کچھ دینا چاہئے۔“

”اوہ پھر! تم بہت عجیب انسان ہو۔“ گلوریا نے اسے ستائش کی نظر سے دیکھا۔

”میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسے راستے سے ہٹانے سے پہلے مجھے اسے بہت ساری مسرتیں دینی چاہئیں، اس طرح میں صحیح معنوں میں اس کی دولت کا حق دار بنوں گا۔“

گلوریا چپ چاپ اسے دیکھتی رہی وہ کہہ رہا تھا مجھے معلوم نہیں کہ میں اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوسکوں گا ہوسکتا ہے بالکل ناکام ہوجاؤں اگر ڈاکٹر ملر کا تجربہ درست تسلیم کرلیا جائے تو اس سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ دولت کی فراوانی نے مارتھا سے خوشی کی حس چھین لی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایسی چیزوں سے بھی لطف اندوز نہیں ہوسکتی جو مفت حاصل ہوتی ہیں جیسے مغرب میں سورج غروب ہونے کا منظر یا تاروں بھرا آسمان یا آسمان پر چھائے ہوئے بادل۔“

”اوہ راجر! تم کس قدر شاعرانہ سوچ رکھتے ہو۔“

”...... یا سمندری ساحل پر ریت سے ہم آغوش ہونے والی لہریں یا بہت دیر تک پیدل چلنے کے بعد ہری ہری ٹھنڈی گھاس پر لیٹ جانا۔“

”ہاں ہاں' مجھے معلوم ہے۔“ گلوریا نے جلدی سے کہا ”میں سمجھ گئی کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو میں خود ان چیزوں سے عشق کرتی ہوں لیکن اگر اس کے ساتھ دولت بھی ہو تو کیا کہنے۔“

”نہیں۔“ اس نے کہا ”ان چیزوں سے دولت کے بغیر ہی لطف اٹھایا جاسکتا ہے ان کی قیمت ادا

کئے بغیر ان کا ٹکٹ لئے بغیر ان کا کرایہ ادا کئے بغیر۔ تم سمجھیں‘ میرا کیا مطلب ہے؟‘‘

’’آخر تم کرنا کیا چاہتے ہو؟‘‘

’’میں مارتھا کو لے کر ایک طویل سفر پر جانا چاہتا ہوں ایک بہت ہی خاص قسم کے سفر پر پیسوں کے بغیر ہم کسی ہوٹل میں قیام نہیں کریں گے۔ ہم سفر کے لئے طیارے بھی استعمال نہیں کریں گے‘ اگر ہم نے ریل میں سفر کیا تو تیسرے درجے میں کریں گے‘ ورنہ پیدل ہی آگے بڑھتے رہیں گے۔ پھر میں دیکھوں گا کہ وہ غریبانہ زندگی میں بھی خوشی محسوس کرتی ہے یا نہیں؟ غریبوں کو کل کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ صرف زندہ رہنے ہی میں خوش رہتے ہیں۔ میں اور مارتھا بالکل تنہا ہوں گے۔ ایک مرد اور ایک عورت کی طرح جو ازل سے ایک دوسرے کی قربت کے خواہش مند رہتے ہیں مجھے معلوم ہے گلوریا تم مجھے پاگل سمجھ رہی ہوگی لیکن میں یہ تجربہ ضرور کروں گا۔ ممکن ہے اس طرح اسے مرنے سے پہلے کچھ خوشی نصیب ہوجائے۔‘‘

مارتھا کو پہلے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ ’’پیسوں کے بغیر ایک طویل سفر؟ آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟‘‘

راجر زور سے ہنسا۔ ’’مجھے تم سے اسی رد عمل کی توقع تھی ڈارلنگ! لیکن میں نے جو کچھ کہا ہے اس کے ایک ایک لفظ کے بارے میں سنجیدہ ہوں میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہماری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہوگی۔ ہم اپنے ساتھ چار پانچ سو ڈالر لے کر چلیں گے لیکن کسی ہوٹل میں قیام نہیں کریں گے کسی طیارے میں سفر نہیں کریں گے‘ کوئی گاڑی کرائے پر حاصل نہیں کریں گے۔ ہماری کل پونجی بس وہی چار پانچ سو ڈالر ہوں گے۔ انہی میں ہمیں تین مہینے تک گزر کرنی ہوگی۔ ظاہر ہے چار پانچ سو ڈالر میں دو مہینے تک صرف اس طریقے سے گزارا کیا جاسکتا ہے کہ ہم ایک ایک سینٹ خوب سوچ سمجھ کر خرچ کریں اور زیادہ سے زیادہ بچت کریں۔‘‘

’’راجر! کیا تم واقعی سنجیدہ ہو؟ تم تو ہمیشہ اعلیٰ ترین ہوٹلوں میں ٹھہرنے اور ہر چیز بہترین طریقے سے کرنے کے عادی رہے ہو؟‘‘

’’مگر ایسے مہنگے سفروں سے تم نے کتنا لطف حاصل کیا؟ میں کہتا ہوں حقیقت پسند بنو مارتھا۔‘‘

’’ہم جائیں گے کہاں آخر؟‘‘

’’ہر جگہ اور کہیں بھی نہیں۔ ہماری کوئی منزل نہیں ہوگی ہم خانہ بدوشوں کی طرح سڑکوں پر زندگی گزاریں گے جہاں بھی کوئی سڑک پسند آئے گی ہم اس پر چل پڑیں گے جہاں بھی کوئی پہاڑ اچھا لگے گا اس پر چڑھنے لگیں گے جہاں بھی کوئی چشمہ ہمیں پکارے گا ہم اس کے استقبال کے لئے آگے بڑھ جائیں گے۔‘‘

’’اپنی گاڑی میں؟‘‘

’’نہیں ہم سائیکلوں پر سفر کرسکتے ہیں؟ اپنے پیروں پر سفر کرسکتے ہیں اور ضرورت پڑی تو اپنے انگوٹھوں پر بھی سفر کرسکتے ہیں۔ ہم کون ہوں گے؟ کوئی بھی نہیں ہماری کوئی منزل نہیں ہوگی۔ ہم خانہ بدوش ہوں گے آوارہ گرد ہوں گے فقیر ہوں گے اگر قسمت نے ہمارا ساتھ دیا تو ہم گرفتار ہوکر جیل پہنچنے میں بھی کامیاب ہوجائیں گے۔‘‘

’’جی نہیں۔ شکریہ۔‘‘

’’اور ہمارا کھانا کیا ہوگا کہ کسی درخت سے بیر توڑ لئے‘ کسی کھیت سے گنے کاٹ لئے‘ کسی ریڑھی والے سے آڑو خرید لئے‘ کسی گھٹیا ہوٹل سے سینڈوچ لے لئے‘ ہم گھٹیا سے گھٹیا ہوٹلوں میں ٹھہریں گے اور معلوم ہے ہم وہاں کے رجسٹروں میں اپنا نام کیا لکھوائیں گے؟ مسٹر اور مسز اسمتھ تاکہ منتظمین کو یہ

شک کرنے کا موقع ملے کہ میں تمہیں تمہارے گھر سے بھگا کے لے جارہا ہوں اور ہم قانونی طور پر شادی شدہ نہیں ہیں۔''

شادی کے بعد راجر نے دوسری بار مارتھا کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔

''راجر! میرا خیال ہے کہ تم کچھ کچھ پاگل ہوگئے ہو۔''

''کچھ کچھ نہیں میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ہم دونوں مکمل طور پر پاگل ہوجائیں میں صاف اور تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتا ہوں گرم لو کے تھپیڑوں اور یخ بستہ ہواؤں کے کوڑے اپنے جسم پر محسوس کرنا چاہتا ہوں میں سمندر کے گدلے نمکین پانی میں تیرنا چاہتا ہوں اور گھٹیا شرابیں پینا چاہتا ہوں میں تمہیں ایسی چیزوں کا تجربہ کرانا چاہتا ہوں جن کے بارے میں تم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔''

''تم واقعی سنجیدہ نظر آرہے ہو راجر!''

''میں چاہتا ہوں کہ ہم کل ہی اس سفر پر روانہ ہوجائیں۔نہیں' آج ہی' اس وقت ہم کسی کو اپنے اس سفر کی اطلاع نہیں دیں گے کسی کو بھی نہیں۔ تمہارے مالی مشیر کو بھی نہیں۔'' راجر کا چہرہ جوش سے تمتمانے لگا ۔''مارتھا! گھر میں جتنی بھی رقم موجود ہو وہ فوراً اکٹھی کرلو۔ چیک بک یا کریڈٹ کارڈ ہرگز ساتھ نہ لینا۔ کوئی سوٹ کیس لینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔'' مارتھا کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ راجر نے کہا ''اچھا ایسا کرو کہ ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس لے لو بہت چھوٹا سا جس میں صرف بے حد ضروری سامان رکھا جاسکے۔''

''راجر! میں نے اس سے زیادہ احمقانہ بات آج تک نہیں سنی اس طرح تو ہم ایک ہفتے بھی زندہ نہیں رہ سکیں گے۔''

''اگر ایسا وقت پڑا تو ہم کسی مال بردار جہاز میں سوار ہوکر یورپ چلے جائیں گے اور راستے بھر جہاز میں کام کرکے اپنا کرایہ اور کھانے پینے کا خرچ ادا کرتے رہیں گے ہوسکتا ہے اس طرح ہم پوری دنیا کی سیاحت کرلیں۔''

''راجر! آج سے پہلے میں نے کبھی تمہیں ایسا نہیں دیکھا تھا۔'' ''اور میں نے آج تک تمہیں اتنا خوش نہیں دیکھا تھا مارتھا؟'' راجر نے آگے بڑھ کر اسے بانہوں میں جکڑ لیا۔ ''میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں مارتھا! بس تم ہاں کردو۔''

''تو کیا.... ہم مالی مشیر کو بھی اس سفر کی اطلاع نہ دیں۔''

''اطلاع دینے کی کیا ضرورت ہے؟'' راجر نے اپنی بیوی کو نیم رضا مند دیکھ کر کہا۔ ''ہم جب بھی کسی نئی جگہ پہنچیں گے تو وہاں سے اسے ایک پوسٹ کارڈ روانہ کردیں گے۔ کہ ہمارا وقت بہت اچھا گزر رہا ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ تم ہمارے ساتھ نہیں ہو۔''

''اس رات مارتھا دوسری بار مسکرائی۔''

دو مہینے بعد گلوریا کو راجر کا پہلا خط موصول ہوا وہ تو اس کی طرف سے بالکل مایوس ہوگئی تھی۔ اس مایوسی نے اس کے چہرے کی شگفتگی پر بھی اثر ڈالا تھا۔ اس کا ایک گھنٹے کا معاوضہ سو ڈالر سے کم ہوکے اسی ڈالر رہ گیا تھا۔ اس نے راجر کی تحریر پہچانتے ہی اتنی عجلت میں لفافہ کھولا کہ خط بھی ایک کونے سے پھٹ گیا۔ خط خاصا طویل تھا۔ راجر نے لکھا تھا۔

''میری جان گلوریا! سب سے پہلے تو میں تم سے خط نہ لکھنے کی معافی چاہوں گا۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ میرے لئے تمہیں خط لکھنا کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ میں اور مارتھا ابھی ابھی بگ سرے سے واپس آئے ہیں وہاں ہمارا قیام مشہور کمیون سنٹر میں تھا۔ اس کمیون سنٹر کی خاص بات یہ ہے کہ وہاں پہنچ کر مردوں' عورتوں' لڑکیوں اور لڑکوں کے درمیان تمیز کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سال وہاں کے

لڑکوں نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ داڑھی رکھنا فیشن سے ختم ہوگیا ہے جبکہ لمبے لمبے بال بھی فیشن میں موجود ہیں لڑکیوں نے فی الحال سر منڈوانے کا فیصلہ نہیں کیا ہے۔ اس لئے چند مخصوص نشانیاں غور سے دیکھنے کے بعد ہی کسی کی جنس کے بارے میں کوئی حتمی رائے دی جاسکتی ہے۔ تمہیں یہ جان کر شاید حیرت ہو کہ میں آج کل ایک بہت عمدہ اور شاندار بھوری داڑھی کا مالک ہوں۔ مارتھا بھی بالکل بدل گئی ہے اگر تم اب اچانک سے دیکھ لو تو پہچاننے سے قطعی قاصر ہوگی۔ گھر سے روانہ ہونے کے بعد اس نے ایک ہفتے تک تو میک اپ کیا وہ اپنے ساتھ میک اپ کی آدھے درجن بوتلیں اور ڈبیا لائی تھی لیکن جلد ہی ایک ایک کر کے ان سے نجات حاصل ہوگئی۔ لیکن چہرے کی تمام شکنیں غائب ہوگئی ہیں اس کے علاوہ اس کا وزن بھی پانچ سیر کم ہوگیا ہے وہ دبلی ہو کر اور زیادہ پرکشش ہوگئی ہے۔ اب وہ اپنے لباس کی بالکل پروا نہیں کرتی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کا حسن اب لباس کی موزونیت کا محتاج نہیں رہا۔ اس نے ہر قسم کی فیشن ایبل جگہوں کا خیال اپنے ذہن سے نکال دیا ہے۔ واپس آکر اب وہ کسی ایسی تقریب میں شرکت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی جس میں جدید فیشن کے تقاضوں کا خیال رکھنا لازمی ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب تک مارتھا اچھی زندگی کے لئے جو چیزیں جزو لاینفک تصور کرتی تھی ان سے اب اسے ذرا بھی دلچسپی نہیں رہی سب سے اہم بات یہ ہے کہ میرا تجربہ صد فیصد کامیاب رہا۔ مارتھا اب خوش ہے وہ واقعی بہت خوش رہتی ہے۔

”گلوریا! یقین کرو وہ اپنی زندگی میں کبھی اتنی خوش نہیں رہی اس نے پوری زندگی میں اتنی آسودگی حاصل نہیں کی تھی جتنی ان دو مہینوں میں اسے ملی ہے ہم نے جس رات اچانک اپنا سفر شروع کیا تھا اس وقت ہمارے پاس کل چار سو بارہ ڈالر تھے جن میں ہمیں دو مہینے گزارنے تھے میں تمہیں یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ دو مہینے ہم نے کس طرح گزارے؟ کیا تم یقین کر سکتی ہو کہ ہم نے کھانے میں صرف بکرے کا گوشت کھایا۔ اس کے سوا کوئی ڈش موجود نہیں تھی ہم نے مسلسل دو راتیں کھلے آسمان کے نیچے کھیتوں میں گزاریں تیسرے درجے میں تین کھلنڈرے لڑکوں کے ساتھ ریل کا سفر کیا وہ ساری رات ہارمونیم بجاتے رہے ہم نے ایک بار سیب کے باغات میں سیب توڑنے کی ملازمت کی اور اس دوران میں ہم نے اتنے سیب کھائے کہ شاید اب زندگی بھر سیب کھانے کو دل نہ چاہے۔ ہم نے موسیقاروں کی ایک ٹولی سے دوستی کر لی۔ وہ ہمیں اپنی بس میں چار ٹول وائل سے نارتھ کیرولینا تک مفت لے گئے۔ گلوریا! میں تمہیں تمام باتیں تو نہیں لکھ سکتا لیکن مستقبل ایک موقع ایسا دینے والا ہے کہ میں تفصیل سے تمہیں اس سفر کی ایک ایک بات بتاؤں گا۔ بس تم اس وقت کا انتظار کرو وہ وقت بہت قریب آرہا ہے میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے وہی کیا جو میرے نزدیک صحیح تھا اور جسے کرنا میرا فرض تھا۔ اب میرا کام ختم ہوگیا ہے اور میں مارتھا کے ساتھ واپس آرہا ہوں وہ بالکل بدل گئی ہے اور بہت ہنس مکھ ہوگئی ہے۔ لیکن میں تمہیں اپنے بارے میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں بالکل نہیں بدلا۔ میرے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تم میرا اشارہ سمجھ گئی ہوگی اس لئے واپس آنے کے بعد اگر میں چند روز یا ہفتے بھر تم سے رابطہ قائم نہ کروں تو بدگمان نہ ہونا تمہیں بہت جلد اس کی وجہ بھی معلوم ہوجائے گی۔ اچھا فی الحال میں تم سے رخصت ہوتا ہوں ہاں یہ خط پڑھ کر فوراً جلا دینا۔ فقط تمہارا راجر۔

گلوریا نے خط پڑھ کر اسے تلف کر دیا۔

مارتھا کو خودکشی کئے ہوئے ایک ہفتہ ہوگیا۔ گلوریا نے اخباروں میں اس کی خبر پڑھ لی تھی۔ اخباری

اطلاعات کے مطابق خودکشی زیادہ تعداد میں خواب آور گولیاں کھا کر کی گئی تھی۔ ایک ہفتہ گزر چکا تھا مگر راجر نے اس سے رابطہ قائم نہیں کیا تھا وہ اس سے گفتگو کرنے کے لئے بے قرار تھی۔ جب مزید صبر کرنا اس کی برداشت سے باہر ہوگیا تو اس نے راجر کی ہدایات سے بے پروا ہو کے اسے ٹیلی فون کر ہی دیا۔ ایک ملازمہ نے جواب دیا کہ وہ اس وقت بے حد مصروف ہیں اس لئے انہیں ٹیلی فون پر نہیں بلایا جاسکتا۔

اسی رات راجر نے اسے فون کر کے بتایا کہ جس وقت اس کا ٹیلی فون آیا تھا وہ اپنی مرحوم بیوی کے مالی مشیر سے اہم معاملات پر گفت و شنید کر رہا تھا۔ راجر کی آواز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ پریشان ہے گلوریا اس کی پریشانی کا سبب اچھی طرح سمجھ رہی تھی ظاہر ہے جو شخص قتل ہو اس کا ضمیر اسے پریشان ضرور کرتا ہے۔

دوسرے روز راجر نے گلوریا کو پھر ٹیلی فون کیا اور اسے بتایا کہ وہ اس کے پاس آرہا ہے گلوریا اس کی آواز سے اس کے موڈ کا اندازہ نہیں لگاسکی اس کا لب و لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔

''تمہارا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔'' گلوریا نے راجر کو دیکھتے ہی کہا۔ وہ چند لمحوں تک غور سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی ''تم خود بھی عجیب نظر آرہے ہو۔''

''ہاں' اس کی وجہ میری داڑھی ہے۔'' راجر نے جواب دیا۔ ''میرے چہرے پر داڑھی تھی جسے میں نے یہاں آکر صاف کردیا تھا دو مہینے میں دھوپ کی تمازت سے میرا رنگ تانبے جیسا ہوگیا لیکن داڑھی میں پوشیدہ حصہ پہلے کی طرح سفید ہے۔ اسی لئے میں تمہیں عجیب سا نظر آرہا ہوں۔'' راجر تھکے تھکے انداز میں کوچ پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنی عمر سے دس سال بڑا نظر آرہا تھا۔ وہ خاموشی سے قالین پر بنا ہوا ایک بیل بوٹا دیکھ رہا تھا۔

''راجر! کہیں تم چرس وغیرہ تو نہیں پینے لگے۔'' گلوریا نے اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔'' راجر نے جواب دیا۔ اس کی نظریں اب بھی قالین پر جمی ہوئی تھیں۔

''پھر کیا بات ہے؟''

''میں نے وہی کیا جو کہا تھا۔'' راجر نے خواب ناک لہجے میں کہا۔

''میں نے مارتھا کو اس کی موت سے پہلے بے شمار خوشیاں دیں۔ مسرتوں سے اس کی جھولی بھر دی۔ پھر میں نے اسے خواب آور گولیاں کھلا دیں اور وہ انہیں کھا کر ہمیشہ کے لئے سوگئی گلوریا! میں قسم کھاتا ہوں کہ وہ موت کے بعد بھی مسکرا رہی تھی۔''

''کیا تمہیں مارتھا کی موت نے بہت متاثر کیا ہے راجر؟''

''نہیں۔'' راجر نے جواب دیا۔ وہ غور سے اپنے ہاتھ دیکھنے لگا پھر اس نے گلوریا کی طرف دیکھا۔

''میں مارتھا کے وکیل سے مل کر سیدھا آرہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''مجھے آج ہی معلوم ہوا ہے کہ مارتھا نے سفر سے واپس آتے ہی اپنی وصیت تبدیل کردی تھی۔''

''کیا کردیا تھا؟'' گلوریا کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

''اس نے اپنی وصیت تبدیل کردی تھی۔'' راجر نے دہرایا۔ ''اب اس کی تمام دولت غریبوں' یتیم خانوں' ہسپتالوں اور دوسرے خیراتی اداروں میں تقسیم کردی جائے گی۔ مارتھا کو اپنی دولت سے نفرت ہوگئی تھی۔ وہ غریب ہونا چاہتی تھی کیونکہ غربت ہی نے اسے مسرتیں بخشی تھیں۔



جاوید احمد صدیقی

کیسی قسمت

اب تو دونوں بیٹے بھی بہوؤں سمیت مجبور کرتے کہ یہ یاد رکھو بیوہ ہو اور بس۔ وہ نیاز کے گھر تمام دن کام میں لگی رہتی تھی مگر بہو صاحبہ نے کبھی بھی تسلی نہ دی اور نہ ہی کام سے منع کرتی تھی۔ اس کے بھی بچے ہوئے تھے اور بیٹا تو اس کی سنتا ہی نہ تھا۔ نادر کی جب سے شادی ہوئی اور بچے ہونے شروع ہوئے اس نے بھی کبھی دل کو تسلی دینے والے الفاظ نہ کہے۔

ایک عورت کی کہانی، جس کی زندگی میں بس دُکھ ہی لکھے تھے

کئی سال بیت گئے، اب اول تو ایسے واقعات بہت کم ظہور پذیر ہوتے ہیں اور اگر ہوتے بھی ہیں تو لوگ کونسا سنجیدہ لیتے ہیں۔

وہ ماں باپ کی بڑی سے چھوٹی بیٹی تھی' سب کی لاڈلی بھی تھی۔ ماموں اور پھوپھی کی تو خاص طور پر چہیتی تھی!! ان کا خاندان کپور تھلہ کا زمیندار خاندان تھا مگر تقسیم ہند کے بعد پہلے سرگودھا کے نواحی گاؤں پھر گوجرانوالہ کے قریب لاہور جاتے ہوئے چند کلومیٹر پر واقع ایمن آباد آ کر بس گیا۔ والد صاحب دن رات محنت کرنے والے انسان تھے، زمینوں کا سینہ چیر کر سونا اگلوانا بھی ان جیسے ساڑھے چھ فٹ کے پرانی وضع کے انسان ہی کا کام تھا۔ لیکن کھیل تفریح میں حصہ لینے سے نہیں روکتے تھے۔ وہ (چاروں) بہنیں اور ایک بھائی حویلی میں خوب

دھما چوکڑی مچایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی بھائی کے ساتھ وہ سب گوجرانوالہ سینما بھی دیکھنے چلے جایا کرتے تھے۔ اور دن اسی طرح کام کاج ' ہنسی مذاق اور تھوڑا بہت کھیل کود میں گزر رہے تھے کہ بڑی بہن کا رشتہ لاہور طے ہوگیا۔ بڑے ہوتے گئے اور جوانی میں قدم رکھا۔ اُن دنوں انھیں دنیا ایسے معلوم ہوتی جیسے ایک گلستان ہے اور ہر طرف بہار ہی بہار ہے۔ آنے والی زندگی سے انجان ہم زندگی کے یہ سنہری دن گزار رہے تھے۔

اور پھر یکدم معلوم ہوا اُس کا رشتہ خالہ کے لڑکے سے کردیا گیا ہے جو لاہور میں ہی ریلوے میں فورمین تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد وہ رخصت ہوکر لاہور ان کے آبائی مکان میں آ گئی۔ فورمین کی والدہ اور بہنیں تو جیسے اس کے ساتھ ازل کی زیادتیوں کے بدلے لینے کے لیے دانت تیز کیے بیٹھی تھیں۔ عمر میں بھی سب اس سے بڑے تھے مگر گھر کی تربیت اور باہر کے ماحول نے ان کی نفسیات بگاڑ کر رکھ دی تھی۔ اس نے تو سنا تھا کہ شادی ہوگی تو خوشیاں ملیں گی۔ کچھ ناز نخرے بھی اُٹھائے جائیں گے، مگر قسمت اس پر ہنس رہی تھی کہ بچی تو اب پیار کے دو بول بھی نہیں سن سکے گی۔ خیال تھا کہ شادی کے بعد کچھ آرام ملے گا۔ یہ روز کے ہانڈی چولہے کا جھگڑا تو ختم ہوگا لیکن اس کے سسرال کا تو باوا آدم ہی نرالا تھا۔ ریلوے میں ہونے کے باوجود صرف ایک ملازم تھا جو باہر کا کام کرتا تھا۔ اندر کوئی ملازم نہ تھا۔ ہر وقت کام کی پکار رہتی۔ سارا دن چولہے کے آگے منہ جھونکنا پڑتا۔ نہ نہانے کی فکر نہ بال بنانے کا ہوش !! اس وقت تو سارے ارمان ہی ختم ہوگئے جب شوہر نامدار نے گھر والوں کے ساتھ مل کر اذیت دینے کے تمام ریکارڈ توڑ دینے کی ٹھان لی۔ اسے سگریٹ سے داغا جاتا، جسم کے نازک حصوں پر جلتا سگریٹ لگا کر اذیت دی جاتی یا پھر رات پچھلے پہر بھرپور سردی میں باریک جوڑے میں ننگے پیر باہر صحن میں کھڑا رکھا جاتا۔ دن بھر میں بھی کوئی رعایت نہ تھی۔ شوہر صاحب تو صبح سویرے ہی اپنے دفتر چلے جاتے، پھر وہ ان کے گھر والوں کے رحم و کرم پر ہوتی۔

ان تمام باتوں نے اس کی تمام خوشیاں ختم کردیں۔ والد صاحب سے چھپ چھپ کر جاسوسی ناول پڑھنے کی یاد آتی تو دل پر سانپ سا لوٹ جاتا۔ شوہر صاحب کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ وہ تھے ان کے سگریٹ اور اخبار، یا پھر رات گئے چند یار دوست آجاتے اور مجلس درویشاں قائم رہتی ہے۔ نہ سسرال میں اپنائیت نہ شوہر صاحب سے کوئی پیار، اس کے نصیب میں بس دھتکار ہی تھی۔ آخر کار اللہ نے بڑے کٹھن اور بے انتہا اذیت وسختی کے دن گزار کر اسے بیٹا دیا۔ اب بھی سسرال والوں نے کوئی زائد کام والا یا کام والی گھر میں گھسنے نہیں دی۔ ان کی ماں نے اس کی کوئی مدد کی' نہ بہنوں نے دن کے کسی لمحے اس کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کی۔ اس کے چالیس دن ایسے ہی گزرے جس طرح پہلے تمام دن سختی' زیادتی' طعنوں کی بھرمار اور باورچی خانے کی سیوا کرتے گزرتے تھے۔

اب شوہر نامدار کی نصیحتوں اور ہدایات کی بھرمار ہوگئی تھی۔ وہ اپنا اذیت دینے والا رویہ بیٹے کی پیدائش کے بعد بھی تبدیل نہ کرسکے۔ اُلٹے بیٹے کے منہ پر ہاتھ رکھ کر سانس بند کرنے کی دھمکی دے کر اسے اذیت دیتے تھے۔ ماں اپنی اولاد کی خاطر تو جان دے دیتی ہے مگر یہ کیا کہ اسے باپ بلیک میل کرنے کا بہانہ ہی بنالے۔ اکثر ان چیزوں کو سوچتے سوچتے اس کے آنسو بہنے لگتے۔

وہ شریف ماں باپ کی بیٹی تھی، شرافت کا یہی

تقاضا تھا کہ گھل گھل کر ختم ہوجائے مگر حرف شکایت زبان پر نہ لائے!!

کئی برس گزرنے کے بعد اللہ نے دوسرا بھی بیٹا دیا۔ بڑے کا نام نادر رکھا گیا تھا، اس کا نام نیاز رکھا گیا۔ نام باپ نے رکھے تھے۔ کچھ دیر کے لیے خیال آیا کہ دوسرے بیٹے کی پیدائش پر سب کا رویہ بدل جائے گا۔ مگر یہ اس کی خام خیالی تھی۔ اب تو اس کا جینا اور بھی حرام کردیا گیا۔ ایک بہن ابھی باقی تھی وہ اپنی تینوں بہنوں پر بھاری تھی۔ ساس صاحبہ تو جیسے احساس سے عاری اور جذبات سے خالی مورتی بنی بیٹھی رہتی تھیں۔ شوہر صاحب کا ظلم وستم بھی بڑھتا چلا گیا۔ چند مواقع پر اس کے گھر والے بھی آئے، انھوں نے صورتحال کو بہت حد تک بھانپ لیا تھا۔ پھر اس نے بھی چند خفیہ خط لکھ بھیجے تھے۔ اب شوہر کی زیادتی اور جسمانی اذیت دینا بہت بڑھ گیا تھا۔ ان کی بہن اور ماں نے تو کوئی کسر ہی نہ چھوڑی۔ یہ بھی نہ سوچا کہ دو دو بیٹوں کی ماں کی کچھ تو قدر کریں ابھی چھوٹے ہیں مگر اللہ نے جیسے ان کے دلوں پر تو تالے لگا رکھے تھے کہ احساس نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ آخر کار بڑی تگ و دو اور بحث مباحثے کے بعد اس کے گھر والے اسے واپس اپنے پاس لے آئے۔ وہ ان دنوں ماں بننے والی تھی، اس کا شوہر اور سسرال والے جانتے تھے مگر کسی نے اسے روکنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

لیجئے انسان بھی کتنا بے وقوف ہے، بڑی بڑی توقعات کے خوابوں میں رہنا شروع کردیتا ہے۔ اسے بھی یقین تھا کہ میکے میں سکون ہوگا کچھ پذیرائی ملے گی۔ اب یہاں اس کی ایک بھابی تھی اور والدین۔ بہرحال سر جھکا کر صبح سے شام تک کام میں جتی رہتی مگر افسوس والد صاحب نے بھی سادہ ہی سا رویہ رکھا ہوا تھا اس کے نتیجہ میں ماں کتنا کرلیتی اور بھائی تو بالکل ہی بیگم کا غلام تھا۔ اسی دوران اللہ نے اسے ایک بیٹی بھی عطا کردی تھی۔ بچوں کے ساتھ صبر وشکر کرتے اس نے کئی سال گزار دیئے۔ اکثر بیاہ شادی کے موقع پر دانستہ اسے شامل نہ کیا جاتا۔ اب اس کا نادر دسویں میں آگیا تھا اور نیاز ساتویں میں تھا۔ اس کا سسرال، جو کہ خالہ کا گھر تھا، شوہر سمیت کبھی بھی کسی نے پلٹ کر خیر خبر نہ لی۔ پھر معلوم ہوا کہ شوہر صاحب بھی آہستہ آہستہ سخت بیماری کے ہتھے چڑھ گئے اور جلد ہی اس جہان سے رخصت ہوگئے۔ لیجئے اب بیوگی کا بھی طوق گلے میں آگیا۔ اب کوئی ڈھنگ کا کپڑا نہیں پہن سکتی تھی سر کو گوندھتی تو تب سارا گھر ناراض سا لگنے لگتا تھا۔

نادر کو اس کے ماموں نے الیکٹریکل ڈپلومہ کروانے کیلئے داخل کروا دیا اور جب تک اس نے ڈگری لی اس وقت تک نیاز بھی فرسٹ ایئر میں آچکا تھا۔ بیٹی کو بھی تھوڑی بہت تعلیم دلوا رہی تھی۔ آخر کار نادر کو گورنمنٹ کے ایک بڑے ادارے میں سب انجینئر کی نوکری مل گئی مگر اسے راولپنڈی جانا تھا۔ آخر رخصت کردیا کہ بچے کے مستقبل کا سوال تھا۔ ادھر نیاز نے بی اے کیا اور کہنے لگا کہ ایم کرونگا۔ پنڈی میں اپنی خالہ کے گھر تین چار دن گزارے۔ خالو پورے زون کے انچارج بن کر پشاور چلے گئے اور پھر چند سال کے اندر اندر اس کی شادی بھی کردی۔ جس میں والد صاحب نے تمام خرچہ اٹھایا۔ یہ اس کی بہن کی لڑکی تھی، بی اے کیا تھا مگر دنیا جہان سے زیادہ چالاک اور خرانٹ لڑکی تھی!!

اب زمانے نے کروٹ لی پہلے والدہ ان سب سے بچھڑ گئیں اور دو سال کے بعد والد صاحب بھی داغ مفارقت دے گئے۔ اسی حویلی کے ایک کونے میں اس نے تین چار کمروں کا گھر لے لیا تھا۔ وہ کچھ عرصہ وہاں اور بعد میں کچھ عرصہ لاہور جاکر

رہی۔ بھائی کو کیا فکر تھی۔ اس نے چھوٹے بیٹے نیاز کی شادی کردی اور اس علیحدہ مکان میں بیٹی کو لے کر شفٹ ہوگئی۔

وہ بیٹی کا خیال حد درجہ رکھتی تھی مگر اس کے دونوں بیٹے انتہائی ظالمانہ اور اذیت ناک سلوک کرتے تھے۔ اسے ہمیشہ کہتے کہ آپ ہمارے ساتھ ٹھیک سلوک نہیں کرتیں اور بہن کو بے حد پیار کرتی ہیں۔

اب جوانی خواب کی طرح محو ہوچکی تھی۔ احساسات کی دنیا میں انقلاب آچکا تھا۔ سماج کیخلاف کبھی کبھی دبی آہ نکل جاتی تھی لیکن صابر و شاکر ہونا ہی پڑتا ہے۔ ''قسمت ہی ایسی تھی'' کا فقرہ عارضی طور پر تسلی بخش ضرور ہوتا تھا۔ لیکن اس سے اندر کے زخم نہیں بھر پاتے تھے۔ دنیا اور اب تو دونوں بیٹے بھی بہوؤں سمیت مجبور کرتے کہ یہ یاد رکھو بیوہ ہو اور بس۔ ان پر 'بوجھ' ہو۔ وہ نیاز کے گھر تمام دن کام میں لگی رہتی تھی اور بیٹی بھی مگر بہو صاحبہ نے کبھی بھی تسلی نہ دی اور نہ ہی کام سے منع کرتی تھی۔ اس کے بھی بچے ہوئے تھے اور بیٹا تو اس کی سنتا ہی نہ تھا۔ نادر کی جب سے شادی ہوئی اور بچے ہونے شروع ہوئے اس نے بھی کبھی دل کو تسلی دینے والے الفاظ نہ کہے۔ الٹا یہی کہتا کہ ماں یہاں گاؤں میں پنڈی سے آنا ایک بڑی ہی تکلیف دہ بات ہے بیوی بچوں کو تو لاہور ہی چھوڑتا ہوں اور میں ادھر تم سے ملنے آجاتا ہوں۔

چند ایک مرتبہ بیٹی کے ساتھ نادر کے پاس راولپنڈی رہنے کے لئے گئی تو دل چاہتا کہ چند روز رہ جائے مگر اسے تو اپنے کپڑے بھی خود دھونے پڑتے اور بہو صاحبہ نے کبھی جھوٹے منہ بھی ہمدردی نہ کی اور شوہر کے کان بھرتی رہتی تھی۔ خدا خدا کرکے بیٹی کی شادی ہوگئی اور وہ لاہور جا بسی۔ دونوں بیٹوں کا کوئی پیسہ نہیں لگا کیونکہ والد صاحب ہمارے بھائی کو پہلے ہی اس بیٹی کی شادی کا تمام خرچہ دے کر جا چکے تھے۔

نادر آتا اور جلی کٹی سنا کر چلا جاتا۔ نیاز کی بیوی ہر روز اسے اسی طرح طعنے دیکر خوب کام کرواتی جیسے کوئی سخت گیر ساس اپنی بہو سے کرواتی ہے۔ ادھر بڑا بیٹا نادر جب بھی ان کے پاس آتا غصہ میں ہوتا۔ بے تحاشا موڈ خراب ہوتا۔ بولتا ایسے جیسے کسی نچ ذات کے نوکر سے بات کررہا ہو۔ ماں کا درجہ تو کیا دیتا وہ تو سب گھر والی کے بتائے ہوئے ہتھکنڈے آزماتا۔ پنڈی والی بہو تو عید بقرعید پر آنا گوارا نہ کرتی۔ کبھی سال دو سال میں آتی تو تب بھی چند گھنٹے ٹھہر کے لاہور چلی جاتی۔ وہ اس کے پاس راولپنڈی جاتی تو بہو باقاعدہ کپڑے دھلاتی اور وہ اپنے کپڑے خود دھو کر سکھاتی اور استری کرتی تھی۔ کھانا بہو ایسے دیتی تھی جیسے جانور کے سامنے رکھا جاتا تھا۔ پھر تنقید اس کی برائیاں بیٹی کی باتیں اور پھر اسے کوسنے بھی دیئے جاتے کہ آپ اپنے شوہر کا ظلم سہہ لیتیں تو آج یہ در در پھرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ سارا قصور اسی کا بتایا جاتا۔ کبھی پرورش اور پڑھائی کا کہہ دیتی تو بڑے نخرے سے کہا جاتا اور یہ تو آپ کا فرض تھا۔ فرض صرف ماں پر ہی ہوتا ہے اولاد کے اوپر ماں کا کوئی حق نہیں؟ کوئی فرض نہیں۔ دونوں بیٹوں کا رویہ ہمیشہ تحقیرانہ اور ظالمانہ ہوا کرتا۔

اب بھی وہ گھر میں عبادت کرتی رہتی تھی اور روکھی سوکھی کھا کر نیاز کی بیوی جو دے دیتی کھالیتی۔ دل تاریکی میں ڈوب جاتا۔ بستر پر پڑے کروٹیں بدلتے یا ماں باپ کو یاد کرتے کرتے رات گزار دیتی۔ ماضی کا تصور تو چنداں پرلطف نہ تھا بلکہ شادی کے دن سے آج تک کئی دہائیوں پر مبنی یہ زندگی بھی تو محض ڈراؤنے، اذیت ناک اور خوفناک خواب کی طرح تھی۔ دمہ اور ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ ہوچکی تھی

مگر ان سے بھی بڑا مرض یہ ہے کہ دونوں بیٹے لاتعلق ہو چکے ہیں۔

اتفاق سے بیٹی کا لاہور سے پنڈی جانے کا پروگرام بنا۔ داماد کو چھٹی نہ ملی تو بیٹی یہاں اس کے پاس آ گئی اور وہ دونوں ماں بیٹی راولپنڈی پہنچ گئے۔ سوچا تھا بیٹا کافی عرصے بعد ماں اور بہن کو دیکھ کر خوش ہوگا مگر دونوں میاں بیوی کا موڈ انتہائی خراب ہوگیا۔ کہنے لگے بتا کر آنا تھا۔ چند روز قبل ہی بتا دیا ہوتا۔ وہ تو اتنی شرمندہ ہوئی کہ دل چاہا اسی وقت اس کے گھر سے نکل جائے۔ بیٹی کو بھی سخت بُرا لگا۔ اس نے بھائی اور اس کی بیوی سے کہا، آپ دونوں کو ماں کا ذرا بھی خیال نہیں۔ یہاں آتی ہیں تو تمام کام کروایا جاتا ہے، اور جان مارنے والی ماں کے بدن کا ایک جوڑا دھونا آپ کے لئے ایک عذاب ہے اور پھر ایک سال سے آپ لوگ ماں کو ملنے بھی نہیں آئے۔ بیٹا بولا کہ اس ماں کے پاس کون جائے جس کو سوائے اپنی بہوؤں کی برائی کے اور کوئی کام ہی نہیں۔ اس کی لگائی بجھائی تو میرے سسرال میں مشہور ہے۔ یہ سُن کر ماں کا وہ حال تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ بلڈ پریشر کا دورہ پڑ گیا۔ جلدی سے کمرے میں لے جا کر بیٹی نے ادویات دیں۔ رات بھی دیر تک دونوں میاں بیوی لعن طعن ہی کرتے رہے۔ رات سونے کے لئے کمرہ میں' وہ اور بیٹی آئے۔ وہاں ان کا میوزک سسٹم اور دوسرے ڈیک وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔

وہ دونوں ماں بیٹی رات دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اب اپنا اپنا دکھڑا ایک دوسرے کو سناتے رہے کچھ ادھر کی کچھ ادھر کی باتیں کیں۔ اس کی بیٹی بھی بھائیوں کے رویہ سے ہمیشہ تنگ رہی۔ اس کو بڑے بھائیوں والا رویہ اور پیار بھی نہ ملا تھا۔ رات نہ جانے کب تک باتیں کرتے کرتے وہ نیند کی آغوش میں جا پہنچیں۔

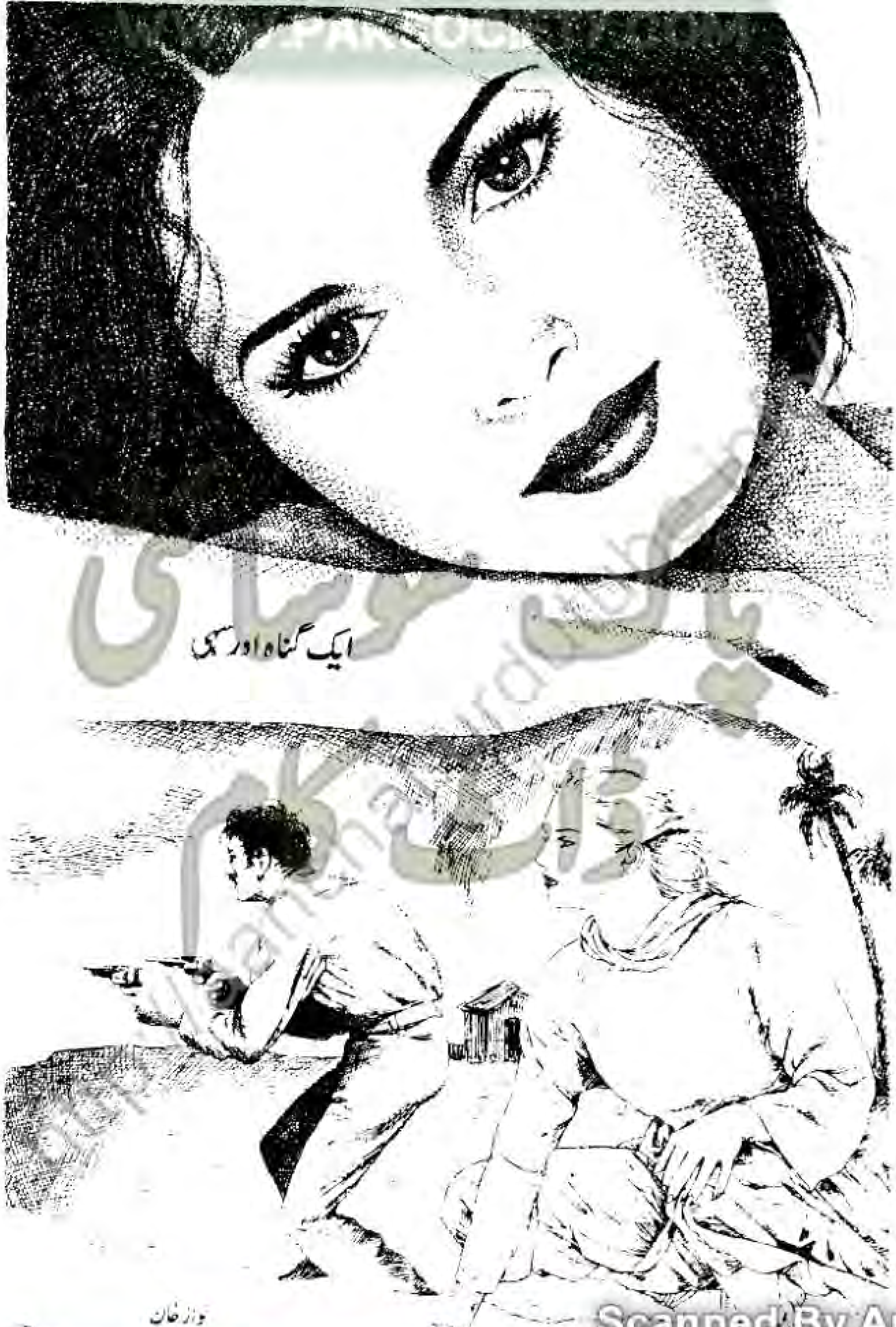
صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ ان کا ''یوم حساب'' ہے۔ ناشتہ کے چند منٹ بعد ہی دونوں میاں بیوی ایک ٹیپ ریکارڈر پکڑے دہیں ٹیبل پر ہی لے آئے اور نادر طنزیہ کہنے لگا، اچھا تو تم دونوں ماں بیٹی اس طرح ہم دونوں اور نیاز اور اس کی بیوی کی برائیاں کرتے ہو۔ لو آج وہ تمام باتیں میں نے ریکارڈ کر لی ہیں۔ اور یہ ہے تمہاری ''گندی چغلی'' والی باتیں!!

دونوں میاں بیوی نے ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی وہ ٹیپ زبردستی سنائی اور اتنی بے عزتی ساتھ ساتھ کرتے گئے کہ کسی بھی دو ٹکے کے غلام کی اتنی بے عزتی نہ ہوئی ہوگی۔ ماں نے نہ معلوم کیسے اپنے آپ کو سنبھالا۔ فوراً گھر کے باہر آ کر بیٹی کے ساتھ ٹیکسی لے کر بس اڈے پر پہنچی اور وہاں سے گاؤں پہنچ گئیں۔

رات بھر وہ سوچتی رہی کہ اے اللہ میری اس طرح کی اذیتوں' ذہنی پریشانیوں' ان مٹ دکھوں سے بھری زندگی کیوں بنائی؟ نہ شوہر کے گھر آرام' نہ ماں باپ کے گھر کوئی چین اور اب بیٹے تو میرے فرعون سے بڑھ کر نکلے ہیں۔ ماں کی اتنی بے عزتی اتنی بے حرمتی تو سوتیلے نہیں کرتے۔ انہوں نے تو ظلم کی انتہا کر دی ہے۔ اس دنیا میں میرا کون ہے کس کو دکھ سناؤں، اللہ کریم تو ہی میری سن لے۔

رات کے تیسرے پہر ہلکی سی آنکھ لگی مگر دل کے دکھ اور بے تحاشا تیز چلنے کی وجہ سے منہ سے آواز بھی نہ نکلی اور بے بسی' یاسیت اور مظلومیت کی تصویر بنی وہ خالق حقیقی کے پاس جا چکی تھی۔

اور یوں ایک غم کی داستان اپنے بیٹوں کے ہاتھوں تمام ہوئی۔ یہ عورت اور اس کے دکھ ہم سب سے بھی نہ دیکھے جاتے تھے نہ معلوم اس عورت کے بیٹے بمعہ بیویوں کے کیسے بخشے جائیں گے؟


ایک گناہ اور سہی
نواز خان

ایک گناہ اور سہی

نواز خان

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ عورت اس قدر سنگدل بھی ہو سکتی ہے
کہ شوہر کا دل جیتنے کے لئے اپنا آپ کسی کے حوالے کر کے قتل کرا دے۔

پولیس کی نوکری میں ایک تھانیدار کو ایسے ایسے واقعات سے واسطہ پڑتا ہے کہ انسانی فطرت کے ایک نہیں ہزاروں روپ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ آج جس واردات کی کہانی آپ کو سنانے لگا ہوں اس میں بھی انسانی فطرت کے ایک ایسے پہلو سے واسطہ پڑا جو کسی انسان میں نہ ہو تو انسان نہیں رہتا حیوان بن جاتا ہے۔ چودھویں رات کے گلاب والا کیس ختم کر کے فارغ ہوئے چند دن ہی گزرے تھے۔ اس قدر پیچیدہ کیس سلجھانے کے بعد یہ چند دن بہت ہی بھلے لگ رہے تھے۔ صبح آرام سے اُٹھ کر ناشتہ کرنے کے بعد بغیر وردی پہنے میں تھانے میں اپنے دفتر کے برآمدے میں کرسی بچھائے بیٹھا تھا۔ بلال شاہ بھی اپنی چوٹوں کو سہلانے اور گھریلو مسائل حل کرنے میں مصروف تھا۔ دن میں کسی وقت تھانے کا چکر لگا کر میری خیریت دریافت کر جاتا۔ اصل میں وہ آج کل ایک تبدیل ہو کر آنے والے سپاہی کرشن کنہیا کے چکر میں تھا۔ کنہیا کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور اسے ابھی اپنے ارمان پورے کرنے کا موقع بھی اچھی طرح نہ ملا تھا کہ گاؤں کے تھانے سے تبدیل ہو کر امرتسر آ گیا تھا۔ بلال شاہ نے آتے ہی اسے اپنی لائن پر لگا لیا تھا اور اس کے دماغ میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ میرے ساتھ افسری ماتحتی والا معاملہ چھوڑ کر بے تکلفی بھی ہے اور اسے چاہے تو چند دن کی جب چاہے چھٹی دلا سکتا ہے تا کہ وہ گھر کا چکر لگا آئے اور اپنی گھر والی کے درشن بھی کر آئے۔ بات صرف یہاں تک ہی نہ تھی بلال شاہ اسے امرتسر کے کئی حکیموں کے ساتھ یاری اور ان کے زوردار حکمت کے قصے بھی سناتا اور اسے جوانی قائم رکھنے کے کشتے دلانے کا وعدہ بھی کرتا تھا۔ چنانچہ دوسرے تیسرے دن نصف درجن پوریاں، پاؤ بھر حلوہ اور لسی کا جگ بلال شاہ کے معدے میں اُتر جاتا تھا اور کنہیا لال کو (بلال شاہ اسے کرشن کنہیا کے بجائے کنہیا لال ہی کہتا تھا) جوانی قائم رکھنے کا فکر تو شاید کچھ

برسوں کے بعد ہی ہوتا اپنی تنخواہ کے جلدی ختم ہوجانے کا فکر زیادہ لگنے لگا تھا۔

آج بھی کنہیا لال کے چکر میں ہی بلال شاہ ادھر آیا تھا۔ شاید گھر والی سے تعلقات پھر خراب ہوگئے تھے یا اسے چھوٹے بچے کی پیدائش کے بعد بلال شاہ کا گھر میں رہنا خطرے سے خالی نہیں لگتا تھا اس لئے وہ اسے کسی نہ کسی بہانے گھر سے باہر ہی رکھتی تھی۔ بلال شاہ برآمدے میں اس طرح وارد ہوا جس طرح کسی کی ٹوہ لیتا ہوا آیا ہو۔ اسے اُمید نہ ہوگی کہ میں بھی وہاں بیٹھا ہوں۔ وہ اپنے چہرے پر لاعلمی لانے کی کوشش کرتا ہوا دیوار کے ساتھ لگے بینچ پر بیٹھ گیا۔ ''کیوں بھئی کرشن نہیں ملا؟''

''نہیں شاہ جی ایسی تو کوئی بات نہیں' وہ تو میں یونہی آپ کو دیکھنے چلا آیا تھا۔''

''کوئی بات نہیں بلال شاہ۔ آج میں تمہیں لسی پلاتا ہوں۔'' میں نے جیب سے پیسے نکالے یاد نہیں کتنے تھے اور بلال شاہ کی طرف بڑھائے۔ ''چاہو تو ساتھ تکوں والے نان بھی لے لینا اور اگر واپس آنا چاہو میں یہیں ہوں گا۔''

بلال شاہ نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا آہستگی سے اُٹھا اور تھانے کے باہر والے دروازے کی طرف چل دیا۔ مجھے ہلسی آگئی۔ بہت بھلا مانس' وفادار آدمی تھا۔ میں اسے باہر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ دروازے سے باہر نکل کر وہ نظروں سے غائب ہوگیا۔ ان دنوں دکانوں سے جاکر نان کلچے' دہی' لسی' حلوہ پوری' کچوریاں وغیرہ لانے کا رواج زیادہ تھا۔ اس لئے بلال شاہ کے جلدی واپس آنے کی اُمید تھی۔ ان ہی دنوں علاقے کا نیا ایس پی تبدیل ہوکر آیا تھا۔ اس نے علاقے میں اپنے تھانے دیکھنے کی غرض سے دوروں کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ تھانیدار اور دوسرا عملہ اپنی ڈیوٹیوں پر رہتے تھے کہ کہیں بڑا صاحب اچانک نہ ٹپک پڑے۔ وردی

دفتر کا خیال رکھا جاتا۔ ٹاؤٹ اور مخبر جو اکثر سارا سارا دن محرروں اور سپاہیوں کے ساتھ گپ شپ کرتے رہتے تھے تھانوں سے زیادہ دُور ہی رہنے لگے تھے۔ میری عادت تھی کہ ایس پی کا دورہ ہو نہ ہو اپنے تھانے کے معاملات درست رکھنے اور ڈسپلن کا عادی تھا۔ پھر بھی ان دنوں عملہ بھی خاصا ہوشیار رہتا تھا۔ بلال شاہ کے جانے کے بعد میں اس غرض سے کرسی سے اُٹھا کہ چلو کوئی کام ہی دیکھ لوں اور پھر تھوڑا آرام کروں گا کہ میری نظر تھانے کے پھاٹک کی طرف اُٹھ گئی۔ چودھری کرم داد اندر آتا دکھائی دیا۔ چودھری اس علاقے کا زیادہ بڑا زمیندار تو نہ تھا بیس پچیس بیگھے زمین ہوگی لیکن رکھ رکھاؤ انسان دوستی کی وجہ سے گھمن پور کے لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ ان کے دلوں میں اس کے لئے احترام تھا۔ وہ روایتی زمیندار نہیں تھا کہ لوگ اس کی حویلی کی طرف جاتے ہوئے خوف محسوس کرتے۔ چودھری ابھی پھاٹک سے داخل ہوکر چند قدم ہی چلا ہوگا کہ میرا ایک مخبر بالکل اس حالت میں تقریباً بھاگتا ہوا تھانے میں گھسا اور چودھری کے ساتھ موہنڈا ٹکراتا ہوا پھولی سانس کے ساتھ میرے قریب آ کھڑا ہوا۔ اگرچہ پہلے کسی کیس میں اس کا میرے ساتھ واسطہ نہیں پڑا تھا لیکن اس کے بارے میں یہی بتایا گیا تھا کہ بہت کام کا آدمی ہے اور بھروسے والا ہے۔ کچھ مخبر تو ایسے ہوتے ہیں کہ تھانے میں محرر کی خوشامدیں کرتے اور چائے پانی کا پوچھتے رہتے ہیں یا نمبر بناتے رہتے ہیں کہ بستی میں ان کی عزت بنی رہے اور وہ ہر ایک کو پولیس سے چھتر مروانے کی تڑی دے کر اپنے کام کراتے رہتے ہیں۔ یہ مخبر کوئی کمین بھی نہیں تھا اپنا گھر بار بھی تھا اور ٹھیکے پر تھوڑی بہت زمین لے کر گزارہ کرتا تھا لیکن اسے ٹھرک تھا کہ وہ زمینداروں کے گھروں میں کام کرنے والے کمیوں پر رُعب رکھتا اور پولیس والوں

سے اپنی یاری بتاتا پھرتا تھا۔ سلام کر کے میرے پاس ہی کھڑا ہو گیا۔ سانس اس کا ابھی چڑھا ہوا تھا اور وہ رک رک کر بول رہا تھا۔

''وہ جی مل گئی ہے۔'' مجھے کچھ دیر اس کی بات سمجھنے میں لگ گئی مجھے یاد آیا کہ چند دن پہلے محرر کے کمرے سے گزرتے ہوئے میں نے محرر کو کسی سے بات کرتے ہوئے سنا تھا۔

''بزرگو فکر نہ کرو پہلے اپنی لڑکی کی سہیلیوں کے گھروں میں جا کر پتہ کرلو ہم بھی دیکھ لیں گے۔''

میرے ذہن میں محرر کی یہ بات آ گئی۔ ''کون مل گئی'' میں نے سمجھ نہ پاتے ہوئے مخبر سے پوچھا'' وہی جی لال دین کی لڑکی بڑی سوہنی تھی جناب اور سمجھدار بھی۔

''اس سے تو کوئی لڑکا مخول بھی نہیں کرتا تھا۔ دو دن پہلے ہی لال دین محرر کو رپورٹ کرنے آیا تھا کہ ممو صبح ساگ لینے کھیت میں گئی تھی واپس نہیں آئی۔''

''چلو اچھا ہوا مل گئی۔ کہاں تھی؟''

''کمانے کے ڈیرے پر سے ہو کر ویران بھٹے کی طرف جائیں تو ایک کھڈ میں اس کی لاش پڑی تھی۔ میں نے خود دیکھی ہے جناب۔ اپنی سالی کے دن کھنے گیا ہوا تھا واپسی پر ادھر سے گزر رہا ہوں کہ بدبو کی وجہ سے کھڈ میں جھانکا کہ وہاں ہے کیا..... بس جی وہیں سے آ رہا ہوں گھر بھی نہیں گیا۔'' لڑکی کی گمشدگی کا معاملہ بڑے بھید والا ہوتا ہے۔ چڑھتی جوانی میں لڑکیاں ایسی بے وقوفی کر جاتی ہیں کہ کوئی خوبصورت لڑکا دل کو بھا گیا تو اس کے ساتھ چل پڑیں۔ کچھ دشمنی میں اغوا بھی ہو جاتی ہیں۔ پولیس والے ان کے وارثوں کا دل رکھنے کے لئے کارروائی ڈالتے رہتے ہیں لیکن خاص جرم سامنے آ جائے تو پھر صرف اغوا کا یا بھاگنے کا کیس ہی نہیں رہ جاتا۔ اگر کہیں قتل ہو گیا تھا تو کام اے

ایس آئی کا نہیں رہ گیا تھا مجھے ہی کرنا تھا۔ میں نے محرر کو آواز دی محرر ہندو تھا۔ عمر بھی خاصی تھی کانشی رام اس کا نام تھا۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں معاملہ سمجھایا اور لال دین کے گھر اطلاع بھجوانے کا کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جتنی دیر میں وردی کمرے میں جا کر پہنی اتنی دیر میں محرر چار سپاہی میرے ساتھ جانے کے لئے بلا چکا تھا اور وہ کمرے سے باہر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ چلو نواز خان بہت آرام ہو گیا۔ میں کمرے سے نکلا۔ چوہدری کرم داد میری برآمدے والی کرسی کے پاس کھڑا شاید اس انتظار میں تھا کہ میں اسے کیا کہتا ہوں۔ مخبر کی باتوں میں الجھ کر میں نے کرم داد کے ساتھ صرف ہاتھ ہی ملایا تھا اور اسے اشارے سے بینچ پر بیٹھنے کا کہا تھا۔ اب وہ میرے تیار ہو کر باہر آنے کے انتظار میں تھا میں نے اسے کچھ دیر تھانے میں ہی رہنے کا کہا اور تھانے کے گیٹ کی طرف چل دیا۔ کمن پور تھانے سے قریب واقع تھا کوئی ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ ہوگا لیکن اس زمانے میں آبادی کم تھی اس لئے کھیتوں میں ہو کر ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ بھی کافی دور دکھائی دیتا تھا۔ پیدل جانے میں دیر ہو جاتی اس لئے کانشی نے اپنی سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے میرے وردی پہننے تک دو گھوڑے گیٹ کے پاس کھڑے کروا دیئے تھے۔ چار سپاہی تو ایک گھوڑے پر جا بھی نہیں سکتے تھے۔ میں نے ایک کو سوار ہونے کا اشارہ کیا اور خود دوسرے پر بیٹھ کر چل دیا۔ مخبر بے چارے کو پھر ڈیڑھ دو میل پیدل ہی جانا پڑا، کیا کرتا مجبوری تھی۔ ویران بھٹہ واقعی ویران تھا جس جگہ کمہار اینٹیں بناتے ہوں گے وہاں کی زمین ذرا نیچی تھی اور جانے کب سے بھٹہ بند ہونے کے باوجود ابھی تک ہموار تھی۔ ساتھ ہی ایک کھال گزرتی تھی اور اس سے پرے وہ کھڈ تھی خشک کھالے میں سے گزرتے ہی مجھے بدبو کا احساس ہونے لگا۔ مخبر آگے تھا اس نے اپنی پگ کا ایک ول کھول کر اپنے ناک کے گرد لپیٹ لیا

شائع ہو گیا ہے

سیارہ ڈائجسٹ کے لازوال اسلامی نمبروں میں ایک اور اضافہ

قصص القرآن نمبر

قیمت: 175 روپے

- ان تمام واقعات کا جدید علم و تحقیق کی روشنی میں تفصیلی ذکر جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی اور اس کی امت کو بتانا ضروری سمجھے
- انبیائے کرام کی مقدس اور پاکیزہ زندگیوں سے وابستہ واقعات
- قصے ان قوموں کے جن پر انبیائے کرام کی نافرمانی، اللہ تعالیٰ کے احکامات سے روگردانی اور سرکشی کے باعث عذابِ الٰہی نازل ہوا

عمدہ ترتیب، دلچسپ انداز بیاں اور پرکشش رنگین ٹائٹل
500 صفحات پر مشتمل یہ عظیم الشان نمبر جلد پیش کیا جائے گا

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 245412

میں نے جیب سے رومال نکال لیا۔ مخبر کھڈے کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ اور شاید اس کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ اس نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ آگے سپاہی اور پیچھے میں۔ دونوں کھڈ میں اُترے۔ لاش برہنہ حالت میں تھی اتنی لاشیں دیکھنے کے بعد میرا یہی خیال تھا کہ ایک دو دن سے زیادہ پرانی نہیں کیونکہ ابھی پھلاؤ شروع نہیں ہوا تھا۔ لاش ترچھی پڑی تھی جیسے کسی نے بڑی جلدی میں بوجھ کو زمین پر پھینک دیا ہو۔ بہت عبرت ناک منظر تھا۔ وہ لڑکی جس کے بارے میں مخبر کہہ رہا تھا کہ بڑے اچھے کردار والی تھی۔ اس حالت میں پڑی تھی میں گھٹنوں کے بل جھکا اور غور سے لاش دیکھنے لگا ہلکے سنہرے بالوں کے بکھر جانے سے گردن بالکل صاف نظر آ رہی تھی۔ جس پر ہلکا سا کالا سرخی مائل نشان تھا۔ ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے بڑا نہیں ہوگا جیسے کسی نے کھجایا ہوا ہو۔ عام آدمی کو شاید یہ نظر بھی نہ آتا جسم پر تشدد کا کوئی نشان نہیں تھا نہ نیل نہ گومڑ نہ کوئی زخم۔ لاش کے پاؤں ایسی حالت میں تھے کہ میں چونک پڑا میں نے آج تک ایسی کوئی لاش نہیں دیکھی تھی جس کے پاؤں پنڈلیوں کے اوپر گرے ہوئے ہوں۔ میں زمین پر اکڑوں بیٹھے ہوئے ہی تھوڑا سا کھسکا اور پھر ساری بات سمجھ میں آ گئی پیروں کے پچھلی طرف ایڑی اور پنڈلی کو ملانے والی نسیں کاٹ دی گئی تھیں۔ بالکل اس طرح چھری چلائی گئی ہوگی جس طرح مرغی ذبح کرتے ہیں کلائیوں پر رسی کے نشان مجھے نظر نہیں آئے۔ مخبر ابھی تک کھڈ کے کنارے ہی کھڑا بڑی دلچسپی سے یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے بدبو یا دیہاتی لوگوں کی فطری شرم و حیا نے اسے لڑکی کی برہنہ لاش سے دُور رکھا تھا۔ ویسے بھی جب یہ لڑکی زندہ ہوگی تو مخبر اسے جانتا تھا میں نے کھڑے ہو کر اسے پگ پھینکنے کی آواز دی۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

اس نے وہیں سے پگ نیچے پھینک دی۔ سپاہی نے کپڑا کھول کر لاش پر ڈالا اور میں کھڈ سے باہر نکل آیا تھانے پہنچنے تک لال دین بھی آ گیا تھا اور کرم داد کے ساتھ بینچ پر بیٹھا تھا۔ میں نے دونوں کو اندر بلوالیا۔ کمرے میں آتے آتے لال دین کی حالت خراب ہوگئی تھی۔ جس آدمی کی جوان بیٹی کئی دن سے غائب ہو اور پھر اسے پولیس والے خود تھانے بلوالیں تو پھر اس باپ کی حالت خراب ہی ہوتی ہے اور لال دین کوئی بچہ نہیں تھا۔ ادھیڑ عمری میں شادی کی اور اب تقریباً بڑھاپے میں جوان لڑکی کا ساتھ تھا جو قتل ہو چکی تھی میں سوچ میں پڑ گیا کہ آخر اسے کس طرح بتاؤں۔ لال دین سے مزید برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ ''جناب! کیا حکم ہے؟''

''لال دین دیران بھٹے تک تمہارے ساتھ میرا ایک سپاہی جائے گا واپسی پر تم سے بات ہوگی جاؤ دیر نہ کرو''۔ میں نے اس سپاہی کو اشارہ کیا جو میرے ساتھ گیا تھا۔

لال دین نے باہر نکلنے میں بہت تیزی کی۔ بیٹی کی گمشدگی نے اسے حد درجہ پریشان کر رکھا تھا۔ اس نے مجھ سے یہ تک نہ پوچھا کہ آخر بات کیا ہے۔ لال دین کے نکل جانے کے بعد میں نے کرم داد سے پوچھا کہ وہ آج تھانے کیسے آ گیا۔ میرے اس سوال کا مقصد یہ تھا کہ کرم داد بہت شریف آدمی تھا اور اس جیسے لوگ تھانوں کچہریوں میں نہیں جاتے۔ انہوں نے کوئی ایسا کام ہی نہیں کرنا ہوتا۔

''بس یونہی آپ کی طرف چلا آیا'' کرم داد تھکا تھکا سا لگ رہا تھا لیکن اس کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ کوئی خاص وجہ ہے۔ میں نے اسے تھوڑا سا کریدا۔

''ہاں جی کوئی ایسی بات نہیں''۔ میرا تجربہ یہ کہہ رہا تھا کہ کرم داد جیسے لوگ جو کبھی تھانے میں نہیں جاتے بغیر کسی وجہ کے یہاں کیسے آ گیا۔ پھر پریشان

بھی اور کوئی بات کرنے سے گھبرا بھی رہا تھا۔ پھر میں یہ بھی دیکھ چکا تھا کہ لال دین کو میرے بلانے پر وہ پریشان بھی ہوگیا تھا۔ بہرحال جب تک وہ خود کوئی بات نہ کرتا میں اس کے منہ میں تو کوئی لفظ ڈالنے سے رہا۔ چند منٹ خاموش بیٹھنے کے بعد وہ خود ہی اٹھا اور اجازت لے کر چلا گیا۔

ایک گھنٹہ ہی گزرا ہوگا جب میں کاغذی کارروائی کے بعد اٹھا اور دو سپاہیوں کو ساتھ لے کر لال دین کے گھر کی طرف چلا۔ اس ایک گھنٹے میں‘ میں نے نامعلوم قاتل کےخلاف پرچہ درج کیا۔ دیگر کاغذات تیار کئے پوسٹ مارٹم کے لئے کارروائی بتائی اور تفتیش کا کوئی رُخ سوچتا رہا۔ بہرحال لال دین کے گھر جانا ضروری تھا۔ وہاں آنے جانے والوں میں سے میرے مطلب کا آدمی بھی ہوسکتا تھا۔ لال دین کے گھر عورتوں کے بین کی آوازیں باہر گلی میں ہی آرہی تھیں معمولی سا عام گھر تھا۔ صحن کے ساتھ چھوٹا سا برآمدہ تھا جس میں تین چار چارپائیاں سیدھی بچھی ہوئی تھیں ایک پر میلے سے ہرے رنگ کی چادر پر کمو کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ بدبو زیادہ ہوتی جارہی تھی لاش کے پھولنے کا عمل شاید شروع ہورہا تھا اور ضروری تھا کہ اسے فوراً ہی پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کردیا جاتا وگرنہ بعد میں ڈاکٹر بھی اعتراض کرتے۔ اس زمانے میں بھی عام ہسپتالوں میں ایسی سہولتیں نہ تھیں کہ پرانی لاشوں کا پوسٹ مارٹم بھی ہوسکتا۔ امرتسر میں ایسی سہولت موجود تھی اور وہاں کا سول سرجن بھی میرا جاننے والا تھا۔ ایک دو بار اس سے سرکاری معاملوں میں ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے لال دین کی طرف توجہ دی۔ رو رو کر وہ بے حال ہورہا تھا۔ اس کی ایک رشتہ دار عورت جو ساتھ والے گاؤں کی دائی بھی تھی پاس ہی کھڑی تھی۔ میں نے لال دین کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے تسلی دینے لگا۔ وہ میرے ہمدردی ظاہر کرنے پر مزید گڑنے لگا۔

”لال دین مجھے افسوس ہے میری مدد کرو گے تو اس درندے کو زمین سے باہر نکال لاؤں گا۔ جس نے یہ ظلم کیا ہے۔ مجھے پوسٹ مارٹم کرانا ہے۔“

لال دین کی ہچکی بندھ گئی۔ وہ تو ایک لفظ بولنے کے قابل نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی رشتہ دار عورت بول پڑی ”صاحب جی ڈاکٹروں سے لاش خراب کرانی ضروری ہے؟۔ کیا پہلے ہی کم ظلم ہوا ہے کہ اب بدنامی بھی ہمارے منہ پر ملنے لگے ہو۔“

”کیوں کیا بات ہے بی بی؟“ میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ کوئی جواب دینے کے بجائے وہ چپ ہوگئی۔ میرے ذہن میں جیسے ایک دم روشنی سی ہوئی۔ اس عورت کو کوئی خاص بات معلوم تھی۔ میں اسے ایک طرف لے گیا۔ ”بی بی کھل کر بات کرو۔ تمہیں پتہ ہے کہ اس گھر کی ایک نوجوان لڑکی قتل ہوگئی ہے۔ تمہاری اس گھر سے رشتہ داری ہے؟“

”دور پار کی برادری ہے جی۔ اس گھر میں ایسے بھی آنا جانا رہا ہے۔ دائی گیری کرتی ہوں۔ یہ لڑکی میرے ہاتھوں میں ہوئی تھی۔ اب بوڑھی ہوں کام تو چھوڑ دیا پھر بھی گاؤں کی بیبیاں مشورے کے لئے بلا لیتی ہیں۔“

”تم کیوں یہ کہہ رہی ہو کہ مُردہ خراب نہ کرو۔“ میں نے اسے تھوڑا سا دبایا۔ وہ گڑبڑا گئی۔ ”بس یونہی جی دیکھو ناں جوان لڑکی ہے۔“

”خیر میں جب تمہیں بلاؤں تو تھانے آنا پڑے گا۔ مجھے تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔ آخر تم ان کی رشتہ دار ہو ان کی مدد کرنا پڑی تو کرو گی ناں۔“

”ٹھیک ہے جی۔“

میں ابھی سے اس عورت کو بدکانا تو نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بدنامی والی بات کی تھی وہ میرے ذہن میں اٹک گئی تھی میرا دل کہتا تھا کہ اس کیس کی تفتیش کا سرا

یہاں سے ہی ملے گی۔ میں نے لال دین سے کہا کہ وہ اپنی بیوی اور رشتہ داروں کو سمجھائے۔ اگر اسے لڑکی کے قتل کا پتہ چلانا ہے تو پھر پوسٹ مارٹم رپورٹ میرے لئے ضروری ہوگی۔ لال دین میری بات سمجھ گیا۔ "جو جی چاہے کریں میری کمو تو اب دنیا میں نہیں رہی۔"

میں نے پوسٹ مارٹم کے لئے لاش روانہ کرنے کے انتظامات کئے۔ اس میں آپ کے لئے دلچسپی والی کوئی بات نہیں۔ سپاہیوں کے ساتھ لاش روانہ کی' کاغذات بنائے' ہسپتال کے چکر لگائے اور ڈاکٹر سے ابتدائی بات چیت کی۔ رپورٹ مجھے چوتھے دن ملنا تھی تین دنوں میں' میں نے قتل کے امکانی پہلوؤں پر غور شروع کیا اور ساتھ ہی مشتبہ لوگوں پر ہاتھ ڈالنے کی ابتدا کردی۔ میرے خیال میں اس قتل کی کئی وجوہ ہوسکتی تھیں کسی نوجوان سے ناجائز تعلقات جس نے لڑکی کی عزت خراب کرکے قتل کردیا تھا۔ لال دین سے کسی کی دشمنی' رشتے سے انکار کا چکر' میں نے ابتداء لال دین سے ہی کی..... بیٹی کی موت نے اسے ادھ موا کردیا تھا۔ میں نے اسے تھانے بلوانا مناسب نہ سمجھا اور بغیر وردی اس کے گھر چلا گیا۔ مسلمان گھرانا تھا رشتہ دار عورتیں مقتولہ کی روح کے ثواب کے لئے قرآن خوانی بھی کررہی تھیں کچھ اس کی ماں کے ساتھ تعزیت میں مصروف تھیں۔ لال دین مجھے بیٹھک میں بٹھا کر پاس ہی بیٹھ گیا۔

"لال دین تمہاری کسی سے کوئی دشمنی تھی؟"

اس نے منہ سے بولے بغیر سر ہلا دیا۔ "تمہارے خاندان میں کسی نے رشتہ مانگا ہو اور تمہارے انکار پر ایک خاموش دشمنی شروع ہوگئی ہو۔"

"نہیں جی۔" بہت ہی مختصر جواب تھا۔ پھر خود ہی بولا۔ "کمو کی ماں نے کئی بار دبی دبی زبان سے کہنا شروع کردیا تھا کہ لڑکی جوان ہورہی ہے رشتہ دیکھنا چاہئے مگر جی ابھی تو وہ بڑی نہ ہوئی تھی۔ میں نے یہی جواب دیا کہ کون سی جلدی ہے۔"

مجھے ہمت نہیں ہورہی تھی کہ ایسے موقع پر وہ سوال کرتا جو کسی باپ سے نہیں پوچھا جاسکتا پھر بھی میں نے جی کڑا کرکے پوچھ ہی لیا۔ "تمہاری بیٹی یا تمہاری بیوی نے کبھی ایسی شکایت تو نہیں کی تھی کہ کوئی لڑکا کمو پر نظر رکھتا ہو یا اس نے کبھی چھیڑا ہو۔ کوئی دھمکی وغیرہ دی ہو۔"

"لال دین کے چہرے پر ایک دم سرخی سی آئی اور پھر اس کا چہرہ نارمل ہوگیا۔ "نہیں جی"۔

مجھے اس کی "نہیں جی' نہیں جی" سے چڑ ہوگئی۔ یہ آدمی کھل ہی نہیں رہا تھا۔ ایسے موقعوں پر مقتول کے لواحقین شکایتوں کے ڈھیر لگا دیتے تھے یہ آدمی گھنا ہی بن گیا تھا۔

"لال دین میں تمہاری بیوی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" کوئی جواب دیئے بغیر لال دین اٹھا اور باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی دونوں میاں بیوی اندر آگئے میں نے لال دین سے کہا کہ وہ دوسرے کمرے میں جائے اس کی بیوی تھوڑی سی گھبرائی اور پھر سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ میرے ہمدردی کے بول پر اس سے برداشت نہ ہوا وہ رونے لگی۔ کچھ دیر دوپٹے سے آنکھیں صاف کرنے کے بعد بولی "جوان اولاد سنبھالنے کا مطلب صرف یہ نہیں ہوتا کہ ان کے روٹی' کپڑے پورے کردو۔ کئی بار کہہ چکی تھی کہ لڑکی کے ہاتھ پیلے کردو سنتا ہی نہیں تھا۔"

"تمہیں کسی پر شک ہے؟"

شک تو کسی پر نہیں۔ لڑکی زیادہ تر گھر پر ہی رہتی تھی۔ بہت دور بھی گئی تو گاؤں پرلے سرے پر کرم داد کے گھر۔ کرم داد کی بڑی بیٹی کے ساتھ اس کا ملنا تھا۔ ایک طرح سے سہیلیاں تھیں۔ کرم داد کی بیٹی اسے بندے' کنگن لا دیتی تھی گھر بھی ساتھ لے جاتی تھی اور کسی جگہ کمو کا جانا نہیں تھا۔ کرم داد کی بیٹی

زرینہ کی شادی کو چند سال ہی ہوئے ہیں بچہ کوئی نہیں۔ اس کا خاوند بھی کام کاج کم ہی کرتا ہے بس سسرال میں پڑا رہتا ہے کمو کو کچھ دنوں سے منع کر رہی تھی کہ بس زیادہ میل ملاپ اچھا نہیں لیکن آنا جانا بند کرنے سے پہلے ہی وہ غائب ہوگئی تھی۔

کچھ دیر وہاں بیٹھنے اور اِدھر اُدھر کے سوال کرنے کے بعد میں وہاں سے اُٹھ آیا۔ فی الحال دونوں میاں بیوی کچھ بتانے کے یا تو قابل نہیں تھے یا چھپا رہے تھے۔ تھانے پہنچا تو شام ہونے والی تھی احاطے میں بچھی چارپائی پر بلال شاہ اور کرشن کنہیا بیٹھے تھے۔ بلال شاہ اسے شاید کوئی اور چکر دے رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بلال شاہ چارپائی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور پیروں میں جوتی گھسیٹتا میری طرف آیا۔ سلام کے بعد بولا ”کیسے ہیں۔ میں ایک دو دن اِدھر آیا ہی نہیں بس گھر میں ہی رہا ہوں طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“ وہ ڈھیٹ ہوکر مسکرا رہا تھا مجھے ساری بات سمجھ آ گئی۔ بلال شاہ کا دماغ پھر گیا ہوگا اور اس نے اپنی بیوی کی لگائی ہوئی پابندیوں کو ٹھکر ا دی ہوگی اور پھر گھر میں ایسا گھسا کہ دو دن بعد باہر نکلا۔ ”سنا ہے کہ لال دین کی بیٹی قتل ہوگئی ہے۔ اِدھر سے ہی آ رہا ہوں پتہ چلا آپ بھی ابھی وہاں آئے تھے بڑی سادی عورت ہے جی لال دین کی بیوی بھی۔ میں نے اپنی گھر والی سے تو ہ لی ہے کمو تھی تو بڑی بچی پر کرم داد کی بیٹی نے اسے ہاتھوں پر ڈالا ہوا تھا۔ انہی کے گھر جب دیکھو آتی جاتی تھی۔ زرینہ ویسے تو چھوٹی عمر کی ہے، پر ہے بڑی پکی پھروڑا اپنے خاوند کے اردگرد پھرتی رہتی ہے“ پھر رازدارانہ انداز میں بولا۔ ”اس کا خاوند جمیل اتنی شکل والا بھی نہیں پر اس کے بہت نخرے سہتی ہے اور وہ اس پر ہاتھ اٹھانے سے بھی باز نہیں آتا۔ اپنے سسر کے گھر میں رہتا ہے اور بیوی کو اس کے گھر میں

”بلال شاہ اندر میرے کمرے میں آؤ تم سے ضروری بات کرنا ہے۔“ بلال شاہ میرے پیچھے لپکا۔ اندر پہنچ کر میں کرسی پر تھکے ہوئے انداز میں بیٹھ گیا۔ بلال شاہ کو اب تک کی ساری بات سنا کر اسے ہدایت کی کہ وہ اپنی بیوی کے ذریعے ٹوہ لگائے کہ کمو کو غائب کرنے میں زرینہ کا ہاتھ تو نہیں تھا؟ میرا ایک شک تھا جو ذہن سے نکل نہیں رہا تھا۔ بلال شاہ مسکرایا۔ ”بہت اچھا جی میں ابھی گھر جاتا ہوں۔“ لگتا تھا کہ اس کے گھر تعلقات اچھے ہوگئے تھے۔ تھکاوٹ نہ جانے کیوں ان دنوں زیادہ ہی غالب آ گئی تھی میں کرسی پر ہی بیٹھا آرام کرتا رہا اور پھر اٹھ کر اپنے کوارٹر کی طرف چلا گیا۔ بستر پر لیٹتے ہی خوب گہری نیند نے آلیا۔

بلال شاہ کی رپورٹ خاصی اچھی ثابت ہوئی۔ وہ بہت خوش تھا۔ ”جناب میں نے سارا پتہ کرلیا ہے۔ جمیل بہت ہتھ چھٹ ہوگیا ہے۔ پرسوں بیوی کو کسی بات پر پھر مارا اس کے ماتھے پر گومڑ دیکھ کر کرم داد سے بھی برداشت نہیں ہوا اور وہ بھی داماد سے اُلجھ پڑا۔ زرینہ باپ کو روکتی رہی لیکن باپ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا وہ زرینہ سے کہہ آیا تھا کہ تھانے جا کر داماد کے خلاف رپورٹ کرتا ہے پتہ نہیں گیا یا نہیں“۔ بلال کی بات پر مجھے کرم داد کا تھانے آنا اس کی پریشان صورت سب یاد آ گیا۔ اچھا تو یہ بات تھی لیکن کرم داد نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ کمو کی لاش ملنے کی بات سن کر واپس چلا گیا تھا۔ میں نے بلال شاہ سے کہا کہ کرشن لال کو بھیج کر کرم داد کو بلاؤ۔ گھر میں دنگا فساد اس کے گھر کا معاملہ تھا لیکن کمو چونکہ اس کے گھر آتی جاتی تھی اور اس کے گھر جانے کے بعد ہی غائب ہوئی تھی اس لئے کرم داد سے پوچھ گچھ ضروری تھی۔ پچھلے دو دن کی تھکاوٹ دُور ہو چکی تھی اور میں حسب سابق پھر تازہ دم تھا۔ اگلے روز ایس ڈی کی آمد

کی اطلاع بھی مل چکی تھی اور اگر وہ قتل کی تازہ واردات کے بارے میں کوئی سوال کر بیٹھتے تو میرے پاس کوئی جواب تو ہونا چاہئے تھا۔ ابھی تک تو میں خود اندھیرے میں تھا۔ اندازہ تھا کہ کرم داد کی باتوں سے کوئی راہ نکلے گی ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد کرشن اپنے ساتھ کرم داد کو لے آیا۔ میں نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کو کہا۔ نہ جانے اسے میری شکل پر کیا نظر آیا کہ وہ خوفزدہ دکھائی دینے لگا۔

''کرم داد اس دن تو تم مجھے ملنے آئے تھے آج میں نے تمہیں بلایا ہے۔ کمو تمہارے گھر آخری بار کس دن آئی؟'' میں نے کسی واسطے کے بغیر سیدھا سوال کر دیا۔

''زیادہ تر میت کھلیان میں رہتا ہوں جی کبھی کبھی گھر میں اسے دیکھ لیتا تھا۔ میری بیٹی زرینہ کے پاس آ کر بیٹھی رہتی تھی۔ آخری بار کا پتہ نہیں کب آئی تھی۔'' وہ کہتا بھی سچ ہی ہوگا۔ کام کاج والے مردوں کو کیا پتہ ہوتا ہے کہ گھر میں کس وقت کون عورت آئی وہ تو گھر سے باہر کے کاموں میں ہوتے ہیں۔ اتفاقیہ گھر ہوئے تو دیکھ لیا۔ میں نے اسے سیدھے راستے پر لانے کی کوشش کی اور میرے منہ سے وہ سوال نکل گیا جو میں ابھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔

''جمیل اور زرینہ کی لڑائی کمو کی وجہ سے تو نہیں ہوئی؟'' پوچھنے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ میرے دماغ کے کسی خانے میں شک تھا کہ حسد کی وجہ سے کمو اغوا نہ ہوئی ہو۔

''میں کیا بتاؤں۔ میں تو جمیل سے پہلے ہی عاجز آ چکا ہوں۔ سگا بھتیجا ہے ورنہ اسے گھر سے باہر نکال دیتا۔ ویسے سوچتا ہوں کہ اگر سگا بھتیجا نہ بھی ہوتا تو کیا جوائی کے ساتھ یہ کر سکتا تھا۔ میری تو جان مصیبت میں ہے۔ دوسری لڑکی بھی بیاہنے والی ہے [illegible] جمیل پر چند پیسے مل

جائیں گے تو اسے رخصت کر دوں گا۔ گھر میں ہر وقت کی کل کل ہے۔ وہ بھی پریشان ہے۔ ایک دو بار تو بہنیں بھی آپس میں لڑ چکی ہیں لڑکی اب ناخوش رہنے لگی ہے پتہ نہیں اسے کیا چپ لگ گئی ہے۔ جمیل کا وجود برداشت نہیں کرتی۔ کرم داد کی باتیں میں غور سے سن رہا تھا۔ لیکن ان میں مجھے اپنے مطلب کی بات نہیں مل رہی تھی۔ وہ تو یہ جواب دے کر خود کو فارغ سمجھ بیٹھا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ کمو کہاں گئی ہے۔ میں اب تک اس سے شرافت برت رہا تھا شاید اس نے مجھے بے وقوف سمجھ لیا تھا میں نے اس کے ساتھ سختی کا فیصلہ کر لیا۔

''دیکھو کرم داد میں تمہاری عزت کر رہا ہوں۔ اسی لئے تمہیں تھانے بلایا ہے ورنہ کمو کا تمہارے گھر آنا جانا تھا اور گھر والوں کے لئے تمہاری بیٹی سے پوچھ گچھ کرنا چاہئے تھی میں خود تمہارے گھر آ جاتا تو بھی تمہاری عزت پر گاؤں میں حرف آتا کہ پولیس تمہارے گھر گئی ہے تمہاری بیٹی کو یہاں بلواتا تو بھی یہی بات ہوتی۔ اب میرے لئے اور کوئی راستہ نہیں کہ دونوں میں سے ایک طریقہ اختیار کر لوں۔ بولو کیا کہتے ہو میں تمہارے ساتھ چلوں یا تمہاری بیٹی کو بلوا لوں۔ کیوں نہ تمہارے جوائی سے بھی بات کر لی جائے جو آدمی گھر میں ہی گھسا رہتا ہو اپنی بیوی کی سہیلیوں سے بھی واقف ہوگا۔ بیوی سے بھی ان کے بارے میں کچھ پوچھ لیتا ہوں''۔

میرے اس جملے کی کرم داد تاب نہ لا سکا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔ ''وہ جمیل تو جی باہر بھی جاتا ہی ہے میں زرینہ سے کچھ معلوم کروں گا مجھے آج اس سے پوچھ لینے دیں خود ہی بتانے حاضر ہو جاؤں گا''۔

وہ پگھل چکا تھا اور میں یہی چاہتا تھا۔ میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔ کرم داد کے باہر نکلتے ہی بلال شاہ اندر آ گیا۔ وہ کمرے کی چک کے

باہر بیٹھا ساری باتیں سن رہا تھا۔ ''اس نے کیا بتانا ہے ایسے شریف لوگ اندر سے مکڑے بھی ہوتے ہیں۔ جمیل کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا پھر بھی حکیموں والی گلی میں کمالے کے اڈے پر جاتا ہے۔ کمالے کے ساتھ یارانہ بھی لگتا ہے۔ کمالے کو یہاں بلا کر پوچھ لیتے ہیں۔'' کمالے کا نام میرے تھانے میں ہسٹری شیٹر کے طور پر درج تھا۔ اس کے خلاف جوئے' شراب کی بھٹی چلانے اور مار کٹائی کے مقدمات ہو چکے تھے لیکن اغوا یا عورت کے ساتھ زیادتی کا کوئی کیس اس کے خلاف نہیں تھا۔ کھمن پور سے باہر، رکھ میں اس نے ایک کچے کمرے کا ڈیرہ بنا رکھا تھا وہاں بھی ابھی تک کسی کالے دھندے کی اطلاع کم از کم مجھ تک نہیں آئی تھی۔ میں نے کمالے کو بلانے کے بجائے یہی بہتر سمجھا کہ وقت ضائع نہ کروں اور کمالے کے اڈے پر جایا جائے۔ میں نے بلال شاہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں تھانے سے باہر آ گئے۔ ہمارا رخ حکیموں والی گلی کی طرف تھا۔ اچار مربعوں والی دکان کے ساتھ مٹی رنگ کے دروازے کی طرف بلال شاہ نے اشارہ کیا۔ دروازہ کھٹکھٹانا بے فائدہ تھا کہ زنجیر کے ساتھ کنڈے والا کالے رنگ کا تالا لٹک رہا تھا۔ اچار مربعوں والا غور سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ بازار میں خوامخواہ کمالے کا پوچھنا اسے چوکنا کر دینے والی بات ہوتی ہم چپ چاپ وہاں سے چل پڑے۔ چلتے چلتے بلال شاہ نے رکھ میں جانے کی تجویز دی۔ گھوڑے لینے کے لئے ہم تھانے آ گئے۔ مجھے یاد ہے کہ عصر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ بلال شاہ کی طبیعت سے تو میں واقف تھا اپنے دفتر میں نماز پڑھی اتنی دیر میں بلال گھوڑے کھرلیوں سے نکال لایا تھا۔ ہم سوار ہوئے اور اندھیرا پھیلنے سے پہلے رکھ میں جا پہنچے۔ اردگرد ویرانی تھی دُور تک کھیت ہی کھیت تھے۔ بکائن کے درختوں کے جھنڈ میں کمالے کا کچا کوٹھا تھا جس کے گرد آدمی کی چھاتی جتنی اونچی گارے کی دیوار تھی۔ احاطے کے اندر جانے والا راستہ بغیر دروازے کے تھا۔ گھوڑے ہم نے بکائن کے جھنڈ سے کافی پہلے ہی پھلاہیوں کے درختوں کے ساتھ باندھ دیئے۔ اس درخت کے جھاڑ کے پیچھے جو چیز ہو سامنے سے نظر نہیں آتی۔ پھلاہی کا چکر کاٹ کر ہم بکائن کے جھنڈ میں داخل ہوئے اور احاطے کے راستے سے گزر کر کوٹھے کے دروازے پر جا پہنچے۔ بلال شاہ کا گینڈے جیسا جسم تن گیا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ میرے قابو بھی مشکل سے آتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے کچھ کہتا اس کا جسم میری آنکھوں کے سامنے لہرایا اور اس کی زوردار لات دروازے پر پڑی۔ اندر سے کنڈے والی زنجیر کے ٹوٹنے کا کڑاکا ہوا دروازہ کھڑاک سے اڑ کر پیچھے گیا اور واپس باہر کی طرف ٹکرانے سے پہلے ہی بلال شاہ کمرے کے اندر تھا۔ میں نے بھی اندر داخل ہونے میں دیر نہیں کی اگرچہ باہر بھی روشنی میلی میلی سی ہو گئی تھی لیکن بند کمرے کا اندھیرا باہر سے زیادہ تھا کوٹھے کی پچھلی طرف کی کچی دیوار میں بنے ہوئے طاق سے وہی میلی میلی روشنی اندر آ رہی تھی اندر چارپائی پر ایک نوجوان عورت لیٹی تھی۔ دروازہ ٹوٹا اور دو آدمی اندر گھس آئے تو وہ بوکھلا کر اٹھی۔ چیخ بالکل اس کے گلے میں پھنس گئی تھی منہ کھلا ہی رہ گیا۔ بلال شاہ کا سانس دھونکی کی طرح چلنے لگا لیکن آنکھوں میں شرمندگی آ گئی۔ کمالے کی جگہ وہاں تو ایک عورت تھی۔ میں نے گھنگھورا مارا۔ ''بی بی کون ہو تم۔ کمالا کدھر ہے؟''

عورت سمٹ کر گٹھڑی بن گئی۔ جواب بلال شاہ نے دیا۔ ''یہ زرینہ لگتی ہے''۔ لگتا تھا بلال نے کرم داد کے گھر کی عورتوں کا حدود اربعہ بیوی سے معلوم کر لیا تھا۔ پھر وہ عورت کے پاس ہو گیا' ''کرم داد کی بیٹی ہو ناں۔'' عورت نے منہ سے کچھ بولنے کے بجائے

ٹانگیں زمین کی طرف کیں آہستہ سے اٹھی اور بلال شاہ سے گھسٹتی ہوئی میرے پاؤں میں گر پڑی۔ تصدیق ہو جانے کے بعد وہ کون تھی میرا دماغ گھوم گیا۔ کرم داد کی پریشان شکل میری آنکھوں کے سامنے آ گئی۔

میں نے سوچا اسے تھانے لے چلوں پھر سوچا اس کا جرم کیا ہے۔ اگر کسی غیر آدمی کے کمرے میں ہے تو پھر بھی میں نے اسے کسی غیر حالت میں نہیں دیکھا۔ کموکی گمشدگی یا اغوا کے ساتھ اس کا تعلق بھی ابھی ثابت نہیں ہوا۔ صرف پوچھنا پڑا تو کرم داد کے گھر چل کر پوچھ لوں گا۔ اس طرح اپنے ساتھ تھانے لے گیا تو کرم داد کی عزت کا تو جنازہ ہی نکل جائے گا۔ یہ لڑکی اگر ابھی تک بدنام نہیں ہوئی تو باقی کوئی کسر نہیں رہ جائے گی۔ ہوسکتا ہے اس کا گھر والا بھی اسے چھوڑ دے۔ انہی خیالوں میں تھا کہ بلال شاہ اس طرح چونکا جیسے پتا کھڑکنے پر جنگلی جانور کان اٹھا لیتا ہے۔ میں نے بھی کان باہر لگائے تو ایسا لگا جیسے کوئی الٹے پیروں بھاگا ہو۔ بلا سوچے بلال شاہ نے باہر کی طرف چھلانگ ماری میں بھی افراتفری میں باہر آیا کچھ بھی نہیں تھا اگر کمالا باہر آیا تھا اور خطرہ جان کر بھاگ نکلا تو اس رکھ میں اسے تلاش کرنا بے سود تھا۔ وہ برسوں سے اس علاقے میں رہتا تھا۔ ہم سے زیادہ رفتار سے چھپ کر نکل سکتا تھا۔ کمالے کے بارے میں اگر کوئی شک تھا تو اب یقین ہوگیا تھا کہ کوئی ایسی بات ضرور ہے ورنہ اسے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس زمانے میں ہسٹری شیٹر محض اس بات سے نہیں گھبراتے تھے کہ ان کے کمرے سے کوئی عورت نکلتی ہوئی دیکھ لی جائے۔ بلال شاہ نے بہت زور مارا کہ ہم اسے تلاش کریں میرے نزدیک یہ کوشش فضول ہی تھی۔ بلالے کے ساتھ بحث بحثی میں کافی وقت نکل گیا میرا دماغ پوری طرح گھوم چکا تھا۔ زرینہ کی بے غیرتی پر میرا خون کھول رہا تھا۔ میرا اس سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ لیکن اگر اس کا کوئی خونی رشتہ دار ہوتا تو اس وقت خاموش نہ رہتا۔ میں نے ایسے کئی کیس دیکھے تھے کہ اپنی کسی عورت کو کسی غیر مرد کے کمرے میں یا اس کے ساتھ دیکھ کر لوگ قتل سے دریغ نہیں کرتے۔ دیہاتی علاقوں کے تھانے داروں کو ایسے بہت سے کیسوں میں ان چیزوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اسی وقت مجھے بھی احساس ہوا کہ میں قتل کے جس کیس کی تفتیش کر رہا ہوں اس میں بھی عورت ہی کا ہاتھ لگتا ہے۔ آگے چل کر میری یہ سوچ صحیح ثابت ہوئی۔ میں جب تھانے واپس آیا تو کافی اندھیرا ہو چکا تھا اور مجھے کرم داد سے دو ٹوک بات کرنا تھی۔ میں نے کرشن سے کہا کہ کرم داد کو لے آئے کچھ دیر بعد کرشن واپس آیا تو پتہ چلا کہ کرم داد گھر نہیں ہے میں نے صبح کا انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ بلالے کو گھر جانے کیلئے کہا اور خود سونے چلا گیا۔

صبح کے وقت میرا موڈ بہت خراب تھا۔ زرینہ والا واقعہ میرے ذہن میں گھوم رہا تھا۔ آج ایس پی نے بھی دورے پر آنا تھا میرا عملہ بہت چوکس تھا۔ بلال شاہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ رات بہت دیر سے بھی گھر نہیں گیا تھا کہ دن چڑھے تک سویا رہتا اتنے میں اس کا لڑکا باپ کا پتہ کرنے تھانے آ گیا۔ تب مجھے پتہ چلا کہ بلال گھر نہیں گیا۔ میں نے بچے کو تسلی دے کر رخصت کیا اور اس کے غائب ہونے کا سوچنے لگا۔ نصف دن گزرنے سے پہلے ہی ایس پی آ گیا۔ معمول کی باتوں اور تھانے کے معائنے کے بعد اس نے میرے کام کی تعریف کی اور پھر یہ بھی کہا کہ ایس ایس پی انگریز افسر قتل کی وارداتوں پر پولیس کی زیادہ توجہ چاہتا ہے۔ اور میں اسی سلسلے میں تھانوں کا دورہ کر رہا ہوں اسے میرے علاقے میں قتل کی اس واردات کا پتہ چل چکا تھا۔ اس نے میرے سابقہ ریکارڈ کی وجہ سے میرا کندھا تھپکا اور

سیارہ ڈائجسٹ

کی حسب روایت ایک نئی اچھوتی اور یادگار **پیشکش**

شائع ہو گیا ہے

توبہ نمبر

قیمت: 160 روپے

- توبہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے دروازے کھولتی ہے
- قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں توبہ کی برکات' آداب اور فضائل پر کیا کچھ کہا گیا ہے؟
- انبیائے کرام' صحابہ کرامؓ' اولیائے کرامؒ اور صالحین کی توبہ نے قدرت خداوندی نے کیسے کیسے مظاہر دکھائے۔
- ایمان افروز اور نور ایمان کے حیرت انگیز واقعات سے بھرپور یہ دستاویز آپ کے ذاتی ذخیرہ کتب میں ایک انمول اضافہ ہوگا اور آپ کے دوستوں کیلئے شاندار اور یادگار تحفہ بھی

سیارہ ڈائجسٹ: 240 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور۔ فون: 7245412

حوصلہ بڑھایا۔ وہ میری کارکردگی سے مطمئن تھا۔ اسے علم تھا کہ میں خوشامدی نہیں کام سے مطلب رکھتا ہوں۔ ایس پی کے جانے کے بعد مجھے کم از کم ایک کام سے تو فرصت ہوگئی۔ میں نے کرم داد کی طرف سپاہی دوڑایا جس تیزی سے سپاہی گیا تھا اتنی جلدی ہی واپس آ گیا۔ پتہ چلا کہ کرم داد بھی غائب ہے۔ میرے دماغ کا فیوز ہی اُڑ گیا۔ پہلی بار کسی کیس میں یہ صورت بنی تھی کہ میں بے بس معلوم ہوتا تھا۔ اس طرح پریشان ذہن سے تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ میں نے بلال کے آنے کا انتظار ضروری خیال کیا اور پھر سوچا کہ چلو سول ہسپتال ہی چلوں پوسٹمارٹم رپورٹ تو لے آؤں۔ میں نے شہر کی بس پکڑی اور سول ہسپتال پہنچا۔ زیادہ تر ڈاکٹر ہندو تھے۔ اپنے کام پر بہت توجہ دیتے تھے اور پوسٹ مارٹم رپورٹوں پر توجہ بہت ہوتی تھی آج کل کی طرح نہیں کہ آپریشن تھیٹروں میں پوسٹ مارٹم نیچے والا عملہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر صرف دستخط کردیتا ہے۔ میں نے یہاں تک سنا ہے کہ دیہی قصبوں میں آپریشن تھیٹر اسسٹنٹ اور دیگر عملہ بھی یہ کام کرتا ہے نام ڈاکٹر کا ہوتا ہے۔ بہرحال میں جس ڈاکٹر سے جا کر ملا شیاما ہرشار مکرجی اس کا نام تھا۔ پتلے جسم کا یہ ڈاکٹر مجھے آج بھی یاد ہے چہرے سے ہی ذہین لگتا تھا۔ رپورٹ بھی اس نے تفصیلی مرتب کی تھی۔ قتل ہونے والی کے ساتھ مرنے سے قبل کئی بار زیادتی ہوئی تھی۔ یہی نہیں وہ ماں بننے والی حالت میں تھی۔ ٹخنوں کے پیچھے پنڈلیوں کو پیروں سے جوڑنے والی نسیں کاٹی گئی تھیں اس کے لئے کوئی تیز دھار آلہ استعمال ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے بڑے یقین سے کہا تھا "انسپکٹر صاحب اس لڑکی کے ساتھ بلادکار ہوا ہے" ہندو عورت کے ساتھ زیادتی کو بلادکار کہتے ہیں۔ پھر اس کے گلے میں رسی باندھ کر دم گھوٹا گیا۔ لاش واپس لانے کے لئے لال دین کو لانا ضروری تھا۔ لیکن اس میں وقت بہت لگ جاتا اس لئے ڈاکٹر سے ہی درخواست کی اگرچہ یہ اس کا کام نہیں تھا پھر بھی اس نے ہمدردی کے طور پر ہسپتال کے دو اردلی میرے ساتھ کئے۔ تانگوں کے اڈے سے تانگہ لیا کوچوان اس پر ہرگز راضی نہ تھا کہ لاش اس کے تانگے میں جائے۔ شہر کے تھانے میں جا کر مدد مانگی تو ایک اے ایس آئی تلسی داس نے کوچوان کو ڈرایا' دھمکایا جس پر وہ لاش لے جانے پر راضی ہوا۔ لاش لال دین کے گھر لے جانے میں دن ڈھل گیا۔ تھکا ماندہ تھانے آیا تو بلال شاہ کا معلوم کیا۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ کدھر گیا ہے۔ میں نے کرم داد کے گھر کے باہر پہرے کے لئے تھانے کے دو آدمی لگا رکھے تھے اور انہیں ہدایت کردی تھی کہ کرم داد یا اس کا جوائی جمیل دونوں میں سے جو بھی گھر آئے اسے پکڑ کر میرے پاس لے آئیں۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ ایک بار پھر موقع واردات پر چلا جائے۔ میں نے کسی کو ساتھ لینے کے بجائے اکیلے ہی جانے کا ارادہ کیا۔ دن کی روشنی میں اکیلے وہاں جا کر میں زیادہ باریک بینی سے موقع دیکھ سکتا تھا۔ واردات کو مختلف پہلوؤں سے سوچتا ہوا میں اس وقت چونکا جب کھد پر پہنچ چکا تھا۔ کھد میں اُتر کر میں نے اردگرد نظر دوڑائی جس جگہ لاش پڑی تھی وہ میرے ذہن میں تھی۔

میں ذہن میں نقشہ بنانے لگا۔ ظاہر ہے کہ قاتل نے قتل اس جگہ نہیں کیا تھا۔ لاش کے بدن پر مٹی کے نشان نہیں تھے۔ اگر قتل یہاں پر ہوتا تو زمین پر ہاتھا پائی کی وجہ سے کوئی تو نشان ہوتا۔ پیروں کی رگڑ سے زمین کی سطح کی شکل رگڑتی۔ مرنے والی چاہے عورت ہی تھی پھر بھی چڑی کا بچہ بھی مرنے سے پہلے پھڑ پھڑاتا تو ضرور ہے۔ پھر لاش پر سے کپڑے کہاں گئے۔ قاتل نے عورت سے یہاں زبردستی کی

ہوتی تو کپڑے تو یہاں ہوتے جو مجھے نہیں ملے تھے۔ کھڈ میں کھڑے ہو کر ارد گرد نظر دوڑائی تو ایک سیدھ میں کمالے کا ڈیرہ نظر آیا۔ میرا شک پختہ ہو گیا کہ قتل کمالے کے ڈیرے پر ہوا ہے۔ قاتل نے وہاں سے لاش اُٹھائی اور کھڈ میں گرا کر چلا گیا۔ موقع واردات سے کوئی خاص اندازہ نہ ہوا اور میں واپس آ گیا۔ موقع واردات سے کچھ ملا یا نہیں البتہ بلال شاہ تھانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں ہی دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ اس کی حالت اچھی نہیں جیسے مار کھا کر آیا ہو۔ میں نے آتے ہی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''بلالے کہاں تھے؟'' کوئی جواب دینے کے بجائے اس نے سر جھکایا اور اِدھر اُدھر جھٹک کر بولا ''کوئی اچھا نہیں ہوا کمالے کے ڈیرے سے ہو کر آ رہا ہوں۔''

''وہاں کیا لینے گئے تھے!''

''کرم داد کے گھر چھاپے داروں کی ضرورت ہی مجھے نہیں پڑی تھی اگر بلال یہاں ہوتا لیکن وہ تو اس حالت میں میرے سامنے تھا کہ بہت مایوس نظر آتا تھا۔

''جانا کہاں تھا' اس حرامزادے کمالے کے پیچھے تھا۔ اس کے ڈیرے پر چھاپے کے بعد تھانے آ کر آپ نے کرم داد کو لانے کے لئے سپاہی بھیجی تھا اور مجھے گھر جانے کے لئے کہا تھا لیکن آپ جانتے ہیں کہ جس چیز کی مجھے وحشت ہو جائے وہ کر کے ہی چھوڑتا ہوں۔ میں تھانے سے دوبارہ کمالے کے ڈیرے کی طرف گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ اگر زرینہ خود چل کر اس کے ڈیرے پر آئی تھی یا کمالا اسے لایا تھا اور کمرے میں بٹھا کر کسی کام سے باہر نکلا تھا اور واپسی پر چھلاہی کے ساتھ بندھے ہوئے گھوڑے دیکھ کر اس لئے چھپ گیا تھا کہ جانے کون لوگ اس کے ڈیرے میں آ گئے ہیں تو پھر بھی کمالے نے واپس تو آنا ہی تھا۔ میں تھانے سے سیدھا اس کے ڈیرے کے باہر چھلاہی کے اندر پہنچا اور چھپ کر کمالے کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ کمالا کچھ دیر ٹھہر کر ضرور ڈیرے پر آئے گا۔ زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا کمالا کوئی آدھی رات کے وقت کچے کوٹھے کی طرف آیا دروازہ بند تھا جب ہم وہاں سے نکلے تھے تو پیچھے زرینہ ہی رہ گئی تھی۔ اب کمالے کے رُکنے پر دروازہ بند تھا تو اس کا مطلب ہے کہ ہمارے جانے کے بعد زرینہ اپنے گھر گئی نہیں تھی بلکہ کمرے کے اندر ہی رہی اور اس نے دروازہ بھیڑ دیا تھا۔ لگتا ہے بڑی پکی یاری ہے ورنہ کوئی اور عورت ہوتی تو شرم سے وہاں ایک منٹ نہ ٹھہرتی''۔

''اچھا چلو وعظ نہ شروع کر دو۔ آگے بتاؤ۔'' میں بہت بے قرار ہو رہا تھا اور بلال شاہ لیکچر دینے لگا تھا۔ میرے ٹوکنے پر وہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ ''کمالے نے دروازہ کو دھکا دیا اور اندر چلا گیا۔ میں چھلاہی سے نکل کر آگے بڑھا کمالا اندر ہوا اور میں بھاگ کر کمرے کی دیوار کے ساتھ جا لگا۔ پھر احاطے میں گھس کر دروازے سے کان لگا دیئے۔ زرینہ کی تیز تیز سرگوشی جیسی آواز آ رہی تھی۔ کمالا بھی پھولے سانس کے ساتھ بات کر رہا تھا لیکن میرے پلے کچھ نہیں پڑا۔ چند منٹ وہ باتیں کرتے رہے اور میں باہر دروازے سے لگ کر کھڑا رہا پھر کسی کے چلنے کی آواز آئی میں دروازے سے ہٹ گیا۔ کمالے نے سر باہر نکال کر اِدھر اُدھر دیکھا باہر نکلا اور کھڑا ہو گیا۔ پیچھے سے زرینہ نکلی دونوں گاؤں کی طرف چلنے لگے۔ میرا بُرا حال تھا۔ دل تو یہی کہتا تھا کہ کمالے کو پکڑ کر ٹھکائی کروں پر پتہ نہیں آپ کیا کہتے دوسرے یہ بھی تو پتہ کرنا تھا ان کی یاری کے پیچھے بات کیا ہے۔ کمالا بھی کوئی فرشتہ نہیں اور زرینہ بھی جس دھڑلے سے رات کے وقت یار کی کوٹھڑی

میں آگئی وہ بھی کوئی ستی ساوتری نہیں پر پتہ تو چلے کہ جمیل کے ناز نخرے چھوڑ کر کمالے سے یارانہ کیوں ڈال رہی ہے۔''

بلال شاہ کی باتیں ابھی جاری تھیں کہ جن سپاہیوں کو میں نے سادے کپڑوں میں کرم داد کے گھر کے باہر پہرے پر بٹھایا تھا وہ کرم داد کو ساتھ لئے تھانے میں آگئے۔ میں نے دل میں پکا ارادہ کرلیا کہ اس بار کرم داد سے سختی کروں گا۔ میں نے سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ وہ اسے میرے کمرے کی طرف لے چلیں میں بھی ان کے پیچھے پیچھے ہوگیا۔ اندر جاکر میں کرسی پر بیٹھ گیا اور کرم داد کو میز کے ایک طرف کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔

''میں اب تک تمہارا لحاظ کرتا آیا ہوں کرم داد اب معاملہ بہت گمبھیر ہوتا جارہا ہے اور ساتھ ہی تمہاری حرکتیں بھی مشکوک ہوتی گئی ہیں۔ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کمو آخری بار تمہارے گھر گئی تھی اور تم نے یہ جواب دیا تھا کہ میں کام کاج والا بندہ ہوں گھر سے باہر رہتا ہوں تمہاری بیوی نے تمہیں کچھ تو بتایا ہوگا تمہارے گھر کے اندر لڑائی جھگڑا پڑا رہتا تھا تمہارے جوائی کی تمہاری بیٹی سے نہیں بنتی وہ اسے مارتا بھی ہے چھوٹی لڑکی بھی جمیل سے کھچی رہتی ہے۔ کمو تمہاری بیٹی کی سہیلی تھی اب مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ تمہارے جوائی جمیل کا کمالے بدمعاش سے بھی یارانہ ہے۔ جمیل اس کی بیٹھک میں بھی جاتا ہے۔ اب بھی کچھ بولنا ہے یا پھر میں کچھ پکڑ کر بولا تو تمہیں بھی افسوس ہوگا اور مجھے بھی۔''

کرم داد کچھ نہیں بولا صرف سر جھکا دیا۔ اس کی پگ کھل کر اس کے گلے میں لٹک گئی۔ مجھے اس کی بے چارگی پر ترس بھی آیا لیکن میں مجبور تھا۔ اگر سختی نہ کرتا تو کوئی سراغ ملنا مشکل تھا۔ ابھی تو صرف یہی پتہ چلا تھا کہ مرنے والی اس کے گھر گئی پھر اغوا ہوئی قتل ہوئی اس آدمی کے جوائی کا بدمعاش سے یارانہ تھا میں نے کرم داد سے کہا کہ وہ جائے اور اپنے جوائی جمیل کو ساتھ لے کر آئے میں نے تو ابھی تک اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔

کرم داد نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''جمیل تو کل سے غائب ہے۔''

مجھے جھٹکا لگا۔ ''کمالا بھی غائب اور جمیل بھی۔ کیا دونوں نے مل کر قتل کیا ہے اور اب بھاگ گئے ہیں؟''

''زرینہ کہاں ہے؟ وہ بھی ساتھ گئی؟''

کرم داد کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''اولاد بڑی نکل آئی جی پر دل نہیں مانتا کہ کمو کے معاملے میں ان کا کوئی ہاتھ ہے۔''

''تم تو باپ ہو تم نے تو خیر اولاد کا دفاع کرنا ہی ہے۔''

روتے ہوئے کرم داد سے مل سکے یہ ناممکن تھا۔ اسے یہ کہہ کر رخصت کردیا کہ وہ اب گھر سے غائب نہ ہو مجھے اس کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ اگر وہ غائب ہوا تو مجھے اسے شبہ میں حوالات میں رکھنا پڑے گا۔ کرم داد نے ہاتھ جوڑ کے جوڑے سر ہلایا۔ میں نے اسے جانے کے لئے کہا اور باہر بلال شاہ کے پاس آگیا۔

میں نے اب نئے انداز میں تفتیش آگے بڑھانے کا سوچا۔ اس میں بلال شاہ کی گھر والی کا کام زیادہ ہوتا تھا۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ ہر قتل کے پیچھے کوئی نہ کوئی عورت ہوتی ہے خواہ یہ قتل عورت کی وجہ سے ہو یا عورت کا اس میں کوئی ہاتھ ہو یا اس سے کوئی مدد کی ہو کسی نہ کسی شکل میں عورت ہوتی ضرور ہے۔

''بلال شاہ گھر والی سے تعلقات آج کل کیسے ہیں؟'' بلال شاہ گڑبڑا گیا۔

"اچھے ہیں بکا۔ پہلے جو آئی ہے اس لیے کچھ دن تو موڈ اچھا ہی رہے گا۔"

"دیکھ بلالے۔ مجھے شک ہے کہ قتل کا کھرا کرم داد کے گھر سے ہی نکلے گا۔ اپنی گھر والی سے کہو کرم داد کی چھوٹی بیٹی سے کچھ اگلوائے۔" بات بلال شاہ کی سمجھ میں آ گئی وہ اسی وقت اٹھ کر گھر چلا گیا۔

بلال شاہ کی بیوی کو حمیدہ سے (کرم داد کی بیٹی) اتنی زیادہ معلومات نہ مل سکیں جس کی مجھے توقع تھی۔ میں نے کسی اور طریقے سے آگے بڑھنے کے بجائے حمیدہ سے خود پوچھ گچھ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ مجھے انہی دو باتوں کا لحاظ تھا کہ حمیدہ کو تھانے بلایا یا وردی میں اس کے گھر گیا تو گاؤں میں لوگ اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھیں گے۔ پولیس والے خواہ کسی کام سے کسی کے گھر جائیں گاؤں اور محلے والے اس گھر کے بارے میں باتیں بنانے لگتے ہیں۔ لیکن اب میرے پاس کوئی اور طریقہ ہی نہیں رہ گیا تھا۔ رات ہوتے ہی میں سفید کپڑوں میں کرم داد کے گھر پہنچا میرے اس طرح آنے پر وہ بہت حیران بھی ہوا اور پریشان بھی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ کوئی بات نہیں جب وہ خود کوئی بات بتانے پر آمادہ نہیں تو میں خود اس کی بہو اور بیٹی سے کیوں نہ بات کرلوں۔ کرم داد میری اس بات پر زیادہ پریشان ہوگیا۔ مجھے اس کی کوئی فوری وجہ تو سمجھ نہیں آرہی تھی سوائے اس کے کہ اس گھر کی عورتیں گلو کے گم ہوکر قتل ہونے میں ملوث تھیں یا کچھ نہ کچھ اس بارے میں جانتی ضرور تھیں۔ میں نے پہلے زرینہ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ کرم داد سے کہا کہ اسے اندر لے آئے۔ کرم داد یوں سر جھکا کر کھڑا ہوگیا جیسے اس کا جسم بھی ہلکا سا کانپ رہا تھا۔ میری آواز میں سختی آ گئی۔ "کیوں کیا بات ہے کرم داد، زرینہ کو بلاتے کیوں نہیں؟"

[illegible]

اتنی دیر میں ایسے لگا کہ بیٹھک کا دروازہ جیسے تھوڑا سا ہلا ہے پھر کسی نے آہستہ سے دروازہ تھوڑا اور مجھے چادر والے سر کی دو آنکھیں نظر آئیں۔ ایک چھوٹے قد کی لڑکی اندر آ گئی۔ اس نے سفید چادر سے جسم لپیٹ رکھا تھا۔ جو ہلکی کے اندر سے بھی نظر آتا تھا۔ میں نے اس لڑکی کا اندازہ کیا جو گلالے کے ڈیرے میں چارپائی پر پڑی تھی۔ یہ وہ لڑکی تو نہیں تھی یہ کون تھی۔ اتنے میں خود ہی وہ لڑکی ایک دو قدم اٹھا کر کانوں والے موڑھے پر بیٹھ گئی۔ اس کی آواز آہستہ سے نکل رہی تھی "میں حمیدہ ہوں۔" کرم داد کے لئے کھڑے رہنا شاید مشکل ہوگیا تھا وہ پیروں کے بل زمین پر ہی بیٹھ گیا۔ حمیدہ تڑپ کر اٹھی اور باپ کے کندھوں کے پیچھے ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے کا کہنے لگی۔ "بابا حوصلہ کرو ہم کہاں تک گل کل اور بدنامی برداشت کریں گے۔ آج یہ قصہ ختم ہونے دو۔"

میرا دماغ گھوم رہا تھا آخر یہ کیا ہو رہا ہے۔ مجھ سے رہا نہ گیا میں اٹھا اور کرم داد کا بازو پکڑ کر اسے نگین پایوں والی چارپائی پر بٹھا دیا۔ کرم داد کا جیسے سانس چڑھا ہوا تھا۔ ایک دو سیکنڈ بیٹھنے کے بعد ہی وہ اٹھا اور بغیر کچھ کہے بیٹھک سے باہر نکل گیا۔ حمیدہ پھر موڑھے پر بیٹھ گئی۔

"مجھ سے پوچھیں جی کیا پوچھنا ہے۔ زرینہ تو گئی جہاں ایسی لڑکیاں جاتی ہی ہیں۔"

"تم حمیدہ ہو؟"

اس نے سر ہلایا۔ "جی زرینہ کی چھوٹی بہن۔"

"کہاں گئی زرینہ؟"

"جمیل اور وہ دونوں گھر سے چلے گئے جب زرینہ پہلے صبح سے رات تک غائب رہی آدھی رات یا فجر کی اذان سے کچھ پہلے گھر آئی۔ جمیل یہاں ہی تھا۔ دونوں نے آپس میں کوئی بات کی اور اٹھ کر

کھڑی میں کپڑے رکھنے لگے۔ زیور تھا جمیل نے صوکے میں رکھا اور دونوں نکل پڑے۔ میں نے روتے ہوئے کہا کیا بات ہے زرینہ تم اتنی رات گھر سے باہر رہی ہو بابا تمہیں تلاش کرتا پھر رہا ہے [illegible] فکر نہیں کہ تم کہاں تھیں اب آئی ہو تو دونوں پھر جا رہے ہو کیا بات ہے تمہیں کوئی پریشانی تھی [illegible] تمہیں دیکھنے کے لئے ابھی تک [illegible] پر ہی وہ نہیں رکے۔"

"جمیل نے نہیں روکا اسے؟"

"وہ تو بڑی بے غیرت [illegible]....." حمیدہ [illegible] گئی۔ اپنے سر پر ہاتھ رکھ لیا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا [illegible] چھوٹی کو بے غیرت کہہ رہی تھی۔ [illegible] دل میں سوچا [illegible] آئی ہے۔

میں اٹھ کر اس کے قریب [illegible] پوچھ لیا "کیا کہا تم نے جمیل بے غیرت [illegible] کیسے؟"

"بے غیرت ہی ہوا ناں جو آدمی اپنی [illegible] چھوٹی بہن پر نظر رکھے اور پھر اسے کسی کے قابل رہنے بھی نہ دے تو اسے میں کیا کہوں۔"

میں جیسے سوتے سے جاگ گیا۔ کرم داد کے گھر لڑائی جھگڑے کی یہ وجہ تھی۔ مجھے امید نظر آئی کہ اب ملو کی گمشدگی بھی سامنے آ جائے گی۔

حمیدہ پھر بول پڑی۔ "بے غیرت کو بے غیرت کہا جاتا ہے۔ زرینہ میری بہن ہے پر آپ نے بھی [illegible] بہن نے بہن کی عزت خراب کرائی ہو! [illegible] نے میرے ساتھ ایسا ہی کیا ہے۔ میرے [illegible] پریشانی کی وجہ میں نہیں جمیل کا رویہ ہے [illegible] نے کہا ہے کہ دونوں بے غیرت [illegible] پہلے جمیل سارا سارا دن زرینہ کے ساتھ [illegible]

جب وہ کھیتوں سے جلدی [illegible] پر رہا تھا یا [illegible] بہانے جہاں [illegible] یہاں سے چلا جاتا۔"

[illegible] چار [illegible] شاید [illegible] کا موقع [illegible] تھا اور [illegible] بات بھی [illegible] صاف نظر آ رہا تھا [illegible] نے ڈال دیا ہے وہ [illegible] جاتی ہے ورنہ اس [illegible] چھپنے والی ہوتی [illegible]

"پھر کیا ہوا؟" [illegible]

"[illegible] میری بہن اور چھوٹی [illegible] بیٹھا چھوڑ دیا [illegible] پہلے بابا [illegible] بات [illegible] ہوئے بھی مجھے اکیلا چھوڑ [illegible] اور رات گھر سے باہر نہیں رہتا۔ اس دن وہ رات گھر نہیں آئی تھی [illegible] بات کی جب جمیل نے اپنا مقصد پورا کر لیا۔ زرینہ نے اس کا پورا ساتھ دیا۔ بابا صبح گھر آیا تو میں نے پہلے ہی [illegible] پڑی رہی [illegible] بخار کا بہانہ کر لیا۔ [illegible] سادہ لوح [illegible] باپ برداشت نہ کر سکتا اور کوئی الٹی [illegible] بات ہو جاتی تو میرا کیا ٹھکانہ تھا۔"

میں نے دیکھ لیا کہ حمیدہ بہت [illegible] گئی ہے اور اب کوئی بات نہیں چھپائے گی۔

"زرینہ خود کہاں ہے؟"

"[illegible] طرح اس کا خاوند [illegible] سے پہلے بھی میں اسے سمجھاتی [illegible] وہ میری ایک نہ [illegible] گھر میں بیٹھے [illegible] ...

پیچھے باہر نکل جاتی ہے آپس میں جھگڑے بھی ہیں ایک دو مرتبہ تو ان کی آپس کی لڑائی میں مار کٹائی بھی ہوئی ہے جمیل اسے کسی کمالے کا طعنہ مار رہا تھا۔"

کمالے کے نام پر میرے ذہن میں جیسے گھنٹی بج گئی۔ میری آنکھوں کے آگے پھر وہی سین آگیا۔ کمالے کے ڈیرے پر اندھیرے کمرے میں چارپائی پر کھڑی بنی ہوئی لڑکی وہی زرینہ تھی۔

حمیدہ سچ بول رہی تھی۔

"کمالا کون ہے؟" میں نے جان بوجھ کر پوچھا۔ "معلوم نہیں جی۔ میں نے تو لڑائی کے دوران یہ نام جمیل کے منہ سے سنا تھا۔"

میں اب جس بات کے لئے یہاں آیا تھا وہ پوچھنے کا ارادہ کرلیا۔

"کمو یہاں آتی تھی؟"

"ہاں جی! میری تو وہ سہیلی نہیں تھی زرینہ کی سہیلی تھی اور زرینہ اس کے لئے کبھی گوٹے والے پراندے کبھی کانٹے بندے اور کبھی چوڑیاں لاتی تھی جو جمیل لے کر آیا کرتا تھا۔"

"جمیل اور کمو کے درمیان کوئی..." میں بات کرتے کرتے رُک گیا۔

حمیدہ بہت ہوشیار لڑکی تھی۔ گاؤں میں ایسی لڑکیاں کم ہی ہوتی ہیں جو بغیر کسی تعلیم کے اس طرح باہوش اور ہوشیار ہوں۔

"جو آدمی اپنی سالی پر نظر رکھ سکتا ہے وہ بیوی کی سہیلی پر کیوں نہیں رکھ سکتا۔"

میں نے زیادہ دیر حمیدہ کے ساتھ گفتگو مناسب نہ سمجھی کیونکہ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ کمو کا زرینہ کے ساتھ بڑا دوستانہ تھا۔ اب زرینہ سے اقبال کروانا تھا کیونکہ میرے خیال میں اس قتل کی کڑیاں کم از کم مشبہوں کی حد تک تو مل چکی تھیں زرینہ جمیل اور بٹنے کی کھوں کے اندر ہی قتل کا بھید چھپا ہوا تھا۔

اب رہ گیا معاملہ ان تینوں کو تلاش کرنے کا اور تینوں ہی فرار ہو چکے تھے۔ زرینہ اور جمیل اپنے گھر سے اور کمالا اپنے ڈیرے سے۔ میں نے سب سے پہلے کمالے کا کھرا اٹھانے کا سوچا۔ بلال شاہ کو ساتھ لے جانے کے بجائے میں نے خاموشی سے خود ہی کمالے کی بیٹھک کے ساتھ اچار مربعوں والی دکان کے مالک سے جا ہاتھ ملایا۔ وہ مجھے کوئی عام گاہک ہی سمجھا حالانکہ جس دن میں اور بلال شاہ کمالے کے گھر پر چھاپہ مارنے گئے تھے اس دن اچار مربعے والے نے ہمیں دیکھا تو تھا لیکن وردی میں جس آدمی کو دیکھو اسے عام کپڑوں میں پہچاننا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی فوراً ہی اس سے تعارف نہ کرایا۔ میں نے خود کو کمالے کا واقف کار ظاہر کرتے ہوئے اس سے کمالے کا اتا پتہ پوچھا۔ اسے کوئی علم نہ تھا کہ چند روز سے بیٹھک آخر کیوں بند ہے وہ خود بھی حیران تھا۔ اس سے مجھے کام کی اور بات تو معلوم نہ ہو سکی البتہ اسے یہ یاد تھا کہ ایک بار وہ گڑ گاؤں سے اچار کے پیسے لینے گیا تھا کہ وہاں اس نے کمالے کو وہاں کے ایک لکڑی کے سوداگر سکھ تیارو سنگھ کے ساتھ دیکھا تھا۔ تیارو اس اچار والے کا بھی واقف کار تھا اور تانگوں ریڑھوں کے اڈے کے ساتھ ہی تیارو سنگھ کی آڑھت بھی تھی۔ پتہ نہیں اس نے کون کون سی دکان کھول رکھی تھی میں اسی دن گڑ گاؤں جا نکلا۔ کرشن کنہیا یعنی میرے تھانے کا سپاہی کرشن لال اسی قصبے کا رہنے والا تھا۔ اسے ساتھ لانے سے میرا بھی مقصد حل ہو جاتا اور اس کا بھی۔ وہ بھی اپنی گھر والی سے ملنے کے لئے بے چین تھا اور پتہ نہیں بلال شاہ کو کتنے جگ لسی کے پلا چکا تھا کہ وہ اسے چند دن کی چھٹی لے دے۔ کرشن لال کو آڑھت تلاش کرنے میں دیر نہیں لگی تیارو سنگھ جانا پہچانا آدمی تھا۔ آڑھت کے ایک طرف بنی کوٹھڑی

میں جو تپارو کے منشی کے کام آتی تھی زمین پر بچھی دری پر تپارو لیٹا آرام کررہا تھا۔ باہر دھوپ بڑی سخت تھی اور گرمی سے برا حال ہورہا تھا ایک پتلا سا کچے رنگ کا لڑکا چھت پر دو کنڈوں سے بندھے ہوئے جھالر دار کپڑے کی رسی کھینچ رہا تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے اور بہت بعد تک بھی گھروں میں بجلی نہیں ہوتی تھی اور اسی طرح کے پنکھے گھروں میں ہوتے تھے۔ اگر اکیلا آدمی ہوتا تو وہ اس پنکھے کی رسی اپنے پیر کے انگوٹھے میں پھنسا کر ٹانگ ہلاتا اور ہوا لیتا رہتا تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو تپارو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جیب سے عینک نکال کر آنکھوں پر لگائی اور کرشن لال کو گھورنے لگا۔ وہ اسے گاؤں [illegible] پہلے دیکھ چکا تھا۔ پھر اس کی نظر میری طرف [illegible] اس نے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔

"جی بادشاہو۔ کی حکم [illegible]

کاروباری آدمی تھا لیکن بولنے میں [illegible]

"میں امرتسر سے آیا ہوں [illegible]

میں نے مختصر سی بات کی امرتسر [illegible] یہاں چک گیا اور پنجھا چلا [illegible] (بوتلیں لانے کیلئے کہا) [illegible] دیر میں تپارو نے ٹانگیں سمیٹ کر میرے اور کرشن کے بیٹھنے کی جگہ بنائی اور "ہور سناؤ کی حال اے" کی تکرار شروع کی۔ نوکر بنٹے والی بوتلیں لے آیا۔ میں نے آہستہ آہستہ سردار کو کمالے کی طرف لانے کی کوشش کی۔ مجھے یاد نہیں کہ اس سے میری کیا باتیں ہوئی تھیں البتہ اس نے یہ بتایا کہ کمالا اس کے پاس یہاں آیا تھا ایک لڑکی اس کے ساتھ تھی دونوں کو میں نے اسی بیٹھک میں ایک دن رکھا۔ کمالا کچھ دن میرے پاس رہنا چاہتا تھا میں نے اسے پیچھے کرتار پورے بھیج دیا یہاں سے دس بارہ میل ہوگا نہر کے ساتھ ساتھ [illegible]

اب میں نے مناسب سمجھا کہ تپارو پر اپنی اصلیت ظاہر کردوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں انسپکٹر ہوں اور ایک کیس میں مجھے دونوں ہی چاہئیں۔ لڑکی کمالا نکال کر لایا ہے اور لڑکی برآمد کرانی ہے۔ باقی بات میں نے تپارو سنگھ کو نہیں بتائی تھی سکھوں میں لڑکیاں نکال کر لے جانا عام بات ہے اور وہ اسے کوئی [illegible] تصور نہیں کرتے۔ سکھ نوجوان بھوڑے ہوں تو ایسا کرتے ہی رہتے ہیں لیکن پتہ نہیں کیوں تپارو میری مدد کرنے پر راضی ہوگیا۔ میں نے کرشن کو وہ [illegible] کی چھٹی دی [illegible] [illegible] کرشن کی واقفی پر تپارو نے اپنی [illegible] [illegible] کا کہا۔ ٹانگہ تپارو کا اپنا تھا۔ ہم تینوں [illegible] پور کی طرف چل دیئے [illegible] سیدھی نہیں ہوئی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] گاؤں [illegible]

گاؤں کے باہر [illegible] تپارو کی حویلی تو [illegible] ہے تھے یا بھینسوں گھوڑوں کے تھان تھے۔ دروازے کے ساتھ ہی دائیں طرف تین کچے کوٹھے تھے جن کے باہر پکائن کا بڑا سا گھنا درخت تھا۔ درخت کے نیچے چارپائی پر زرینہ بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ نوکروں میں سے کسی کے گھر کی دو عورتیں بھی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی زرینہ بڑی گھبراہٹ میں اٹھ کھڑی ہوئی ایک پیر میں چپل ڈالی اور دوسری گھسیٹتے ہوئے کچے کمرے کی طرف بڑھی میں اس کی طرف بڑھا اتنی دیر میں وہ کمرے کے اندر پہنچ کر دروازہ بند کرنے لگی تھی کہ میں نے دروازے پر پیر دے دیا اور ہاتھ اندر کرکے اسے بازو سے پکڑلیا۔

میں زرینہ کو تھانے لے کر آ گیا۔ اب کرم داد کی گاؤں میں عزت رہتی یا نہیں لال دین کی عزت بھی تو نہیں رہی تھی جس کی جوان بیٹی قتل ہو گئی تھی وراثی کی برہنہ لاش ایک کھنڈ سے ملی تھی۔ اس جوان لڑکی کا خون بھی تو بولتا تھا۔ زرینہ کے ساتھ میں نے اتنی رعایت ضرور کی کہ اسے حوالات میں رکھنے کے بجائے دفتر میں بٹھا دیا اور خود نہا دھو کر تازہ دم ہونے کوارٹر میں چلا گیا۔ کرشن لال میرے ساتھ ہی واپس آیا تھا اور اس بیچارے کو بھی آرام نہیں ملا تھا لہٰذا میں نے اسے جمیل کو لانے کے لئے بھیج دیا۔ ایک گھنٹے بعد میری واپسی ہوئی اور میں نے زرینہ سے سوال کرنے شروع کر دیئے۔ اس کے ساتھ کوئی وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ کچی ذہن لڑکی تھی جیسے میں ایک بار کمالے کے بارے میں اور دوسری بار تمہارے شکو کے گھر سے برآمد کر چکا تھا۔ میں نے جب اس سے بات شروع کی تو بغیر کسی لحاظ کے اور اس نے بھی اپنا بیان دینے میں کسی تکلف سے کام نہیں لیا۔ لگتا تھا اب اسے سمجھ آ گئی تھی کہ مجھ سے چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ زرینہ کا بیان سن کر لگتا تھا کہ میرا جسم سن ہو رہا ہے۔

”مجھے جمیل سے بہت لگاؤ تھا جی۔ میں نے اس کی مار بھی سہی اس کی تلخی ترشی بھی جھیلتی رہی میں اقرار کرتی ہوں کہ جمیل انسان نہیں ایک حیوان ہے اسے بس عورت چاہئے۔ میں نے اس کے لئے یہ بھی کر دیکھا اپنی بہن کو اس حیوان کے حوالے کر دیا۔ اپنی سہیلی اس کی بھینٹ چڑھا دی اس امید میں کہ وہ بیوی مجھے ہی سمجھے گا لیکن ...

اس ذلیل میں شاید انسان والا جذبہ ہے ہی نہیں۔ میں سب کچھ برداشت کر لیتی لیکن جب کمو میری جگہ لینے لگی تو یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ کمو جو کبھی میری سب سے دوست اور اندر سے دشمن ہو چکی تھی۔ اسے زہر دے کر مارنے کا سوچا کرتی پھر مشکل یہ تھی کہ زہر کہاں سے لاتی۔ مجھے ایک بات سوجھ گئی جمیل کی کمالے کے ساتھ یاری تھی مجھے پتہ تھا کہ کمالا جواریا بھی ہے۔ ایسے لوگ وفادار نہیں ہوتے بس مال کے پجاری ہوتے ہیں۔ مال کی شکل پیسے کی ہو یا عورت کی میں اس کے لئے مال بن گئی لیکن مال اسے مجھے حاصل کرنے کے لئے صرف ایک قتل کرنا تھا کمو کا قتل اور یہ اس جیسے بدمعاش کے لئے مشکل کام نہ تھا۔ اس نے مجھے کمو کو ڈیرے پر لانے کیلئے کہا۔ میرے لئے یہ کام کیا مشکل تھا کمو میرے گھر آ گئی اور میں اسے سیر کے بہانے ڈیرے کی طرف لے گئی۔ برسین کے کھیت میں کمالا موجود تھا اس کے آگے وہ ویران علاقہ ہے جہاں آپ دیکھ چکے ہیں۔ کمالے نے کمو کو منہ بند کر کے پرلا دا اس کی چیخ پکار سننے والا کون تھا۔ ایک میں رہی تو وہاں تھی اور خود اسے قتل کرانے وہاں لائی تھی۔ میرے اندر کی عورت کو بدلہ لینے کی خواہش نے دبا دیا تھا۔ ڈیرے پہنچ کر کمالے نے کمو کو ہاتھوں پیروں سے باندھنے کے بجائے کھلا رکھا اور اس رات وہ حیوان بن گیا۔ میں کمو کو ڈیرے پر چھوڑ کر خود گھر آ گئی۔ صبح پھر ڈیرے پر گئی میرا خیال تھا کہ کمالا اپنا کام کر چکا ہو گا لیکن کمو وہاں رسیوں سے بندھی پڑی تھی۔ اس کے جسم پر ایک بھی کپڑا نہیں تھا۔ میں نے اپنی چنی اس پر ڈال دی جب چنی ڈال رہی تھی تو میری نظر اس کی پنڈلیوں پر پڑی۔ کمالے نے دونوں پیروں کی نسیں پیچھے سے کاٹ دی تھیں کہ کہیں لڑکی بھاگ نہ جائے۔ کمو بیہوش تھی مجھے اس پر ترس بھی آیا لیکن میرے ارادے میں کوئی کمی نہ آئی۔ ایک ماہ جمیل اس سے کھیل چکا تھا اور اب کمالا اس سے کھیل رہا تھا۔ میرے وہاں پہنچے کچھ دیر بعد ہی کمالا وہاں آ گیا۔ میں نے اسے اس کا کام پھر یاد

دنیا اور دولت بھی۔ جلدی نہ کی تو ہم دونوں پھنس سکتے ہیں۔ کمالا ٹال مٹول کرنے لگا پھر مان گیا کہ آج رات کام ہوجائے گا۔ اس نے مجھے گھر جانے کے لیے کہا۔ اس کی آنکھوں میں پھر وحشت اتر آئی تھی۔ مجھے رات بھر چین نہ آیا۔ میں صبح ہی صبح اٹھ بیٹھی اور ڈیرے کی طرف چلی۔ آدھے راستے مجھے کمالا نظر آیا۔ اس نے بتایا کہ کام ہوگیا ہے۔ میری جان میں جان آگئی۔ اب مجھے کمالے کا قرض چکانا تھا یہی قرض چکانے گئی تھی کہ آپ نے چھاپہ مارا اور مجھے کمالے کے ڈیرے پر اس کی چارپائی پر بیٹھا دیکھا۔"

میں جیسے کسی گہری کھائی سے باہر نکلا۔ زرینہ کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک عورت اس قدر سنگدل بھی ہوسکتی ہے۔ اس میں دو جذبے ایک ساتھ پیدا ہوجاتے ہیں کہ شوہر کا دل اپنے لیے سب کچھ بن جاتا ہے۔ عورت اپنے جیسی دوسری عورت کی بے غیرتی برداشت نہیں کرسکتی۔ اس نے اپنے آپ کو کسی کے حوالے کرکے قتل بھی کرا سکتی ہے۔

"جمیل کہاں ہے؟"

"کمالے کے ڈیرے سے واپسی پر میں نے جمیل کو ساری بات بتا دی۔ اسے شبہ تھا کہ پولیس ہمارے پیچھے لگ گئی ہے۔ ہم دونوں گھر سے نکلے جمیل کمالے کے ڈیرے پر ٹھہرا کہ پیچھے کی خبر لیتا رہے اور مجھے کمالے کے ساتھ گاؤں بھیج دیا۔ تیارو سنگھ کے پاس اسے بھروسہ تھا کمالے پر۔" وہ مسکرائی۔ "اسے شاید پتہ نہیں تھا کہ کمالے کا اور میرا تعلق کیسا ہوچکا ہے۔ تیارو کے گھر سے آپ مجھے پکڑ کر لے آئے ہیں جمیل یہاں نہیں تو کمالے کے ڈیرے پر ہوگا۔"

زرینہ کے بیان کا یہ حصہ سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ اگر جمیل یہیں کمالے کے ڈیرے پر تھا تو اس ... والے بھی چھوڑے ہوں گے اسے زرینہ کی گرفتاری کا پتہ چل گیا تو وہ فرار ہوجائے گا مجھے تیزی سے کمالے کے ڈیرے پر چھاپہ مارنا چاہیے۔"

میں نے محرر سے زرینہ کا تحریری بیان لینے کی ہدایت کی اور رات پڑنے سے پہلے چھاپے کی تیاری کی۔ بلال نے میرے ساتھ جانا تھا۔ بلال شاہ کھانا کھانے گھر چلا گیا اور جلدی واپس آگیا۔ میں نے تھانے میں ہی کھانا کھایا۔ ہمارے گھوڑے تیار تھے۔ تین سپاہیوں کو سادہ کپڑوں میں پہلے ہی ڈیرے کی طرف بھیج دیا تھا۔ انہوں نے جھاڑیوں کے پاس چھپ کر ہمارا انتظار کرنا تھا۔ عشاء کی اذان کے فوراً بعد ہم گھوڑے لے کر تھانے سے نکلے گاؤں کے باہر سے ہوکر نہر کا کنارہ اور کھیتوں سے ہوتے ہوئے جھاڑیوں کے درمیان کا راستہ پکڑ لیا۔ دیہات میں اس زمانے میں عشاء کی اذان کے بعد بہت ہی کم لوگ گھروں سے باہر نکلتے تھے۔ شام ہوتے ہی کھانا کھا کر موسم کے لحاظ سے صحنوں یا کوٹھوں کے اندر سونے کی تیاری کرنے لگتے۔ یہ رات بھی اسی طرح کی رات تھی۔ گرمیوں کے دن تھے اور ہلکی تیز ہوا چل رہی تھی۔ جھاڑیوں کی جھکی ہوئی زمین کی طرف جھکی شاخوں کے پیچھے تینوں سپاہی دبکے ہوئے تھے۔ ان کے پاس پہنچ کر ہم گھوڑوں سے اترے۔ ایک سپاہی کو گھوڑوں کے پاس چھوڑا اور دو کو ساتھ لے کر ہم چاروں ڈیرے کی طرف بڑھے۔ بہت احتیاط کی ضرورت تھی۔ اتنا کچھ ہوجانے کے بعد جمیل اگر ڈیرے پر تھا تو چوکنا ہوگا۔ گارے کی دیوار سے تھوڑی ہی دور ہمیں احساس ہوگیا کہ جیسے کوئی سایہ دیوار کے دوسری طرف نظر آیا ہو۔ میں چلتے ہوئے رک گیا۔ بلال شاہ اور دونوں سپاہی بھی رک گئے۔

"میرا خیال ہے دیوار کے دوسری طرف کوئی

ہے"۔ نمبر: نے آہستہ سے بلالے سے کہا۔ جو اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک سپاہی کو ایک طرف اور دوسرے کو دوسری طرف سے ڈیرے کے پیچھے کی طرف جانے کے لئے کہا۔ دونوں ایک دوسرے سے مخالف سمت میں مڑ گئے میں اور بلالے ڈیرے کے سامنے کی طرف سے بڑھے۔ دیوار میں داخلے کی جگہ ابھی چند قدم دور تھی کہ دیوار کے پیچھے سے کوئی اٹھا اور راستے میں نکل کر باہر کی طرف آیا میں نے بھی دوڑنے کیلئے چھلانگ لگائی لیکن بلالے مجھ سے پہلے چھلانگ لگا چکا تھا اور دوسرے ہی لمحے میں نے دو آدمیوں کے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے کی آواز کے ساتھ ہائے کی آواز سنی اور بلال شاہ گھوم کر زمین پر گرا جس آدمی سے وہ ٹکرایا تھا اس نے ہاتھ سے کوئی چیز نیچے گرائی اور میرے سامنے سے چکر کاٹ کر تیز رفتاری سے دوڑا۔ اس کا رُخ پھلاہیوں کی طرف تھا۔ میرے پاس وقت نہیں تھا کہ رُک کر بلالے کو دیکھتا میں اس بھاگتے ہوئے آدمی کے پیچھے دوڑ پڑا میں جوانی میں بڑی اچھی صحت والا رہا ہوں اور میری دوڑ بھی کچھ کم نہ تھی لیکن وہ تو چھلاوے کی طرح بھاگ رہا تھا اور پھلاہیوں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ شاید وہ مجھے پیچھے چھوڑ جاتا لیکن پھلاہیوں میں بیٹھا سپاہی بھاگتے پیروں کی دبڑ دبڑ سے ہوشیار ہو گیا تھا اور اس نے اس شخص کو پاس آتے ہی پسلیوں میں زوردار مکا مارا۔ وہ آدمی دہرا ہو گیا اور میں اس کے سر پر تھا۔ بڑی جرأت والا تھا وہ سیدھا ہوتے ہی اس نے مجھے دیکھا اور مجھ پر حملے کے لئے لپکا میں نے غصے پر قابو رکھا۔ بائیں ہاتھ سے سروس ریوالور نکال کر دائیں ہاتھ سے اسے نالی سے پکڑا اور اس کی بھرپور ضرب حملہ آور کے بائیں بازو پر ماری۔ ریوالور بھاری آواز کے ساتھ ٹکرایا اور حملہ آور گھٹی گھٹی چیخ مار کر زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کے سر کے بال مٹھی میں جکڑے اور ریوالور کا ہتھوڑا پھر بلند کیا لیکن اٹھا ہوا ہاتھ وہیں روک لیا۔ حملہ آور اب اٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ پیٹھ کے بل زمین پر بیٹھا اور پہلو کی طرف رُخ کر کے زمین پر لیٹ گیا۔ ریوالور کی ضرب شاید بہت زیادہ تھی۔ میں نے جھک کر چہرہ دیکھا یہ چہرہ میں نے پہلے بھی دیکھا ہوا تھا لال دین کی شکل میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ میرا دماغ گھوم گیا۔ لال دین کمالے کے ڈیرے پر؟ میں نے اسے وہیں زمین پر چھوڑا اور ڈیرے کی طرف واپس بھاگا۔ کچے کوٹھے کے دروازے میں بلال شاہ سر پکڑے زمین پر بیٹھا تھا اس کے پاس ہی اوندھے منہ زمین پر ایک اور آدمی تھا جبکہ سپاہی ایک نوجوان کی ٹھکائی میں مصروف تھے۔ ان کے مکوں اور ٹھڈوں سے وہ بے بس نظر آ رہا تھا اور خاموشی سے مار کھا رہا تھا۔ میں بلالے کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔

"یہ ہے کمالا" اس نے زمین پر اوندھے منہ پڑے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اسے دھکا دے کر سیدھا کیا۔ سپاہی مجھے دیکھتے ہی ہاتھ روک چکے تھے۔ ان میں سے ایک نے اسے گریبان سے پکڑا ہوا تھا۔ میں اٹھ کر ان کے پاس گیا۔ کیا نام ہے تمہارا میں نے وھکتے ہوئے نوجوان سے پوچھا۔ رونے کی آواز کے ساتھ اس کی آواز آ رہی تھی۔

"وجمیل" بلال شاہ اٹھ کھڑا ہوا اس نے کمالے کی پسلیوں میں ٹھوکر ماری۔ کمالا بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے انہیں آگے لگایا اور پھلاہیوں کی طرف چل پڑے۔ لال دین بازو پکڑے زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ بازو پکڑے جھک کر ہمارے ساتھ چلنے لگا۔ سپاہیوں نے گھوڑے پکڑ لئے اور ہم پیدل ہی انہیں لیے تھانے پہنچے۔ جمیل اور کمالے کو حوالات میں بھیج دیا اور لال دین کو

برآمدے میں بٹھایا۔ نصف رات سے دوپہر تک میں انہیں سامنے بٹھائے سوال پوچھتا رہا۔ ان کے ساتھ لال دین کی موجودگی میرے لئے حیرت کا باعث تھی۔

دراصل بعد میں اس نے دائی کو گھر میں بلانا شروع کیا تھا اور وہ تمام کہانی جان گیا تھا۔ لال دین اس رات جمیل کی تلاش میں ڈیرے پر گیا تھا وہاں سے اسے لکڑی کا ڈنڈا مل گیا اور وہ اندر جا کر جمیل کو قتل کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ ہم جا پہنچے۔ وہیں وہ بلال سے ٹکرایا اور نہ جانتے ہوئے کہ ہم پولیس والے ہیں اس نے بلال کے سر پر ڈنڈا مار دیا تھا۔ میرے پستول کی ضرب سے وہ بے بس ہو گیا تھا۔ بہت بدقسمت انسان نظر آ رہا تھا وہ مجھے۔ اس کی بیٹی کی عزت تو جمیل نے برباد کی تھی پر کمالے نے بھی ایسا ہی کیا اور قتل بھی کر دیا۔ میں نے اسے ٹھنڈا کر کے الگ کمرے میں بٹھا دیا۔ اسے کمرے تک سپاہی کے ساتھ بھیجا ورنہ خطرہ تھا کہ بلال شاہ جو اسے مسلسل گھور رہا تھا اپنے ہاتھوں کے ہتھوڑے اس کے سر پر برسا دیتا۔

کمالے کی شکل دیکھنے کا میرا پہلا اتفاق تھا۔ چھٹا ہوا بدمعاش نظر آتا تھا۔ تیارو کے گھر سے جب زرینہ کو میں نے برآمد کر لیا تو اس کا گڑ گاؤں میں ٹھہرنا بے مقصد تھا۔ اسے کمسن پور واپس آ کر اپنے گھر سے جو کچھ بھی لینا تھا لے کر گاؤں سے بھاگنا تھا۔ وہ پہلے اپنے ڈیرے پر پہنچا جہاں زرینہ جمیل کو پیچھے کا خیال رکھنے کے لئے چھوڑ گئی تھی۔ اسی رات ہم نے بھی چھاپے کا فیصلہ کیا ہوا تھا اور لال دین بھی رشتہ دار دائی سے بات سن کر جمیل کے پیچھے ڈیرے پر پہنچ گیا۔ ہمارے چھاپے سے تینوں بے بس ہو کر پکڑے گئے۔ اپنی اس کامیابی پر مجھے بھی بڑی [illegible] بہت بھاگ دوڑ کرنا پڑے گی۔ ایک زخمی روح والی لڑکی نے میرا کام آسان کر دیا تھا۔ اس کے بعد جو کارروائی ہوئی وہ قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث نہیں تینوں کے اقبالی بیان لئے گئے۔ کمالے کے ڈیرے سے وہ چاقو برآمد ہوا جس سے کمو کے پیروں کے پیچھے نسیں کاٹی گئی تھیں۔ گلا گھونٹنے کے لئے استعمال ہونے والا کمالے کا نالہ برآمد کرایا گیا۔ کمالے نے تفصیل بتائی کہ وہ کیسے قتل کر کے لاش کھڈ میں پھینکنے گیا تھا۔ وہ بہت پشیماں تھا کہ ایک عورت کے چکر میں آ کر ایک لڑکی کو قتل کر بیٹھا۔ زرینہ نادم تھی کہ اس نے جس خاوند کے لئے گھناؤنے کام کئے وہ بھی اس کا نہیں بنا تھا۔ جمیل اس بات سے لاعلم تھا کہ اس کی بیوی نے کمالے کو کس قیمت پر اپنے ساتھ ملایا۔ میں نے مقدمے کا چالان بنایا۔ سیشن عدالت میں یہ کیس چلتا رہا اور اس کے بڑے ملزم کمالے کو زرینہ کے وعدہ معاف گواہ بننے کی وجہ سے موت کی سزا سنائی گئی ملزم کو قتل پر آمادہ کرنے پر زرینہ کو بھی سات سال قید ہوئی۔ جمیل پر عورتوں کے ساتھ زیادتی کی حد نافذ ہوئی چونکہ اس کی سالی کی عزت بچانا ضروری تھا اس لئے کوئی گواہی نہ پیش کی گئی اور جمیل بری ہو گیا۔ لیکن چند ماہ بعد ہی اس کا دماغی توازن خراب ہو گیا۔ زرینہ وعدہ معاف گواہ نہ بنتی تو کمالے کے خلاف چالان اتنا مضبوط نہ بن سکتا کہ اس کے جرم کا عینی شاہد کوئی اور تو تھا نہیں۔

لال دین کا گھر تو ایک طرح سے اجڑ گیا تھا کرم داد کی عزت بھی خاک میں مل گئی تھی۔ اس نے اپنی زمین بیچی اور حمیدہ کو لے کر گاؤں سے ہی چلا گیا۔ میں کئی سال امرتسر میں ہی پوسٹ رہا میرے وہاں سے تبادلے کے بعد ہی زرینہ جیل سے رہا ہوئی ہوگی پتہ نہیں اس کا کیا بنا تھا۔

امریکہ خوابوں کی سرزمین

مصنف تو ایک عرصے سے امریکہ

امریکہ کو بہت قریب سے دیکھا ہے

میں اتنا گہرا مشاہدہ بہت کم دیکھنے

واقعات اور حیرت انگیز حقائق



THANKS GIVING کے تہوار

BLACK FRIDAY

سٹور آٹھ بجے آدھی رات تک

ایک نہ ایک قوم کا تصور

اندر جانے کی کوشش میں گر بھی جاتے ہیں

بعض اوقات ایسے موقع پر اموات بھی واقع ہوئی ہیں۔

ان راتوں میں

اور اشتہار بذریعہ ڈاک پہنچ جاتے ہیں۔ پھر ٹی وی، ریڈیو اور انٹرنیٹ پر بھی خوب اشتہار نشر ہوتے ہیں چنانچہ لوگوں میں اپنی پسند کی اشیاء سستے داموں لینے کا ایک جنون سوار ہوتا ہے۔ یہ اشیاء ایک خاص تعداد یا مقدار میں ہوتی ہیں اور سٹورز کے اندر جانے والا ہر شخص سستی خریداری نہیں کر سکتا۔

سوموار کو انٹرنیٹ پر ایسی ہی سیل لگتی ہے اور کافی لوگ نیٹ پر بھی شاپنگ کرتے ہیں۔ کوریئر کمپنیوں کی خوب بن آتی ہے۔ عارضی طور پر اضافی بھرتی شدہ عملہ زیادہ تر چونکہ تجربہ کار نہیں ہوتا۔ یہ لوگ کارٹن اور پیکٹ گھروں کے باہر ہی بغیر گھنٹی بجائے یا اطلاع کئے رکھ کے چلے جاتے ہیں۔ غیر محفوظ علاقوں میں جرائم پیشہ لوگ ان اشیاء کو گھر والوں کے اٹھانے سے پیشتر ہی غائب کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات گھر والوں کو معلوم نہیں ہوتا کہ باہر کوئی پیکٹ یا کارٹن پڑا ہوا ہے۔ موسم کی خرابی یعنی بارش یا برف باری سے سامان خراب بھی ہو جاتا ہے۔

میری بیٹی جو کنساس میں رہتی ہے، اس نے اپنے بڑے بھائی کو نیو ہمپشائر میں CYBER MONDAY کو انٹرنیٹ سے تحفہ خرید کے بھیجا جو ایک بڑے سٹور کو آرڈر کیا گیا تھا۔ سٹور سے یہ تحفہ ایک پیکٹ میں بند کر کے کسی کوریئر کمپنی کے ذریعہ بھیج دیا گیا۔ اس کوریئر کمپنی کے کارندے نے یہ پیکٹ گھر کے باہر سیڑھیوں پر رکھ دیا۔ اسی اثناء میں خوب بارش ہوگئی جس سے یہ پیکٹ اور اس میں رکھے قیمتی کپڑے خراب ہوگئے۔ میرے بیٹے نے شام کو یہ تباہ شدہ پیکٹ دیکھا وہ اسے اٹھا کر نیو ہمپشائر میں اس سٹور کی برانچ میں لے گیا جہاں کافی بحث کے بعد انہوں نے سامان تبدیل کر دیا۔ گو ان دنوں اس طرح FAVOUR کم ہی ہوتی ہے۔

کرسمس کے دنوں میں بھی کافی بڑی سیل لگتی ہے مگر بلیک فرائیڈے یا سائبر منڈے کا مقابلہ نہیں۔

خریدی ہوئی اشیاء واپس کرنے کا بھی بہت رجحان ہے۔ خاص طور پر دیئے گئے تحفے جو لوگ کرسمس کے دنوں میں ایک دوسرے کو دیتے ہیں۔ CHAIN STORES میں سامان واپس کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا، اگر رسید آپ کے پاس ہو اور سامان سیل بند ہو تو سامان واپس ہو جاتا ہے۔ عموماً تحفتاً دیئے گئے سامان کے ساتھ دکان کی ایسی رسید لگائی جاتی ہے جس پر قیمت درج نہیں ہوتی البتہ بار کوڈ ہوتا ہے اور ساتھ ہی GIFT کا لفظ درج ہوتا ہے۔ یہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ یہاں معمول ہے کہ لوگ دیئے گئے تحائف واپس کر کے اپنی پسند کی اشیاء لے لیتے ہیں یا اگر تحائف کپڑوں کی شکل میں ہوں تو سائز کی کمی بیشی کر لی جاتی ہے۔ کچھ لوگ خریدی ہوئی اشیاء استعمال کر کے واپس کر دیتے ہیں گو ایسی اشیاء اصل پیکنگ میں نہیں ہوتیں اور بہت کم قیمت کے TAG کے ساتھ عموماً RETURNED کا لیبل بھی لگا ہوتا ہے۔

لوکل یا چھوٹے سٹور بھی اشیاء واپس نہیں لیتے خاص طور پر اگر پیکنگ کھلی ہوئی ہو یا ان کی رسید نہ ہو۔ اگر لیں گے بھی تو بہت بحث مباحثہ کے بعد۔ کچھ اشیاء پر ناقابل واپسی کا لیبل بھی لگا ہوتا ہے ان میں زیادہ تر الیکٹرونکس یا کاسمیٹکس کی اشیاء ہوتی ہیں۔

عموماً اشیاء کی قیمتیں 99. کے ساتھ لکھتے ہیں یعنی اگر کوئی چیز 2 ڈالر کی ہے تو اس کی قیمت 1.99 ڈالر لکھیں گے۔ پٹرول سے لے کر کھانے کی اشیاء، کپڑے، ادویات وغیرہ سب اشیاء کی قیمت اسی طرح لکھتے ہیں۔ کسی بھی ریٹیل کنٹریکٹ یا خریداری پر سائن اپ کرنا ہو تو شرائط اور تفصیل جو موٹے

حروف میں سامنے ہوتی ہیں، ان کے علاوہ باریک حرفوں میں ایک لمبی عبارت لکھی گئی ہوتی ہے۔ جسے یہ فائن پرنٹ کہتے ہیں۔ یہ بہت سے ایسے معاملات کی تفصیل ہوتی ہے جسے اکثر لوگ پڑھتے نہیں یا یہ سمجھ لیں کہ اس کو پڑھنا مشکل ہوتا ہے۔ ایسی تفصیل کو پڑھے اور جانے بغیر آپ نے معاملات طے کرلئے تو عین ممکن ہے کہ یہ ڈیل آپ کے لئے سودمند نہ ہو۔ بلکہ نقصان دہ ہو۔

ایک چھوٹی سی مثال سے آپ یہ بات سمجھ سکتے ہیں۔ ایک کار ڈیلر کسی کار کا اشتہار کچھ اس طرح سے دے گا۔ لکھا ہوگا، فلاں کار 24 ماہ کیلئے LEASE کریں صرف 99 ڈالر ماہانہ پر۔ اگر آپ نے فائن پرنٹ نہیں پڑھا تو عین ممکن ہے کہ آپ غیر مناسب ڈیل سائن کرلیں۔ لیز کرتے وقت 2999 ڈالر ایڈوانس ورنہ 99 ڈالر کے بجائے 299 ڈالر یا کوئی اور رقم ماہانہ ٹیکس اور دوسرے اخراجات علیحدہ سے ہوں گے۔ کار کا ماڈل سادہ اور بنیادی ہوگا۔ بڑھیا یا بہتر ماڈل کیلئے مزید رقم ماہانہ اضافی ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔

کئی بار بلکہ اکثر مختلف کمپنیوں کے کوپن گھر بذریعہ ڈاک آجاتے ہیں۔ کہ فلاں سٹور سے 50 ڈالر کی شاپنگ کریں تو 10 ڈالر یا 15 ڈالر واپس یا ڈسکاؤنٹ۔ کوپن کے پیچھے فائن پرنٹ پڑھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ڈیل خوشبویات اچھے برانڈ' پہلے سے ڈسکاؤنٹ پر' جیولری' کاسمیٹکس وغیرہ پر اپلائی نہ ہوگی۔ تو بس آپ JUNK خرید لیں رعایت مل جائے گی۔

عوام جادو' بھوت پریت' آسیب وغیرہ پر بہت نہیں تو کافی زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ پراسرایت' سپر نیچرل' خون آشام' ویمپائر' بھوت پریت پر مشتمل ناول' ٹی وی سیریز اور فلمیں بہت مقبول ہوتی ہیں۔

عالیہ بے مثال کامیابی جو ہیری پوٹر کتابوں اور فلموں کو یا لارڈز آف رنگ اور خاص طور پر TWILIGHT سیریز کی فلموں اور کتابوں کی بے انتہا مقبولیت اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں لوگ پراسرایت اور غیرانسانی مخلوقات میں بہت دلچسپی رکھتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ڈریکولا سیریز کی کتابیں اور فلمیں بہت کامیاب رہیں۔ اسی طرح ٹی وی سیریز سپر نیچرل' ویمپائر وغیرہ بہت مقبول ہیں۔ FINAL DESTINATION۔ غیرانسانی یا غیر معمولی کردار بھی بہت مقبول ہیں۔ نہ صرف بچے بلکہ بڑے بھی ان کرداروں پر کتابیں پڑھتے ہیں اور شوق سے ان پر بنی فلمیں دیکھتے ہیں۔ HULK, CAPTAIN AMERICAN, SPIDER MAN, SUPER MAN بہت شوق سے دیکھے اور پڑھتے ہیں۔

اسی طرح ویڈیو گیمز پر بنی فلمیں بہت پسند کی جاتی ہیں جیسے لارا کرافٹ' ہنگر گیمز' MAZE RUNNER وغیرہ کارٹون کردار بھی خوب دیکھے جاتے ہیں۔ گو اب' ٹام اور ہیری یا ڈونلڈ ڈک کا زمانہ نہیں مگر بہت زیادہ نئے کارٹون کردار اب نظر آتے ہیں۔ سائنس فکشن فلمیں تو ہمیشہ یہاں پسند کی جاتی رہی ہیں۔ ان میں خلائی مخلوقات اور خلاء پر بنی فلمیں بھی بہت پسندیدہ رہی ہیں۔

لوگ کھیلوں کے بہت شوقین ہیں' یہاں کا فٹ بال' بیس بال' پھر باسکٹ بال اور آئس ہاکی بہت پسندیدہ کھیل ہیں۔ بیس بال اور فٹ بال زیادہ پاپولر سیریز کے آخری فائنل میچوں میں تو لوگ دیوانے ہوجاتے ہیں۔

مزاج کی تیزی کا یہ عالم ہے کہ نوکری' بابرا' دوستی' رشتے کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتے۔

ایک روز ہماری ایک سیکرٹری لاری جو کافی سینئر ہے اور کام کو خوب سمجھتی ہے ایک دوسری سیکرٹری سے بات کر رہی تھی۔ کہ ان کی سپروائزر اوپر سے آن پہنچی۔ اس نے کہا کہ کام کے وقت باتیں بند کرو۔ کام سے کام رکھو۔ لاری ایک لمحے میں آپے سے باہر ہو گئی اور بولی، میں تو صرف ایک ضروری بات کر رہی تھی تم جو ہر وقت آفس کے کمپیوٹر پر نیٹ پر شاپنگ کرتی رہتی ہو اور دفتر کے اوقات میں لوگوں سے چیٹنگ کرتی رہتی ہو اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔

اتنا کہہ کر اس نے آفس منیجر کو فون ملایا اور کہا کہ ڈورلیس جو سپروائزر ہے، اس نے میرے ساتھ بڑی بدتمیزی کی ہے میں تو کل سے دفتر نہ آؤں گی کام خود ہی سنبھالو۔ بڑی مشکل سے اس کو سمجھا بجھا کر راضی کیا۔

لباس کے بارے میں عام طور پر لاأبالی ہیں۔ نیکر، چپل یا دوسرے گھر کے اندر پہننے والے کپڑے پہنے ہی بازار یا دوسری جگہ پر چلے جاتے ہیں۔ دفتروں میں کچھ خیال رکھتے ہیں۔ صرف رکھ رکھاؤ والے لوگ یا ایگزیکٹیو ٹائی وغیرہ کا اہتمام کرتے ہیں ورنہ یہ لوگ لباس کے بارے میں زیادہ پرواہ نہیں کرتے ہیں۔

بجلی یہاں سستی ہے گو قیمت میں اضافہ پچھلے سالوں سے کچھ ہوا ہے۔ مگر بہت زیادہ نہیں۔ گھر کے زیادہ تر آلات بجلی سے چلتے ہیں جن میں کپڑے دھونے والی مشینیں، کپڑے سکھانے والی مشین، برتن دھونے والی مشین اور اکثر گھروں میں چولہے بھی الیکٹرک ہیں۔ پھر روٹین کی تمام اشیاء یعنی ریفریجریٹر، ٹی وی، کمپیوٹر وغیرہ بھی سب بجلی استعمال کرتے ہیں۔ اس کے باوجود بجلی کا بل لگ بھگ نہیں ٹھہرتا۔ گیس بھی کچھ مہنگی ہوئی ہے مگر زیادہ نہیں۔ بجلی یہاں مختلف ذرائع سے بنتی ہے۔ اس میں ایٹمی بجلی گھر، پن بجلی، کوئلے اور تیل سے پیدا ہونے والی بجلی بھی شامل ہے۔ سولر بجلی بھی موجود ہے گو کم ہے۔ ہمارے نزدیک ہی ایک ایٹمی بجلی گھر ساحل سمندر کے نزدیک ہی بنا ہوا ہے۔ کچھ عرصہ قبل جب جاپان میں سمندری طوفان کے بعد وہاں ایک ایٹمی بجلی گھر تباہ ہوا تھا تو یہاں بھی لوگ کچھ گھبرا گئے تھے اور اخبارات، ٹی وی میں ساحل سمندر پر واقع اس ایٹمی بجلی گھر کی حفاظت کے بارے میں کافی بحث چلتی رہی تھی۔

لوگ چونکہ پرسکون زندگی گزارنے کے عادی ہیں تو معمولی بات پر ہی گھبرا جاتے ہیں۔ سمندری طوفان، شدید برفباری یا بگولا (TWISTER) کی خبر ہو تو لوگ کافی گھبرا جاتے ہیں۔ گراسری اور فوڈ سٹورز میں خوب اودھم مچ جاتا ہے۔ اگر آپ دیر سے وہاں پہنچے تو عموماً انڈے ڈبل روٹی وغیرہ سب ختم ہو چکے ہوتے ہیں۔

اکثر ٹی وی اور ریڈیو پر بھی شدید خراب موسم کی پیش گوئی کے ساتھ تمام احتیاط برتنے کی ہدایات کی جاتی ہیں اور غذا، پانی، دودھ وغیرہ گھر میں چند دن کیلئے سٹور کرنے کا بھی بتایا جاتا ہے۔ زیادہ شدید موسم کی پیش گوئی پر علاقہ کے گورنر یا شہروں کے میئر ٹی وی پر آ کے لوگوں کو پرسکون رہنے کی ہدایت کرتے ہیں اور بچاؤ کیلئے تدابیر کرنے کا بھی کہتے ہیں۔ ایڈمنسٹریشن کو عوام کی سہولیات کا بہت خیال رہتا ہے۔ موبائل فون پر بھی مختلف الرٹ کا بندوبست ہے۔ یہ الرٹ گورنمنٹ کا ادارہ جسے وائرلیس ایمرجنسی الرٹ (W E A) کہتے ہیں۔ لوگوں تک موبائل فون کی کمپنیوں کے ذریعے پہنچاتا ہے۔

ایک روز میں اپنی خاتون خانہ کے ساتھ بازار

جا رہا تھا کہ اچانک موبائل فون سے عجیب سا الارم بجنے لگا۔ میں نے فوراً فون جیب سے نکال کر دیکھا تو اس پر (AMBER ALERT) لکھا آ رہا تھا۔ پھر ساتھ ہی پیغام نشر ہوا کہ ہمارے شہر کے نزدیک ایک بچہ اغوا کیا گیا ہے اور بچے اور اغوا کرنے والے کا حلیہ وغیرہ بیان کیا جا رہا تھا۔ یہ الرٹ کا ایک نام ہوتا ہے جسے بچے کو اغوا کرنے کے پیغام کا نام AMBER ALERT ہے۔ اسی طرح طوفانی بارش' خطرناک سیلاب وغیرہ کے لئے مختلف ناموں کے الرٹ ہیں ان تمام ہدایات کے باوجود اکثر عوام زیادہ گھبرا جاتے ہیں۔ چند سال پہلے شمال مشرق کی چند ریاستوں میں شدید برف باری کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ برفباری طوفان کے شروع ہونے کا اندازاً وقت تین بجے سہ پہر کا بتایا گیا تھا۔ غالباً جمعرات کا دن تھا اور دسمبر کی سترہ یا اٹھارہ تاریخ تھی۔ سکول' دفتر' بازار سب کھلے ہوئے تھے۔ ٹی وی اور ریڈیو پر اعلان کردیا گیا کہ دو بجے تک سب ادارے بند کردیئے جائیں تا کہ لوگ بروقت گھروں میں پہنچ جائیں۔

میں خود اس دن ایک ایسے دفتر میں کام کررہا تھا جو گھر سے تقریباً پچیس تیس میل دور تھا اور گھر پہنچنے کیلئے شہر کی اندرونی سڑکوں کے علاوہ دو ہائی ویز پر جانا پڑتا تھا۔

اتفاق سے برف باری دن کے گیارہ بجے شروع ہوگئی اور بہت تیزی سے ہر طرف دھواں سا چھا گیا۔ لوگ گھبرا کے دفتروں' دکانوں وغیرہ سے نکل پڑے۔ سکولوں میں سے بچوں کو لانے والی بسیں جو عموماً سکولوں میں پارک نہیں کی جاتیں بلکہ ایک خاص پارکنگ لاٹ میں کھڑی ہوتی ہیں ان کے ڈرائیور بھی بسیں لے کر سکولوں کی طرف چل نکلے۔ میں نے بھی جلدی جلدی کام نمٹایا اور تقریباً ساڑھے بارہ ایک بجے کے درمیان دفتر سے باہر نکل آیا۔ باہر پارکنگ لاٹ میں صرف چند ایک گاڑیاں باقی تھیں جن میں میری کار بھی شامل تھی ان پر تین چار انچ برف جمع ہو چکی تھی۔ میں نے جلدی جلدی کار کے شیشے صاف کیے اور سڑک پر جا نکلا۔ برفباری خوب تیزی سے جاری تھی۔

یہاں سرد علاقوں میں ایک بڑی سہولت یہ ہے کہ سرکاری گاڑیاں برف صاف کرنے کیلئے عموماً برفباری سے پہلے ہی نکل پڑتی ہیں۔ عموماً دو یا تین گاڑیاں اکٹھی چلتی ہیں۔ اگلی دو گاڑیاں برف ہٹاتی جاتی ہیں اور پچھلی گاڑی برف پگھلانے والا مواد عموماً کیلشیم کلورائیڈ یا پھر کوئی اور کیمیکل چھڑکتی جاتی ہیں۔ ہائی ویز' بڑی سڑکیں اور سکولوں والی سڑکیں سب سے پہلے صاف کی جاتی ہیں جبکہ اندرون شہر اور چھوٹی سڑکوں کی باری بعد میں آتی ہے۔ اپنے گھر کے سامنے اور ڈرائیو وے پر خود صفائی کرنی پڑتی ہے۔ تھوڑی برف تو بیلچوں سے صاف ہو جاتی ہے۔ برف آپ اٹھا کر سڑک پر نہیں پھینک سکتے یہ جرم ہے۔ برف اپنے لان میں یا ایک طرف ڈھیر کرنا پڑتی ہے اگر زیادہ برف پڑ جائے تو خود صفائی کرنا مشکل ہوتی ہے۔ تو برف صاف کرنے والوں کو بلوانا پڑتا ہے جو ان دنوں خوب کمائی کرتے ہیں اور بڑی مشکل سے ہاتھ آتے ہیں۔ البتہ اگر آپ نے کسی برف صفائی والی کمپنی سے کنٹریکٹ کیا ہوا ہے تو وہ خود ہی آ کر صفائی کر جاتے ہیں۔

ہم جیسے لوگ جو میدانی اور گرم علاقے سے رہنے والے ہیں ان کیلئے ایسا موسم اور ماحول زیادہ خوشگوار نہیں ہوتا البتہ ایسے ماحول میں ڈھلنے کیلئے کچھ وقت لگ جاتا ہے۔ شروع میں مجھے بھی بڑی دقت ہوئی مگر دو تین طوفانی برفباری کے دنوں میں

ڈرائیونگ کر کے اعتماد بحال ہو گیا۔

برفیلی سڑک اور برفباری کے دوران ڈرائیونگ کیلئے بھی مہارت کا ہونا بہت ضروری ہے۔ چند سال پیشتر فلوریڈا کے شمالی علاقہ جات پر کچھ برفباری ہوگئی تو سڑکوں پر کافی حادثے صرف ڈرائیوروں کی برف پہ گاڑی چلانے کی مہارت نہ ہونے کی وجہ سے ہوئے۔ بہت سے ڈرائیور تو گاڑی پر کنٹرول ہی کھو بیٹھے۔ بات آگے نکل گئی۔ میں جونہی اس طوفانی موسم میں نسبتاً بڑی سڑک پر پہنچا تو وہاں گاڑیوں کا ہجوم دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ہر کوئی جلدی نکلنے کے چکر میں خود بھی پھنسا ہوا تھا اور باقی ٹریفک کو پھنسا رکھا تھا۔ سڑک کے درمیان گاڑی بمپر سے بمپر لگائے چیونٹی کی رفتار سے رینگ رہی تھیں۔ کئی گاڑیاں سڑک کے کنارے برف میں پھنسی ہوئی تھیں۔ برف صاف کرنے والی گاڑیاں بھی نظر آئیں مگر وہ بالکل بے بس تھیں کہ برف صاف کرنے کی کوئی جگہ ہی لوگوں نے نہ چھوڑی تھی۔ اس دوران برفباری بھی خوب پڑ رہی تھی، ہر طرف سفید ہی سفید نظر آ رہا تھا۔ کار کے وائپر بھی صحیح کام نہ کر پا رہے تھے۔ ونڈ سکرین اور پچھلی سکرین پر برف جمتی جا رہی تھی۔ روشنی بھی بہت کم ہوگئی تھی اور باہر گہری شام کا سا دھندلکا چھا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے رینگ رینگ کرتے ہوئے چھوٹی ہائی وے پر پہنچے تو وہاں بھی غدر برپا تھا۔ سڑک صاف نہ ہو پا رہی تھی کیونکہ ٹریفک بہت زیادہ تھی۔ برفباری بہت تیزی سے ہو رہی تھی اور مزید برف خاص طور پر سڑک کے دونوں اطراف جمع ہو رہی تھی۔ ہر طرف عجیب سی سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ میں تو اگلی کار کی بتیوں کے پیچھے چل رہا تھا جو بہت مدھم سی نظر آ رہی تھیں۔ اب کئی کاریں سڑک کے دونوں اطراف پھنسی نظر آ رہی تھیں، انہیں دیکھ دیکھ کر دل اور تنگ ہو رہا تھا اور اسے

ونڈ سکرین پوری طرح سے برف سے اٹ چکی تھی۔ میں نے سائیڈ والا شیشہ نیچے کر دیا۔ یخ بستہ ہوا کے ساتھ ساتھ برف بھی کار کے اندر گر رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے کار روک دی اور باہر نکل آیا۔ میرے پیچھے کاروں کی لمبی قطار لگی تھی۔ میرے رُکنے پر لوگوں نے ہارن دینا شروع کر دیئے مگر میں نے سنی ان سنی کر دی اور دونوں ہاتھوں سے ونڈ سکرین کی برف صاف کرنے لگا اتنے میں پچھلی کار کا ڈرائیور بھی اُتر کے آ گیا اور بولا YOU SILLY GOOSE اس طرح تو تم کبھی بھی نہ چل سکو گے۔ ابھی شیشہ صاف کر کے کار کا ہیٹر فل سپیڈ ونڈ سکرین کی طرف چلاؤ اور چلنے سے پہلے وائپر بھی صاف کرو۔ یہ کہتے ہوئے وہ خود بھی میری مدد کرنے لگا۔ کار کی پچھلی سیٹ سے برف صاف کرنے والا وائپر اٹھایا اور کار کا پچھلا شیشہ صاف کرنے لگا۔ برفباری اس تیزی سے ہو رہی تھی کہ برف فوراً شیشوں پر جمع ہو رہی تھی۔ اس دوران میں نے کار کا ہیٹر فل سپیڈ ونڈ سکرین کی طرف کر کے چلا دیا تھا اور پچھلی سکرین کا ہیٹر بھی۔ وہ شخص دوڑ کر اپنی کار میں جا بیٹھا۔ میں نے بھی کار آہستہ آہستہ چلانا شروع کر دی۔ ونڈ سکرین کافی بہتر ہوگئی تھی گو گرم ہوا پوری طرح منہ پر پڑ رہی تھی اور اس کے نتیجے میں آنکھیں تک خشک ہوگئی تھیں۔ خدا خدا کر کے دو میل کا فاصلہ ایک گھنٹہ میں طے ہوا تو بڑی ہائی وے پر آ گئے۔ ادھر حالات نسبتاً بہتر تھے۔ یعنی سڑکوں کی ایک لین صاف کر دی گئی تھی۔ ٹریفک اب بھی بالکل صفر کی رفتار سے چل رہی تھی۔ راستے میں کئی لوگ سڑک کے کنارے کار کھڑی کر کے ذرا اوٹ لیکر مثانہ خالی کرنے میں مصروف تھے۔ یہ کام صرف مرد حضرات ہی کر سکتے تھے۔ اگلے روز دفتر میں ہماری ایک نرس نے بتایا کہ وہ ٹریفک میں جام

گھنٹے پھنسے رہنے کے باعث ایک شاپنگ بیگ میں مثانہ خالی کرسکی تھی۔ میں گھر تقریباً پانچ گھنٹے میں پہنچا۔ حالانکہ عام حالات میں راستہ تیں پینتیس منٹ کا ہے۔ میری خاتون خانہ برف صاف کرنے کا بیلچہ لئے ڈرائیو وے صاف کررہی تھی۔ ہمارے گھر کا ڈرائیو وے معمولی چڑھائی پر ہے لیکن اس کو صاف کئے بغیر کار اوپر گیراج تک نہیں جاسکتی۔ ایسے موسم میں برف صاف کرنے والوں کی خوب چاندنی ہوجاتی ہے۔

اس برفانی طوفان میں سکولوں کے بچے کئی جگہ تو رات گیارہ بجے تک گھروں میں نہ پہنچ سکے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ٹریفک کا نظام درہم برہم ہونے سے سکول بسیں سکولوں میں بڑی دقت اور دیر سے پہنچیں۔

بات بجلی کے سستے ہونے سے چلی تھی، پچھلے دنوں ایک خط ہمیں بجلی اور گیس کمپنی کی طرف سے ملا اس میں ہماری تعریف کی گئی تھی۔ انہوں نے لکھا تھا کہ آپ کے گھر میں آپ کے تمام ہمسایوں سے کم بجلی اور گیس استعمال کی گئی ہے۔ اس کا انہوں نے شکریہ بھی ادا کیا تھا۔ (اصل میں گھر میں ہم دو میاں بیوی ہی ہوتے ہیں، بچے اپنے اپنے گھروں میں جاچکے، تو بجلی اور گیس کم خرچ ہونے میں ہمارا کوئی کمال نہ تھا)۔

پٹرول کی قیمت گزشتہ بارہ پندرہ سالوں میں بتدریج بڑھتی رہی ہے۔ چند بڑے شہروں کو چھوڑ کر جہاں پبلک ٹرانسپورٹ کی کافی سہولت ہے یہاں کار کے بغیر گزارا نہیں ہوسکتا فاصلے بہت زیادہ ہیں۔ گو ان دنوں کچھ عالمی وجوہات کی بنا پر پٹرول کی قیمت بہت کم ہوگئی ہے۔ پٹرول جو تقریباً چار ڈالر گیلن کے قریب ہوگیا تھا اب دو ڈالر گیلن تک آ پہنچا ہے۔

[illegible] سے عوام کو بہت ریلیف ملا ہے۔

کار لینا یہاں دشوار نہیں۔ سبھی لوگ اقساط پر کار خریدتے ہیں یا پھر LEASE کرتے ہیں۔ دنیا کی ہر کمپنی کی کار موجود ہے۔ جاپانی اور کورین برانڈ کاریں اب زیادہ تر امریکہ میں ہی بنتی ہیں اور خوب پسند کی جاتی ہیں جبکہ امریکن کاروں کے کارخانے زیادہ تر کینیڈا، برازیل اور میکسیکو میں ہیں اور یہ کاریں معیار میں جاپانی اور جرمن کاروں سے کم تر ہیں۔ البتہ ہائر اینڈ کی امریکن کاریں اچھی ہیں۔ یعنی کیڈلک اور لنکن کاروں کے اچھے ماڈل تیار کرتے ہیں گو ان برانڈ کی کاریں کافی مہنگی ہوتی ہیں۔ جرمن کاروں میں مرسیڈیز بی ایم ڈبلیو اور آؤڈی بہت مقبول ہیں۔ ہائر اینڈ کی جاپانی کاریں انفینٹی لیکسس اور آکیورا ہیں۔

عام استعمال کیلئے ٹیوٹا، نسان اور ہنڈا کی کاریں پسند کی جاتی ہیں۔ ٹیوٹا کی ایولان، کیمری اور نسان کی میکسیما، الٹما اور ہنڈا کی اکارڈ، کورین کاروں میں ہنڈائی کی سوناٹا اور کیا کی آپٹما (ویسے اب دونوں کمپنیاں ایک ہی ہوچکی ہیں اور ایک ہی مینجمنٹ ان کو چلا رہی ہے)۔

سپر لگژری کاروں میں بینٹلے، رولز رائس اور سپورٹس میں پورش، فراری وغیرہ بھی نظر آتی ہیں۔

لوگ نامیاتی خوراک اور غذا یعنی ORGANIC FOOD کا بھی بہت شوق رکھتے ہیں۔ کئی چین سٹور میں جیسے WHOLE FOOD یا TRADER JOES یہاں اشیاء کافی مہنگی ہوتی ہیں لیکن ان جگہوں پر خوب رش ہوتا ہے۔ نامیاتی فوڈ والے دعویٰ رکھتے ہیں کہ ان کے ہاں ملنے والی اشیاء بغیر کھاد اور کیمیکل استعمال کے اگائی یا تیار کی جاتی ہیں۔ آرگینک انڈے بھی ملتے ہیں۔ پوچھنے پر بتایا گیا کہ جن مرغیوں نے یہ انڈے دیئے ان کو نامیاتی خوراک کھانے کو دی جاتی ہے۔

معذور یا نیم معذور لوگوں کے لئے بہت سہولیات ہیں۔ عام لوگ بھی ان کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ پارکنگ میں معذور لوگوں کیلئے جگہ مخصوص کی جاتی ہے جو بلڈنگ کے دروازے کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ گاڑی میں ایک کارڈ جو ایسے لوگوں کے لئے مخصوص ہے کسی جگہ لٹکا ہونا ضروری ہے جو باہر سے صاف نظر آسکے۔ معذور افراد عموماً دوسروں پر بوجھ بننا پسند نہیں کرتے اور کوشش کرتے ہیں کہ زیادہ تر کام خود کرسکیں ان کے لئے سپیشل کاریں، سکوٹر اور دوسرے آلات میسر ہیں۔

ایک مرتبہ میری کمر میں تکلیف ہوگئی MRI کرانے سے معلوم ہوا کہ ریڑھ کی ہڈی کی ایک DISC اپنی جگہ سے ہل کر ٹانگ کو جانے والی نس کو PINCH کر رہی ہے۔ درد اس قدر تھا کہ چند قدم چلنا بھی دشوار ہوگیا۔ میں چھڑی کی مدد سے چلتا۔ اس دوران مجھے اپنی بیٹی کے پاس کنساس جانا پڑا۔ ڈاکٹر کی اجازت سے میں چلا گیا۔ وہاں بھی فزیکل تھراپی ہوتی رہی۔ واپسی پر تکلیف اور بڑھ چکی تھی۔ میں نے فون پر ایئر لائن والوں کو اطلاع کی کہ مجھے وہیل چیئر کی سہولت دی جائے۔ جب میرا داماد مجھے ایئرپورٹ پر چھوڑنے گیا تو وہاں ایک خاتون وہیل چیئر لئے ایئر لائن کے دفتر کے باہر میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے مجھے وہیل چیئر پر بٹھایا اور چیک ان کاؤنٹر کی طرف لے گئی۔ وہاں ایک لمبی قطار لگی تھی۔ مجھے اس قطار میں انتظار کرانے کے بجائے وہ خاتون دوسرے کاؤنٹر پر لے گئی اس طرح میرا چیک ان پہلے ہوگیا۔ جب جہاز میں سوار ہونے کا مرحلہ آیا تو اعلان کیا گیا کہ HANDICAP لوگ سب سے پہلے جہاز کے اندر داخل ہوں گے۔ اس طرح چند لوگوں کے ہمراہ میں جہاز میں باقی لوگوں سے پہلے داخل ہوا۔ راستے میں واشنگٹن کے ہوائی اڈے پر جہاز تبدیل کرنا تھا۔ دونوں جہازوں کی پروازوں کے درمیان وقفہ بہت تھوڑا تھا۔ جب جہاز واشنگٹن اترا تو وہاں بھی وہیل چیئر پر ایک خاصی فربہ خاتون میرا انتظار کر رہی تھی۔ باقی مسافر تو ایک گیٹ سے نکل کر نزدیک ہی دوسرے گیٹ میں داخل ہوگئے۔ مجھے وہیل چیئر میں ہونے کی وجہ سے دوبارہ چیک ان کرانا پڑا۔ اس دوران اگلے جہاز کی پرواز کا وقت ہوگیا۔ وہیل چیئر والی خاتون نے جب وقت دیکھا تو جلدی سے ایئر لائنز کے کاؤنٹر پر پہنچی۔ مجھے ایک طرف کرکے اس نے وہاں کے سٹاف سے کہا کہ اس مسافر کو اسی پرواز سے جانا ہے جس کے تمام مسافر جہاز میں بیٹھ چکے تھے اور مجھے کم از کم دس منٹ اور چاہئیں تھے جہاز تک پہنچنے میں۔

کاؤنٹر پر کھڑے شخص نے فوراً جہاز کے پائلٹ کو فون کیا کہ ایک مسافر جو وہیل چیئر کی وجہ سے دیر سے آرہا ہے اس کا انتظار کیا جائے۔ سو جب ہم جہاز کے گیٹ تک پہنچے تو جہاز صرف میرے انتظار میں ٹھہرا ہوا تھا۔ جونہی میں اپنی سیٹ پر بیٹھا جہاز پرواز کیلئے چل پڑا۔ سرد علاقوں میں جب موسم ٹھنڈا ہوتا ہے تو شاپنگ مال صبح چھ سے سات بجے کے دوران کھول دیئے جاتے ہیں تاکہ لوگ سیر کیلئے ان ڈور میں آسکیں۔ گو اس دوران دکانیں بند ہی رہتی ہیں البتہ فوڈ کورٹ کھول لئے جاتے ہیں تاکہ لوگ چلنے پھرنے کے بعد کافی اور ناشتہ لے سکیں۔ اکثر عمر رسیدہ لوگ سیر کے بعد دوستوں کے ساتھ بیٹھے گپیں لگاتے نظر آتے ہیں۔

لوگ گالف کے بہت شوقین ہیں خاص طور پر نارتھ ایسٹ کے علاقوں میں جگہ جگہ گالف کورس نظر آتے ہیں۔ اچھے کلب کافی زیادہ مہنگے ہیں کئی ایک تو سٹیٹس سمبل سمجھے جاتے ہیں۔ سپورٹس سے زیادہ یہ

کلب سوشلائزیشن کا ذریعہ بنے رہتے ہیں۔ ایسے کلب کے نزدیک کی پراپرٹی عموماً کافی مہنگی ہوتی ہے۔ اور پوش ایریا میں شمار ہوتی ہے۔ ان کلب کے ساتھ یا اندر ہی مین بلڈنگ میں بار اور ریستوران بھی ہوتے ہیں جو شام کے بعد خاصی دیر تک کھلے رہتے ہیں۔ کئی کلب فنکشن ہال اور پارٹیاں بھی ارینج کرتے ہیں اچھے کلب میں پارٹی' سیمینار وغیرہ کرنا بھی ایک سٹیٹس سمبل ہوتا ہے۔

لان اور یارڈ کو سجانے اور پھول لگانے کے بھی بہت شوقین ہیں۔ جونہی بہار کا موسم آتا ہے یہ لوگ بھی گھروں کے باہر لان سجانا شروع کر دیتے ہیں۔ نرسریاں لوگوں سے بھری نظر آتی ہیں۔ طرح طرح کے پھول اور پودے' سستے' مہنگے ہر قسم کے ہوتے ہیں۔ لوگ اپنی پسند کی خریداری کرتے نظر آتے ہیں۔ گھاس بھی بہت قسم کی ملتی ہے۔ SOD کی صورت میں یعنی 2x5 کا گھاس کا اُگا ہوا قطعہ' طرح طرح کے گھاس کے بیج اور بہت اقسام کی کھادیں دستیاب ہیں۔ زیادہ تر لوگ گھاس خود کاٹتے ہیں جو خود کار مشینوں کے باوجود محنت طلب کام ہے۔ عمر رسیدہ لوگ یا وہ لوگ جو وقت کی کمی کے باعث خود گھاس نہیں کاٹ سکتے وہ کسی کمپنی سے رابطہ کر لیتے ہیں۔ جو ہر ہفتہ گھاس کی ٹرمنگ کر دیتے ہیں۔ اکثر کمپنی کھاد اور کیڑے مار ادویات بھی ڈال دیتی ہیں گو وہ خاصی مہنگی ہوتی ہیں۔ کافی لوگ گھروں کے ایک طرف سبزیاں یا پھل بھی اگاتے ہیں۔ میں خود بھی لان کے ایک طرف ٹماٹر' کھیرے' شملہ مرچ وغیرہ اُگاتا ہوں۔ کئی بار تو اشیاء اس قدر بہتات میں اُگتی ہیں کہ تمام ہمسایوں کو دینے کے بعد بھی سنبھالی نہیں جاتیں۔

گھاس اگر خود کاٹ رہے ہیں تو اس کا DISPOSAL بھی اپنے ہی ذمہ ہوتا ہے۔ بازار میں کاغذ کے بڑے بڑے تھیلے گھاس اور پتے وغیرہ ڈالنے کیلئے ملتے ہیں جو بھر کے گھر سے باہر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ ہفتہ میں ایک بار سرکاری گاڑی ان کو اٹھا کر لے جاتی ہے۔

خزاں میں درختوں سے پتے خوب گرتے ہیں ان کو اکٹھا کرنا اور تلف کرنا بھی ایک کاروارد ہے۔ اگر آپ خود کر رہے ہیں تو BLOWER سے پتے اڑا کر ایک طرف اکٹھے کر لئے جاتے ہیں ساتھ ریکنگ بھی کرنا پڑتی ہے۔ جب ان کا ڈھیر لگ جاتا ہے تو کاغذ کے بڑے تھیلوں میں ڈال کر باہر رکھ دیا جاتا ہے اگر کوئی کمپنی گھاس وغیرہ کاٹتی ہے تو پتے صاف کرنے کا کام بھی وہی کرتے ہیں لیکن اس کے لئے مزید خرچہ کرنا پڑتا ہے۔

کوڑا اٹھانے کا نظام بھی خوب ہے کئی ٹاؤن تو بڑے کنٹینر گھروں کو مفت سپلائی کرتے ہیں ورنہ بازار سے بڑے بڑے TRASH BIN عام مل جاتے ہیں عموماً انہیں گھر کے گیراج میں یا باہر ایک طرف رکھ کر بھرتے رہتے ہیں۔ ہفتے میں ایک یا دو بار سرکاری ٹرک آ کر انہیں خالی کر جاتا ہے۔ جس دن ٹرک نے آنا ہوتا ہے یہ ڈرم گھر سے باہر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ RECYCLE ہونے والی چیزیں کوڑے میں نہیں ڈالتے جیسے پلاسٹک اور شیشے کی بوتلیں اور دوسری اشیاء انہیں سرکاری طور پر دیئے گئے نیلے BIN میں رکھتے ہیں جسے ایک دوسرا ٹرک خالی کر کے جاتا ہے۔

ہر شہر کے ساتھ بڑے بڑے پانی کے ذخائر

ے ہوئے ہیں جن میں پانی مختلف ذرائع سے اکٹھا ہوتا رہتا ہے۔ زیادہ تر بارش کا یہ پانی بڑے بڑے پلانٹ کے ذریعہ صاف کر کے گھروں کو سپلائی کیا جاتا ہے اس صاف شدہ پانی کا باقاعدگی سے لیبارٹری سے تجزیہ ہوتا رہتا ہے اگر بارشیں کم ہوں تو لوگوں کو پانی ضائع کرنے سے اور بچانے کیلئے اطلاع کی جاتی ہے۔

زمین کی نمی برقرار رکھنے کے لئے عموماً گھروں کا ایک پرنالہ زمین میں اندر تک ڈال دیا جاتا ہے۔

فلم اور میوزک کے بہت شوقین ہیں سینما ہال بھرے رہتے ہیں خاص طور پر نئی فلم لگی ہو تو کافی رش ہوتا ہے۔ اچھی فلمیں خوب چلتی ہیں۔ موسیقی کے دلدادہ ہیں۔ ہر قسم کی موسیقی سنتے ہیں۔ لائیو موسیقی کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اچھے موسیقاروں یا گلوکاروں کے شو کے ٹکٹ کئی کئی ماہ پہلے بک جاتے ہیں۔ گلوکار سچ مچ لائیو گاتے ہیں ہمارے ہاں کی طرح پیچھے ٹیپ ریکارڈ یا سی ڈی لگا کر باہر منہ نہیں ہلاتے رہتے۔

لاٹری کا بہت زور ہے۔ گراسری سٹورز پر لاٹری کا بندوبست نہ ہو تو سمجھیں وہ دکان کامیاب نہیں۔ اس کی بکری بھی کم ہوگی۔ بڑے بڑے لاٹری کے ٹکٹ جن کا انعام کئی کئی ملین ہوتا ہے بہت مقبول ہیں جیسے POWER BALL اور میگا ملین۔ یہ لاٹریاں حکومت کے زیر سرپرستی کھیلی جاتی ہیں ان میں کئی کئی ریاستیں حصہ ڈالتی ہیں۔ ان کی ٹکٹیں ہر جگہ بکتی ہیں۔ انعام میں بڑی رقم انکم ٹیکس اور ریاست کے حصے کے طور پر علیحدہ کر لی جاتی ہے۔

بار اور pub جگہ جگہ کھلے ہیں اکثر ریستورانوں کے ساتھ بار بھی بنی ہوتی ہے۔ ٹی وی چینل زیادہ تر لوکل خبریں دکھاتے ہیں۔ ABC' NBC' FOX وغیرہ سب کے لوکل سٹیشن ہوتے ہیں کئی چینل البتہ عالمی خبروں کے بھی ہوتے ہیں۔

امریکہ کے بارے میں کچھ مزید چھوٹی چھوٹی نوٹ کرنے والی چیزیں ہیں

جگہ جگہ ڈے کیئر سنٹر کھلے ہیں جہاں چھوٹے چھوٹے بچے والدین نگہداشت کیلئے چھوڑ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ میں عموماً ماں اور باپ دونوں ملازمت کرتے ہیں اور فیملی سسٹم مختلف ہونے کی وجہ سے بزرگ عموماً ساتھ نہیں رہتے۔ اس لئے بچوں کی دیکھ بھال کیلئے یہ ادارے کھلے ہوئے ہیں۔ جو چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال اور نگہداشت کرتے ہیں اور ان کے کھانے پینے کا بندوبست بھی۔ یہ ادارے عموماً خاصے مہنگے ہوتے ہیں اگر چھوٹا بچہ کبھی کبھار اکیلا چھوڑنا ہو تو جیسے میں نے پہلے بتایا کہ BABY SITTER کا انتظام کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

گھر عموماً کسی باڑ FENCE کے بغیر ہوتے ہیں لیکن لوگ ایک دوسرے کی پراپرٹی میں دخل نہیں دیتے۔ کچھ لوگ باڑ وغیرہ لگا لیتے ہیں مگر کم لوگ ہی FENCE لگاتے ہیں جو عموماً لکڑی کی یا پلاسٹک جیسے میٹریل کی بنی ہوتی ہیں۔ یہ ٹاؤن کے قانون کے مطابق لگائی جاسکتی ہیں۔

اس مختصر تحریر میں امریکی معاشرے اور لوگوں کے رہن سہن کا مکمل احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ بہت سے پہلو اور بھی ہیں جو تفصیل طلب ہیں ان سب کو بیان کرنے کیلئے کافی صفحات کی ضرورت ہے، جو آئندہ بھی تحریر کروں گا۔ انشاء اللہ۔

[illegible]

آدھی محفل

بیٹے والوں کے ہاں سے اس کے لئے سونے کی انگوٹھی بھی آ گئی تھی اور اب شادی کی تاریخ طے کرنے کے لئے خط و کتابت ہو رہی تھی مگر سونا بدستور خوف زدہ تھی اسے یہ مسئلہ ریت کی ایک دیوار نظر آ رہا تھا اور شادی کی تیاریوں کے ساتھ ساتھ اس کی گھبراہٹ برابر بڑھتی جا رہی تھی وہ اپنے آپ کو صلیب پر چڑھا ہوا محسوس کرتی۔

ایک لڑکی کی کہانی، احساس کمتری کی وجہ سے اس نے اچھا سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا



بینڈ باجے والے جوکروں کی سی وردیوں میں ملبوس کوٹھی کے برآمدے میں اکتائے ہوئے بیٹھے بیڑیاں پی رہے تھے۔ ان کی نفیری اور شہنائیاں دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ایک قطار میں پڑی تھیں۔ بینڈ ماسٹر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد شاید گھر والوں کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لئے اپنے نقارے پر ایک ہلکی سی چوٹ لگا دیتا تھا مگر اندر تو دعوت ابھی پورے جوبن پر تھی۔ مہمان ڈٹ کر کھا رہے تھے اور ان کی پلیٹیں بار بار مٹھائیوں سے بھر دی جاتی تھیں اور ہر مہمان سے تھوڑا سا اور کھا لینے کے لئے بار بار اصرار کیا جا رہا تھا۔ جیسے دعوت نہیں کھانے کھلانے کی کوئی جنگ ہو رہی ہو۔ مٹھائیوں کے علاوہ سب کے سامنے گرم گرم دودھ کے گلاس بھی بھرے رکھے تھے وہ بھی ابھی ان سب کو پینے تھے۔ ریت ہی ایسی تھی۔ لڑکے کا بڑا بھائی

اور چچا دونوں گلابی رنگ میں نہائے بیٹھے تھے۔ باقی مہمانوں پر بھی گلابی رنگ بڑی فراخ دلی سے چھڑکا گیا تھا۔ خاطر و مدارات کے ساتھ ساتھ ان سب سے مذاق بھی ہو رہا تھا۔ چنانچہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کسی برجستہ فقرے پر صحن کی فضا قہقہوں سے گونج اٹھتی تھی۔

سوما اپنے کمرے میں بیٹھی کھڑکی کی جالی سے یہ سب تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ والے کمرے میں مٹھائیوں اور خشک میووں سے بھرے ہوئے چالیس تھال رنگ برنگ کاغذوں سے ڈھکے تخت پر رکھے تھے ادھر ایک کونے میں تپائی پر پڑا ہوا اکتالیسواں تھال کرنسی نوٹوں سے لدا رہا تھا۔ نئے نوٹوں کے تین بنڈل اس میں بڑے قرینے سے دھرے تھے۔ اس کا چھوٹا بھائی مدن ابھی منڈی سے پھلوں کے ٹوکرے لے کر نہیں لوٹا تھا۔ اس کے آنے پر ہی اس کا شگن یہاں سے روانہ ہوتا تھا۔

سوما کے لئے یہ تماشا نیا نہیں تھا ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔ کتنی ہی دفعہ اس کی منگنی کا جلوس اسی طرح شان و شوکت سے نکالا گیا تھا لیکن یہ بیل ابھی تک منڈھے نہیں چڑھ سکی تھی جیسے ہی اس کی شکل و صورت کے بارے میں کچھ چرچا ہونے لگتا منگنی کا شگن واپس آ جاتا۔ سوما کی زندگی کا یہ سب سے بڑا المیہ تھا کہ وہ بدصورت تھی بھدے نقوش اور گہرے سانولے رنگ والی یہ لڑکی اپنے خوبصورت دل اور روشن دماغ کے باوجود ابھی تک کسی کو پسند نہیں آئی تھی۔ اول تو لڑکے والے اسے دیکھتے ہی رشتے سے کنی کترا جاتے یا پھر اگر کسی جگہ اس کی بدصورتی کی طرف سے آنکھیں بند کروا کر یا اپنی امارت کے بل بوتے پر اس کا رشتہ کر بھی دیا جاتا تو بھید کھلتے ہی اس کی سسرال میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا لڑکا باغی ہو کر گھر سے بھاگ نکلتا اور رشتہ ٹوٹ جاتا۔ ایسا تین بار ہو چکا تھا۔ اس کا باپ اچھا کھاتا پیتا اور حوصلہ مند آدمی تھا۔ اس نے ہر چند اسے سونے اور چاندی میں مڑھ کر دینا چاہا مگر اس پر بھی سب کو یہ سودا گھاٹے کا معلوم ہوا۔ خوبصورتی کی اپنی جو ایک الگ قیمت ہے وہ کسی طرح بھی مال و زر سے چکائی نہ جا سکی۔ اس لئے پچیس سال کی ہو چکنے پر بھی سوما ابھی تک بن بیاہی تھی۔ وہ پہاڑ گنج کے ایک پرائیویٹ گرلز ہائی سکول میں سکول مسٹریس بن کر اپنی جوانی کاٹ رہی تھی۔ مہینے کی اچھی خاصی تنخواہ پاتی تھی اور اپنے والدین پر کسی طرح کا بوجھ نہیں تھی لیکن اس کی شادی کر دینا تو ان کا ایک سماجی اور اخلاقی فرض تھا۔ وہ اس سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ اس لئے اس سلسلے میں سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔ اس نئے رشتے کی بات ابھی پچھلے ہفتے ہی ان کے گھر میں چلی تھی۔ لڑکے کی دونوں بھاوجیں شگن سے پہلے اسے آ کر دیکھ بھی گئی تھیں اس کے باوجود ان کی طرف سے ہاں ہو گئی تھی اور آج دھوم دھام سے اس کی منگنی کا شگن دیا جا رہا تھا۔

سوما حیران تھی کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ اسے دیکھ لینے کے بعد بھی ان لوگوں نے ہاں کیوں کر دی؟ کہیں وہ بھاوجیں ہی تو گھر میں اپنی برتری قائم رکھنے کے لئے اسے اپنے چھوٹے دیور کے سر نہیں منڈھ رہیں؟ ممکن ہے انہوں نے گھر جا کر اس کی جھوٹی تعریف کی ہو اور اس گھر سے اچھا جہیز ملنے کے لالچ میں اپنے گھر والوں کو یہ رشتہ لینے پر راضی کر لیا ہو؟

احساس کمتری نے سوما کے دل میں کئی وسوسے پیدا کر دیئے تھے۔ اس کا دل ایک انجانے خوف سے دھڑک رہا تھا بار بار کے انکار نے اس کے اندر اس مسئلے کا روشن پہلو دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں رہنے دی۔ بدصورتی کے منحوس سائے اس کی سوچوں پر بہت گہرے ہو چکے تھے اس لئے اس کا دماغ ہمیشہ اندھیرے ہی کی طرف لپکتا تھا۔ روشنی میں اس کے خیالات کی آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔ اس وقت بھی جب کہ سب کچھ ٹھیک طرح ہو رہا تھا اسے حالات کی مخالفت لہر ہوا بن کر ڈرا رہی تھی اور وہ اپنے غیر یقینی مستقبل سے خوف زدہ ایک کونے میں دبکی بیٹھی تھی۔

مہمان دعوت اُڑا کر اُٹھ کھڑے ہوئے تھے مدن بھی پھلوں کے ٹوکرے لے کر پہنچ گیا تھا اور شگن کے تھال اب لڑکے والوں کو سنبھلوائے جا رہے تھے اتنا بھاری شگن دیکھ کر سب کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں مگر اس کا باپ اب بھی سب کے سامنے اپنی عاجزی اور کم مائیگی کا اظہار کر رہا تھا۔ اسے اپنے بوڑھے باپ پر رحم آنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور اپنے لئے اس کے اندر نفرت کا جذبہ جاگ اٹھا۔ وہ اپنے آپ کو مجرم تصور کرنے لگی جیسے بدصورتی اس کا اپنا ہی گناہ تھا جس کی وجہ سے اس کے باپ کی بار بار ہتک ہو رہی تھی۔ کاش! وہ یہ سب کچھ دیکھنے سے پہلے ہی مر جاتی۔

باہر بینڈ والوں نے اپنے باجے سنبھال لئے تھے کرائے کے مزدور شگن کے تھال سروں پر رکھے ایک قطار میں باہر نکل رہے تھے پھر سمدھیوں نے بڑے تپاک سے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور ایک ایک کرکے باہر جانے لگے۔ باجوں کا شور بلند ہوا اور ایک بار پھر اس کا شگن جلوس کی صورت میں ان کے گھر سے سڑک کی طرف ہولیا۔

گھر والے اب اپنے برتن بھانڈے سنبھالنے میں مصروف تھے۔ پلیٹوں گلاسوں اور چمچوں کی گنتی ہو رہی تھی سب لوگ مسرور اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔ جیسے سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہو اور اب خطرے کی کوئی بات باقی نہ رہی ہو مگر سوما کو خطرہ اب بھی سر پر کھڑا نظر آتا تھا۔ اس کا یقین اب بھی متزلزل تھا یہ بات اس کے دل میں بیٹھ چکی تھی کہ لڑکے کی بھاوجوں نے گھر جا کر اس کی شکل و صورت کے بارے میں جھوٹ بولا ہے اور جیسے ہی اس جھوٹ کا پول کھل گیا بات پھر وہیں آ جائے گی۔ وہ خود تو اپنے منگیتر کو ایک بار دیکھ چکی تھی گھر میں بڑوں کے درمیان کچھ ذکر اذکار سے اسے پتہ لگ گیا تھا کہ اس کا نام گلشن ہے اور وہ نئی دہلی ریلوے سٹیشن پر ریزرویشن کلرک ہے اور پھر یہ بھی محض ایک اتفاق تھا کہ ایک دن اسے فوآرے سے پہاڑ گنج کی بس بروقت نہ ملنے کے باعث دہلی میں سٹیشن سے ٹرین کے ذریعے سکول جانا پڑا اور نئی دہلی ریلوے سٹیشن کی ڈیوڑھی سے گزرتے ہوئے اس کی نظریں لاشعوری طور پر ریزرویشن آفس کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ بابو صاحب اس وقت کسی مسافر سے باتوں میں مصروف تھے۔ خاصے قبول صورت تھے۔ سوما نے محسوس کیا کہ وہ ان کے لئے بالکل موزوں نہیں ہے۔ اس کی صورت دیکھ کر وہ یقیناً اس رشتے سے انکار کر سکتے تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا شگن گئے ہوئے ایک مہینہ گزر گیا تھا مگر کسی رُخ سے کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی لڑکے والوں کے ہاں سے اس کے لئے سونے کی انگوٹھی بھی آ گئی تھی اور اب شادی کی تاریخ پکی کرنے کے لئے خط و کتابت ہو رہی تھی مگر سوما بدستور خوف زدہ تھی اسے یہ سلسلہ ریت کی ایک دیوار نظر آ رہا تھا اور شادی کی تیاریوں کے ساتھ ساتھ اس کی گھبراہٹ برابر بڑھتی جا رہی تھی وہ اپنے آپ کو صلیب پر چڑھا ہوا محسوس کرتی۔ ہر گزرتا ہوا دن اس کے ذہن میں ایک نئی کیل ٹھونک جاتا۔ ہر روز سکول سے واپس آتے ہوئے اسے ایک بار ضرور خیال آتا کہ آج اس کا شگن واپس آ گیا ہوگا مگر گھر پہنچ کر جب اسے یہ پتہ لگتا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تو وہ اُداس ہو کر فکرمند ہو جاتی شگن کی واپسی کا انتظار وہ بالکل ایک متوقع جوابی خط کی طرح کر رہی تھی جس میں اس کی سزا کی منسوخی کا حکم آنے والا ہو۔ گھر میں بھی وہ جتنی دیر رہتی اس کے کان ہر وقت صدر دروازے پر کسی دستک کے منتظر رہتے۔ اس وقت اگر گھر کا کوئی اپنا آدمی بھی اچانک اندر داخل ہوتا تو وہ دروازے کی طرف یوں چونک کر دیکھتی جیسے اس کا شگن واپس آ گیا ہو۔ وہ خود بھی حیران تھی کہ ایسی الٹی سیدھی باتیں کیوں اس کے ذہن میں ابھر آتی ہیں؟ وہ تو شادی کی بڑی خواہش مند تھی برسوں سے اس مقدس موقع کا انتظار کر رہی تھی۔ ازدواجی زندگی کے بارے میں اس نے کیسے کیسے سپنوں کے جال بن رکھے تھے مگر اب جب کہ

سب کچھ ٹھیک طرح ہو رہا تھا وہ کیوں برے امکانات کے بارے میں سوچتی تھی؟ کیوں ان خوش آئند حقائق سے پہلو بچانا چاہتی تھی جو اس کی زندگی کے لئے ایک سیدھا راستہ مقرر کر رہے تھے؟ شاید اس کا اپنا ہی کوئی چور اس کے دل میں ڈر بن کر چھپ گیا تھا اور وہ ہزار کوشش کے باوجود اپنے ذہن میں ایک خوشگوار گرہستی زندگی کا تصور نہیں اپنا پائی تھی۔ ہمیشہ اس کے تاریک پہلو ہی اس کے خیالات پر حاوی ہو جاتے تھے۔ گھر میں شادی کی تیاریاں ہوتی رہیں اسے یوں لگتا جیسے اسے کسی بہت بڑے آپریشن کے لئے ہسپتال میں داخل کرانے کی تیاریاں ہو رہی ہوں اور دہشت سے اس کا رواں رواں کانپ جاتا۔ مذبح میں لے جانے والی کسی بکری کی طرح اس کی روح مجسم ہو جاتی اور وہ سارا سارا دن پریشان خیالات کے تانوں بانوں میں الجھی رہتی اور پھر یہی دبے گھٹے ہوئے خیالات ڈراؤنے خواب بن کر سیاہ آوارہ بادلوں کی طرح اس کے ذہن پر چھا جاتے وہ دیکھتی کہ وہ سب لوگ جو شگن کے موقع پر ان کے ہاں دعوت کھانے آئے تھے اب تیزاب سے اس کے چہرے کی سیاہی دھو رہے ہیں اس کا جسم شکنجوں میں کس کر اسے دبلا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کی کھال ادھیڑ کر اس کے ڈھانچے پر نئی سفید کھال چڑھائی جا رہی ہے۔ وہ سخت اذیت محسوس کرتی، چیخنا چاہتی مگر ہر بار اس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ جاتی اور وہ کسمسا کر جاگ پڑتی۔ اپنے ہونے والے شوہر کو اس نے کئی بار دوسری شادی رچاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ اپنی سوتنوں سے تو وہ اکثر خواب میں جھگڑا کرتی تھی لیکن اس کی اس ذہنی کشمکش اور اپنے مقدر کے متعلق مکمل بے اعتمادی کے باوجود اس کی شادی کی تاریخ دسہرے کے دن کے لئے پکی ہو گئی۔

جس دن ان کا پروہت شادی کا مہورت لے کر ان کے گھر آیا وہ دن اس پر قیامت کی طرح گزرا دو دھاری تلوار کیسی سوچوں نے اس کے دل و دماغ چھلنی کر ڈالے۔ اس رات اسے ایک نہایت بھیانک خواب دکھائی دیا کہ وہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑی ہے سب لوگ حقارت سے اس کی طرف دیکھ رہے ہیں جج اس کی طرف پیٹھ کئے بیٹھا ہے وکیلوں کے ہاتھ اس کے سامنے ہوا میں لہرا رہے ہیں اور چاروں طرف سے بھری ہوئی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔

”طلاق، طلاق، طلاق“

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اس کے بعد نیند اس کی آنکھوں سے غائب ہو گئی۔ خیالات کے تند ریلے اس کے ذہن کو شدت سے ہلورے دینے لگے۔ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر اور پھر صبح جب وہ گھر سے تیار ہو کر سکول روانہ ہوئی تو اس کے قدم بس سٹینڈ کے بجائے آپ ہی آپ سٹیشن کی طرف اٹھنے لگے اور اسی دن کی طرح وہ ایک بار پھر گاڑی پر سوار ہو کر نئی دہلی ریلوے سٹیشن پر جا اتری اور ڈیوڑھی کے گیٹ سے گزر کر چپ چاپ ریزرویشن کاؤنٹر کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ ڈیوٹی پر بیٹھے ہوئے گلشن نے اس کی طرف دیکھ کر عام سے دفتری لہجے میں کہا ”کیا چاہئے آپ کو؟“

”مجھے؟ نہیں چاہئے تو کچھ بھی نہیں میں، میں تو آپ کو صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ جس لڑکی سے آپ کی منگنی ہوئی ہے وہ، وہ میں ہوں۔ یہ دیکھئے آپ کے گھر کی انگوٹھی میرا مطلب ہے شادی سے پہلے آپ لوگ پھر اپنے فیصلے پر غور کر لیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ......“ اس سے آگے سوما کچھ نہ کہہ سکی گلشن کے جواب کا بھی اس نے انتظار نہیں کیا۔ بس فوراً وہاں سے چل پڑی اور تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی سکول کی جانب روانہ ہو گئی اس وقت وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کر رہی تھی اپنے پکے ہوئے پھوڑے کا مواد آج اس نے نکال دیا تھا۔ تیسرے دن اس کا شگن واپس آ گیا سارے گھر میں کھلبلی مچ گئی لیکن سوما اطمینان کا ایک گہرا سانس لے کر اندر اپنے پلنگ پر دراز ہو گئی جیسے ایک بہت بڑا بوجھ اس کے سر سے اتر گیا ہو۔



ہمارا درخشاں ماضی

حافظ اشتیاق احمد

ہمارے عظیم الشان عہد رفتہ کی ایک مختصر سی جھلک، جس نے ایک ایسی تہذیب کی بنیاد رکھی جو ہر ایک کو عزت نفس، وقار اور خودداری عطا کرتی ہے۔

بڑی عام سی کہانی ہے کہ ایک چرواہے کو جنگل میں شیر کا ایک بچہ مل گیا۔ وہ اسے اٹھا لایا اور بکریوں میں رکھ کر اسے پالنا شروع کر دیا۔ کئی سال گزر گئے وہ جوان ہو گیا۔ شب و روز بکریوں میں گزارنے کے باعث بکریوں کی سی عادات اس میں رچ بس گئی تھیں۔ وہ بکریوں کی طرح منمناتا، گھاس کھاتا اور شام کو باڑے میں آ کر آرام سے سو جاتا۔ ایک دن وہ کسی جھیل پہ جا نکلا۔ پانی پینے کے لئے گردن بڑھائی تو اسے اپنا عکس نظر آیا۔ فوراً اس کی شیرانہ خصلت جاگ اٹھی اور وہ بکریوں کو چیر پھاڑ کر جنگل کی طرف چلا گیا۔

آج ہمارا حال بھی اسی شیر کی طرح ہے جو بکریوں میں پروان چڑھا۔ ہم اپنی صحیح اسلامی تاریخ سے نابلد ہیں۔ ہم اپنے اسلاف و اکابر کے کارناموں سے بے خبر ہیں۔ ان کی علم دوستی، جانفشانی، جانثاری، مہم جوئی اور تخلیقی کارناموں سے لاعلم ہیں۔ ہمارے نوجوانوں کو مغربی کرداروں کے نام تو آتے ہیں مگر اپنے اکابر کی کارکردگیوں سے ناشناسا ہیں۔ اس میں ہمارے نوجوانوں کا قصور نہیں، اس کا دارومدار ہمارے مدارس میں دی جانے والی تعلیم پر ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

گلا تو گھونٹ دیا ہے اہل مدرسہ نے تیرا
اب کہاں سے آئے صدائے لا الہ

کارناموں سے بے خبر ہیں۔ ان کی علم دوستی، جانفشانی، جاںنثاری، مہم جوئی اور تخلیقی کارناموں سے لاعلم ہیں۔ ہمارے نوجوانوں کو مغربی کرداروں کے نام تو آتے ہیں مگر اپنے اکابر کی کارکردگیوں سے ناشناسا ہیں۔ اس میں ہمارے نوجوانوں کا قصور نہیں، اس کا دارومدار ہمارے مدارس میں دی جانے والی تعلیم پر ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

گلا تو گھونٹ دیا ہے اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدائے لا الہ

ایک جگہ اور لکھتے ہیں۔

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

بات دراصل یہ ہے کہ جو قوم غالب ہوتی ہے اس کی فکر بھی غالب ہوتی ہے۔ آج زندگی کے ہر میدان میں ہمیں یورپ ترقی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اگر عرب نہ ہوتے تو آج یورپ کا حال افریقہ سے بھی بدتر ہوتا۔ آئیں ایک جھلک اپنے اکابر کے عظیم الشان کارناموں پر بھی ڈالتے ہیں۔ زندگی کے ہر میدان میں ہمارے اکابر نے انمٹ نقوش چھوڑے۔ قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ، طب، علم ہیئت، ریاضی، فلسفہ، علم کلام، لغت، علم معانی، سپہ گری وغیرہ تمام علوم میں اسلام نے ہمیں قیمتی ہیرے دیئے۔ جنہوں نے بڑی محنت کی اور دنیائے انسانیت کے لئے علوم کے دریا بہا دیئے۔ ہمارے اسلاف نے تصانیف کے انبار لگا دیئے تھے۔ امام غزالی دوسو، ابن العربی اڑھائی سو، ابن تیمیہ پانچ سو، امام جلال الدین سیوطی ساڑھے پانچ سو اور ابن طولون دمشقی ساڑھے سات سو کتابوں کے مصنف تھے۔ لیکن آج ہمیں ان کتابوں کے نام تک معلوم نہیں۔ دوسری طرف یورپ کی لائبریریوں میں ان کتابوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ ہالینڈ کی ایک فرم ای جے برل کی فہرستوں میں کئی ہزار عربی کتابوں کا ذکر ہے۔ ان میں سے ہزار کے قریب صرف تاریخ پر ہیں۔ حکیم الامت ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ نے اسی لئے کہا تھا

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

ان کتابوں میں کیا ہے؟ ان کتابوں میں دھوکہ دہی کا سبق نہیں ہے۔ ان کتابوں میں دوسروں کے حقوق غصب کرنے کا طریقہ نہیں ہے۔ ان کتابوں میں سامان بدتمیزی نہیں ہے، ان کتابوں میں باطل کے آگے جھکنے کا سبق نہیں ہے بلکہ ان کتابوں میں اپنے اندر غیر متزلزل ایمان پیدا کرنے کی رہنمائی ہے، ان کتابوں میں حیاء اور اخلاق کا درس ہے، ان کتابوں میں جہانبانی کے اصول درج ہیں، ان کتابوں میں نت نئی ایجادات کے طریقے درج ہیں، ان کتابوں میں جہد مسلسل کا کڑوا سبق موجود ہے۔ آج انگریز ہر ایجاد کا بانی اپنے اکابر کو کہہ رہا ہے لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔ ہر ایجاد کا فارمولا انہیں مسلمانوں نے عطا کیا ہے۔ ذیل میں مسلمان سائنسدانوں کی چند ایجادات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

کاغذ

یورپ پر عربوں کا سب سے بڑا احسان کاغذ کا رواج ہے۔ کاغذ کے اصل موجد چینی تھے۔ انہوں نے کاغذ کا ایک کارخانہ سمرقند میں بھی قائم کیا۔ جب ساتویں صدی عیسوی میں عربوں نے سمرقند فتح کیا تو وہاں سے یہ صنعت لے لی۔ اہل چین ریشمی کپڑے کے خول سے کاغذ بناتے تھے۔ عرب پرانے کپڑوں اور کپاس کو بھی اس مقصد کے لئے استعمال کرنے لگے۔ کاغذ سازی کا پہلا کارخانہ 794ء میں بغداد میں قائم ہوا۔ یہ ہارون الرشید کا زمانہ تھا۔ اس کے

بعد یہ صنعت سلطنت کے دیگر بڑے شہروں مثلاً دمشق، مصر، نیشاپور، شیراز، خراسان، مراکش، قرطبہ، غرناطہ، سسلی وغیرہ میں پہنچا۔ یہ صنعت کس ملک میں کب پہنچی؟ ذیل میں جدول دیکھئے۔

ملک	صنعت پہنچی
1۔ چین موجد	105ء
2۔ بغداد	794ء
3۔ مصر	800ء
4۔ سپین	950ء
5۔ قسطنطنیہ	1100ء
6۔ اٹلی	1145ء
7۔ جرمنی	1228ء
8۔ برطانیہ	1309ء

عرب تاجروں کی بدولت مکہ میں کاغذ 700ء سے بھی پہلے پہنچ گیا تھا۔ یورپ میں کاغذ سے پہلے کتابیں چمڑے کی جھلی پر لکھی جاتی تھیں اور وہ اس قدر مہنگی ہوتی تھیں کہ اٹلی کی ایک امیر خاتون کو ایک چھوٹی سی کتاب کے لئے دو سو بھیڑیں اور پانچ من غلہ دینا پڑا تھا۔ اس طرح جب فرانس کے بادشاہ لوئیس یازدہم (1483-1461ء) کو پیرس کی یونیورسٹی سے رازی کی چند طبی تصانیف عاریتاً لینا پڑیں تو اس نے ایک امیر کو ضامن بنایا۔ نیز ایک بہت بڑی رقم جمع کرائی۔

یورپ میں کاغذ پر پہلی تحریر راجر اول کی بیوی کا ایک حکم ہے جو 1109ء میں جاری ہوا تھا۔ لیکن موسیو لیبان لکھتا ہے کہ کاغذ پر پہلی تحریر ایک کتاب تھی جو 1009ء میں لکھی گئی تھی اور جو اسکوریل کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ کاغذ عربوں سے خریدا گیا تھا۔

قطب نما

قطب نما عربوں کی ایجاد ہے یہ آلہ قرون اولیٰ کے تمام تجارتی و جنگی جہازوں میں لگا ہوا تھا۔ یہ اسی کی رہنمائی کا کرشمہ تھا کہ ہمارے جہاز جدہ سے چین تک جاتے تھے۔ جب ہم نے یہی چیز یورپ کو دی تو اس کا کولمبس بحر اطلس کی لہروں کو چیر کر امریکہ جا پہنچا اور واسکوڈی گاما ہندوستان تک نکل گیا۔

کلاک اور گھڑیال

ہارون الرشید اور شارلیمان کے تعلقات بڑے دوستانہ تھے۔ ایک دفعہ ہارون نے شارلیمان کو چند تحائف بھیجے جن میں ایک کلاک بھی تھا۔ اسی طرح جب فریڈرک دوم صلیبی افواج لے کر فلسطین پہنچا اور سلطان الکامل کے خلاف صف آراء ہوا تو الکامل نے اس بنا پر کہ فریڈرک اسلامی تہذیب کا دلدادہ ہے۔ اس کا بڑا احترام کیا اور واپسی پر بیش قیمت تحائف سے نوازا جن میں ایک کلاک بھی تھا۔ اس میں شمس و قمر حرکت کرتے اور طلوع و غروب کا منظر دکھاتے تھے۔ نیز ہر گھنٹے کے بعد ٹن ٹن کی آواز آتی تھی۔

دمشق کی مسجد میں ایک ایسی گھڑی آویزاں تھی جس کے ڈائل پر تانبے کے دو شہباز بنے ہوئے تھے ساتھ ہی ایک پیالی میں تانبے کی گولیاں رکھی تھیں جب ایک گھنٹہ ختم ہوتا یہ باز حرکت میں آتے، جھک کر چونچ سے گولی اٹھاتے اور باری باری ایک اور پیالی میں ڈالتے جاتے جس سے ٹن ٹن کی آواز پیدا ہوتی۔ غروب آفتاب کے بعد یہ باز سو جاتے اور چند نئے پرزے کام کرنے لگ جاتے۔ اس گھڑی پر نیم دائرہ کی شکل میں بارہ سوراخ تھے۔ اندر ایک چراغ گھومتا رہتا تھا جب ایک گھنٹہ ختم ہو جاتا تو وہ ایک چراغ کے سامنے تھوڑی دیر کے لئے آ کر رک جاتا۔ کمال کی بات یہ ہے کہ وہ ہمیشہ صحیح سوراخ کے سامنے رکتا اور وقت بتانے میں کبھی غلطی نہ کرتا۔

پلرمو رسسلی میں مسلمانوں نے ایک چشمے پر ایک ایسا گھڑیال بنایا تھا جو صرف اوقات نماز پر بجتا تھا اور اس کی آواز کئی میل تک سنائی دیتی تھی۔ ایران

...ایک قاضی ابن [illegible] نے 1203ء میں یہ کتاب لکھی [illegible] میں [illegible] کی کا [illegible] [illegible] بنایا [illegible] 1206ء میں ایک [illegible] قاضی [illegible] اور [illegible] مشینوں پر [illegible] کتاب لکھی گئی۔

دار الصناعہ

مسلمانوں نے سسلی، چین، [illegible] اور تیونس میں ایسے کارخانے قائم کیے تھے جن میں تیر سے توپ تک تمام اسلحہ بنتا اور سمندری جہاز تیار کیے جاتے تھے۔ حضرت امیر معاویہ کا سمندری بیڑا بارہ سو اور اندلس کا کئی ہزار جہازوں پر مشتمل تھا اور ان کی اجازت کے بغیر کسی سلطنت کا کوئی جہاز بحیرہ روم میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔

عینک طیارہ اور میزان الوقت

ول ڈیوران لکھتا ہے کہ سپین کے ایک مسلم سائنسدان ابن فرناس نے تین چیزیں ایجاد کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اول عینک کا شیشہ، دوم وقت بتانے والی گھڑی، سوم ایک مشین جو ہوا میں اُڑ سکتی تھی۔

متفرق ایجادات

خلیفہ المنصور عباسی کے حوض میں مصنوعی سنہری درخت پر ایسی چڑیاں بنی ہوئی تھیں جو ہوا چلنے پر گاتی تھیں۔ الحمرا میں ایسے فوارے تھے جن سے پانی کے ساتھ گیت بھی نکلتے تھے۔ سپین میں ایک پریس تھا جس پر عبدالرحمان اول کے احکام چھپتے تھے۔ اموی خلفاء نے پہاڑی چشموں کا پانی دمشق کے گھر گھر میں پہنچا دیا تھا۔ سسلی میں ایسی مشینیں تھیں جو کنویں کا پانی بلندی پر پہنچاتی تھیں۔ وہ لوگ دریاؤں پر پل باندھ سکتے تھے۔ خلفائے عباسیہ کے عہد میں دریائے دجلہ پر جو سات سو پچاس فٹ چوڑا ہے تین پل تھے۔ انہوں نے سیاحوں کو [illegible] کے لیے چھتیاں اور جام بانی [illegible] ہر قسم کی مٹھائیاں [illegible] اور [illegible] مختلف ستاروں کا فاصلہ معلوم کرنے کیلئے خاص آلات بنائے۔ بھاری چیزوں کو بلندی تک پہنچانے کیلئے کلیں بنائیں۔ شیشہ سازی، قالین بافی، چمڑا رنگنے، چینی کے برتن اور [illegible] بنانے میں کمال حاصل کیا۔ موسیو لیبان لکھتا ہے کہ سسلی میں ایک نارمن امیر رابرٹ گسکرڈ کو ایک ایسی مورتی ملی جو سنگ مرمر کے چبوترے پر نصب تھی۔ اس کے سر پر کانسی کا تاج تھا اور اس پر یہ الفاظ کندہ تھے۔ ”یکم مئی کو غروب آفتاب کے وقت میرے سر پر سونے کا تاج ہوگا“ کوئی شخص اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ جب یہ بات ایک مسلم قیدی تک پہنچی تو اس نے پیغام بھیجا کہ اگر مجھے چھوڑ دو تو میں اس معمہ کو حل کردوں گا۔ رابرٹ نے اسے آزاد کرالیا۔ اس نے کہا کہ یکم مئی کو وہ جگہ کھودی جائے جہاں غروب کے وقت اس مورتی کے سر کا سایہ پڑ رہا ہو۔ وہاں سے خزانہ نکلے گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور وہاں سے زر و جواہر کے صندوق برآمد ہوئے۔

اس دور میں چند شہر اپنی مصنوعات کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ موصل کی ململ، دمشق اور سطلیہ کی تلواروں، عدن کے اونی کپڑے، رے کے رنگین برتنوں، رقہ کے صابن، ایران کے قالینوں اور نیشاپور کے عطر کا دُور دُور تک چرچا تھا۔ بعض کاریگر ایسی اعلیٰ چیزیں بناتے تھے جنہیں بڑے بڑے امراء بھی نہیں خرید سکتے تھے۔ ایک مرتبہ ہارون الرشید کا وزیراعظم یحییٰ بن خالد برمکی بازار سے گزر رہا تھا کہ

اس کی نظر ایک چھوٹے سے مرصع صندوقچے پر پڑی اسے بے حد پسند آیا اور خریدنے کا ارادہ کیا لیکن قیمت پہ اتفاق نہ ہوسکا۔ تجھی ستر لاکھ درہم دیتا تھا دکاندار زیادہ مانگتا تھا۔ مسلمانوں نے صنعت وحرفت پر کافی کتابیں لکھی تھیں لیکن آج ان کا نام ونشان تک موجود نہیں۔ صرف چند نام باقی رہ گئے ہیں۔ مثلاً ابوالفیض، اسماعیل بن الرزاز کی الکتاب فی معرفۃ الہندسیہ جو 1206ء میں لکھی گئی تھی۔ الخازنی کی میزان الحکمۃ اور الخوارزمی کی کتاب الصنائع جس میں ایک سو صنعتوں کا ذکر ہے۔

یہ ہے ہمارے عظیم الشان عہد رفتہ کی ایک مختصر سی جھلک، ہمارے اکابر نے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے۔ انہوں نے ایک ایسی تہذیب کی بنیاد رکھی جو ہر ایک کو عزت نفس، وقار اور خودداری عطا کرتی ہے۔

مفکرین یورپ کو اس بات کا یقین ہے کہ اگر کوئی تہذیب مغربی تہذیب کو پچھاڑ سکتی ہے تو وہ صرف اسلامی تہذیب ہے۔ جو علم و اخلاق سے آراستہ اور عشق جیسی توانائی سے مسلح ہے۔ مصر و بابل کی تہذیبیں مرچکیں، یونان ختم ہوگیا، چین کی قدیم تہذیب عصر رواں کا ساتھ نہیں دے سکتی اور ہندو تہذیب اوہام وخرافات کا مجموعہ ہے۔ صرف اسلامی تہذیب ہی وہ قوت ہے جو دنیائے انسانی کو تمام آلام سے نجات دلاسکتی ہے اور بھٹکی ہوئی زندگی کو رومنزل بتاسکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یورپ ہم پر مسلسل پیہم اور تابڑ توڑ حملے کررہا ہے۔ وہ ہماری تاریخ کو مسخ کررہا ہے۔ عریاں فلمیں بھیج کر ہمیں اوباش بنا رہا ہے۔ ہماری درسگاہوں میں انہی کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھائی جارہی ہیں۔ وہ ہمارے قابل نوجوان کو وظائف دے کر اپنی درسگاہوں میں بلا رہا ہے اور یہ سب کچھ اس لئے ہورہا ہے کہ مسلمان اپنی روایات، تہذیب، تاریخ، ماضی اور اسلاف سے متنفر ہوکر یورپ کا مداح اور نقال بن جائے۔

تقسیم ہند سے پہلے ہمارے نوجوان کو دو مخلص رہنما ملے۔ حکیم مشرقؒ جنہوں نے انہیں منزل کا پتہ دیا اور قائداعظمؒ جنہوں نے کاروان جادہ پیاں کی قیادت سنبھالی۔ بس پھر کیا تھا؟ نوجوان طوفانوں کی طرح بل کھا کر اٹھے، دریاؤں کے مہیب دھاروں کی طرح آگے بڑھے اور ہندو فرنگ کی متحدہ طاقت کو روندتے ہوئے آزادی کی منزل تک جا پہنچے۔

میرے نوجوان کی فطرت میں بڑی صلاحیت ہے وہ بڑا نڈر وطن پرست، بہادر اور جانباز واقع ہوا ہے۔ اگر وہ قائداعظمؒ کے اشارے پر سر دے سکتا ہے تو رقص ونغمہ کی محفلوں کو بھی برہم کرسکتا ہے۔ جس روز اسے یقین ہوگیا کہ قومی بقاء کے لئے شراب زہر ہلاہل ہے اور گناہ سم قاتل کہ کائنات کی سب سے بڑی توانائی عشق، یعنی اللہ تعالیٰ سے رابطہ محبت ہے اور اللہ تعالیٰ سے فرار موت ہے، کہ قوتوں میں استحکام، پاکیزگی اخلاق، احترام نسواں، مساوات آدم اور بے پناہ علم سے پیدا ہوتا ہے اور اسلام کی عظیم وجلیل تہذیب انہی عناصر کا مجموعہ ہے۔ تو وہ اپنی ثقافت کی طرف یوں لوٹ آئے گا:

جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے!

آم...... پھلوں کا بادشاہ

حکیم راحت نسیم سوہدروی

آم موسم گرما کا پھل ہے اور موسمی تقاضے پورا کرنے کی صلاحیتوں سے بھی مالا مال ہے..... کرشماتی پھل کی اقسام، فوائد اور استعمال کے متعلق مفصل تحریر!



آم جو پھلوں کا بادشاہ ہے اس کا شمار برصغیر کے بہترین پھلوں میں ہوتا ہے۔ یہ ایک مقبول پھل ہے جسے برصغیر کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ آم کو برصغیر کا جلیل القدر پھل، جنت کا میوہ اور دیوتاؤں کا بھوگ جیسے نام دیے گئے ہیں۔ آم اپنے ذائقے، تاثیر، رنگ اور صحت بخشی کے لحاظ سے سب سے منفرد ہے اور برصغیر میں کاشت کے سبب [illegible] اور سہل الحصول بھی ہے۔ آم کا درخت خوب پھل لاتا ہے اور اس کی سینکڑوں اقسام ہیں۔ برصغیر کو آم کا گھر بھی کہتے ہیں، یہاں کے قدیم باشندے بھی آم بڑی رغبت سے استعمال کرتے تھے۔

فرانسیسی مورخ ڈی کنڈوے کے مطابق برصغیر میں آم چار ہزار سال قبل بھی بویا جاتا تھا۔ آج کل جنوبی ایشیا کے ممالک میں بڑے پیمانے پر تجارتی طور

پر کاشت کیا جاتا ہے۔ جنوبی امریکہ میں بھی آم کی بڑے پیمانے پر کاشت ہونے لگی ہے مگر ذائقہ، تاثیر اور اقسام کے لحاظ سے اب بھی برصغیر کے آم کو برتری حاصل ہے۔

ویسے تو آم کی متعدد اقسام ہیں جن کا ذکر آگے چل کر آئے گا تاہم دو قسمیں عام ہیں۔ تخمی اور قلمی۔ کچا آم جن میں گٹھلی نہیں ہوتی' کیری کہلاتا ہے اور اس کا ذائقہ ترش ہوتا ہے۔ اور بعض حالات میں اس کا استعمال بھی نقصان دہ ہوتا ہے۔ البتہ پکا ہوا آم شیریں اور کبھی کھٹ میٹھا ہوتا ہے۔ پکے ہوئے تخمی آم کا رس چوسا جاتا ہے اور قلمی آم کو تراش کر لیا جاتا ہے۔ آم قلمی ہو یا تخمی بہرصورت پکا ہوا لینا چاہئے کیونکہ اس کے فوائد مسلم ہیں اور یہ رسیلا ہونے کی وجہ سے پیٹ میں گرانی پیدا نہیں کرتا اور زود ہضم ہونے کے ناطے جلد جزو بدن بنتا ہے۔ پکا ہوا رسیلا آم اپنی تاثیر کے لحاظ سے گرم خشک ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آم کے استعمال کے بعد کچی لسی پینے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ اس طرح آم کی گرمی خشکی جاتی رہتی ہے جو لوگ کچی لسی (دودھ میں پانی ملا ہوا) استعمال نہیں کرتے ایسے لوگ عام طور پر منہ میں چھالے یا پھوڑے پھنسیاں نکل آنے کی شکایت کرتے ہیں۔ آم کے بعد کچی لسی پینے سے جسم میں فربہی ہوتی ہے اور تازگی آتی ہے۔ معدہ' مثانہ اور گردوں کو طاقت پہنچتی ہے۔ آم کا استعمال اعضاء رئیسہ دل و دماغ اور جگر کے لئے مفید ہے۔ آم میں نشاستہ دار اجزاء ہوتے ہیں اس سے جسم موٹا ہوتا ہے۔ اپنے قبض کشا اثرات کے باعث اجابت با فراغت ہوتی ہے۔ آم جس قدر میٹھا اور رسیلا ہوگا اسی قدر گرم ہوگا جس قدر کم میٹھا یعنی ترش ہوگا اسی قدر نیم گرم ہوگا۔ اپنے مصفی خون تاثیر کے سبب چہرے کی رنگت کو نکھار اور حسن کو دوبالا کرتا ہے۔

ماہرین طب کی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ آم تمام پھلوں میں سے زیادہ خصوصیات کا حامل ہے اور اس میں حیاتین الف و ج تمام پھلوں سے زیادہ ہوتے ہیں۔ کچا آم اپنی تاثیر کے ناطے ٹھنڈا ہوتا ہے اور ذائقے کے لحاظ سے ترش ہوتا ہے۔ یہ بھی اپنے اندر بے شمار غذائی و دوائی اثرات رکھتا ہے اس کے استعمال سے بھوک لگتی ہے اور صفرا کم ہوتا ہے۔ موسمی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے لو کے خدشات سے بچاتا ہے۔ البتہ ایسے لوگ جن کو نزلہ' زکام اور کھانسی ہو ان کو ہرگز استعمال نہیں کرنا چاہئے کیونکہ فائدہ کے بجائے نقصان ہو سکتا ہے۔

آم جو پکا ہوا اور رسیلا ہو تمام عمر کے لوگوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ جو بچے لاغر اور کمزور ہوں ان کے لئے تو عمدہ قدرتی ٹانک ہے۔ حاملہ عورتوں کو استعمال کرنا چاہئے' یوں بچے خوبصورت ہوں گے۔ جو مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلاتی ہیں اگر استعمال کریں تو دودھ بڑھ جاتا ہے۔ یہ خوش ذائقہ پھل نہ صرف خون پیدا کرنے والا قدرتی ٹانک ہے بلکہ گوشت بھی بناتا ہے اور نشائی اجزاء کے علاوہ فاسفورس' کیلشیم' فولاد' پوٹاشیم اور گلوکوز بھی رکھتا ہے۔ اس لئے دل و دماغ اور جگر کے ساتھ ساتھ سینہ اور پھیپھڑوں کے لئے بھی مفید ہے۔ البتہ یہ امر پیش نظر رہنا چاہئے کہ آم کا استعمال خالی معدہ نہیں کرنا چاہئے اور آم استعمال کرنے کے بعد دودھ پانی ملا کر ضرور استعمال کرنا چاہئے یوں آم کے فوائد بڑھ جائیں گے۔ بعض لوگ آم کھانے کے بعد گرانی محسوس کرتے ہیں اور بوجھل طبیعت ہو جاتی ہے۔ انہیں آم کے بعد جامن کے چند دانے استعمال کرنے چاہئیں جامن آم کا مصلح ہے۔

آم میں موجود غذائیت

آم پر جدید تحقیقات کے مطابق جو کیمیائی تجزیہ کیا

گیا ہے مختلف اجزاء کا تناسب درج ذیل ہیں۔

پروٹین 0.7 فیصد

کاربوہائیڈریٹ 17.2 فیصد

فیٹ 0.4 فیصد

نمکیات 0.5 فیصد

آب نمی 8.4 فیصد

فاسفورس 13 ملی گرام فیصد گرام

کیلشیم 14 ملی گرام فیصد گرام

فولاد 1.3 ملی گرام فیصد گرام

حیاتین الف 6350 انٹرنیشنل یونٹ فی سو کلوگرام

حیاتین ب1 0.4 ملی گرام ہمد سو گرام

حیاتین ب2 0.1 ملی گرام

حیاتین ب5 0.3 ملی گرام

حیاتین ج 41 ملی گرام فی سو گرام

جبکہ آم کی گٹھلی میں نیکوٹیک ایسڈ 10 فیصد تک پایا جاتا ہے۔

آم کی مختلف اقسام

یوں تو آم کی بے شمار اقسام سامنے آ چکی ہیں مگر پاکستان میں بکثرت پیدا ہونے والی اقسام درج ذیل ہیں۔

دسہری۔ اس کی شکل لمبوتری' چھلکا خوبانی کی رنگت جیسا باریک اور گودے کے ساتھ چمٹا ہوتا ہے۔ گودا گہرا زرد' نرم' ذائقہ دار اور شیریں ہوتا ہے۔

چونسا۔ یہ آم قدرے لمبا' چھلکا درمیانی موٹائی والا ملائم اور رنگت پیلی ہوتی ہے۔ اس کا گودا گہرا زرد نہایت خوشبودار اور شیریں ہوتا ہے۔ اس کی گٹھلی پتلی لمبوتری' سائز بڑا اور ریشہ کم ہوتا ہے۔ اس کی ابتداء ملیح آباد (بھارت) کے قریبی قصبہ چونسا سے ہوئی۔

انور رٹول۔ اس کی شکل بیضہ نما ہوتی ہے اور سائز درمیانہ ہوتا ہے۔ چھلکا درمیانہ موٹا چکنا اور سبزی مائل زرد ہوتا ہے' گودا بے ریشہ ٹھوس سرخی مائل زرد نہایت شیریں' خوشبودار اور رس درمیانہ ہوتا ہے۔ اس کی گٹھلی درمیانہ بیضوی اور نرم ریشہ سے ڈھکی ہوتی ہے۔ اس قسم کی ابتداء میرٹھ (بھارت) کے قریب رٹول سے ہوئی۔

لنگڑا۔ یہ قسم بیضوی لمبوترا ہوتا ہے۔ اس کا چھلکا چکنا بے حد پتلا اور نفیس گودے کے ساتھ چمٹا ہوتا ہے۔ گدا سرخی مائل زرد خستہ بے حد عمدہ شیریں' رس دار ہوتا ہے۔

الماس۔ اس کی شکل گول بیضوی ہوتی ہے اور سائز درمیانہ، چھلکا زردی مائل سرخ' گودا خوبانی کے رنگ جیسا ملائم دار شیریں اور ریشہ برائے نام ہوتا ہے۔

فجری۔ یہ بیضوی لمبوترا ہوتا ہے۔ فجری کا چھلکا زردی مائل' سطح برائے نام کھردری' چھلکا موٹا اور نفیس گودے کے ساتھ ہوتا ہے۔ گودا زردی مائل سرخ' خوش ذائقہ اور رس دار اور ریشہ برائے نام ہوتا ہے۔ اس کی گٹھلی لمبوتری موٹی اور ریشہ دار ہوتی ہے۔

سندھڑی۔ یہ قسم بیضوی اور لمبوترا ہوتا ہے۔ اس کا سائز بڑا' چھلکا زرد چکنا باریک' گودے کے ساتھ چمٹا ہوتا ہے۔ گودا زرد شیریں رس دار اور گٹھلی لمبی و موٹی ہوتی ہے۔

غلام محمد والا۔ سائز میں چھوٹا' چھلکا موٹا اور پتلا ہوتا ہے گودا گہرا پیلا' شیریں اور رس دار ہوتا ہے اور گٹھلی کا سائز درمیانہ ہوتا ہے۔

گولا۔ یہ شکل میں گول ہوتا ہے سائز درمیانہ چھلکا گہرا نارنجی اور پتلا ہوتا ہے گودا پیلا ہلکا ریشہ دار اور رسیلا ہوتا ہے۔ گٹھلی بڑی ہوتی ہے۔

مالدا۔ بہت بڑا سائز گٹھلی انتہائی چھوٹی' چھلکا پیلا اور پتلا ہوتا ہے۔

نیلم۔ سائز درمیانہ' چھلکا درمیانہ موٹا اور پیلے

"پہلی غلطی"

ایک شادی شدہ جوڑا اپنی شادی کی 25 ویں سالگرہ منا رہا تھا۔ اس جوڑے کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ پورے پچیس سال میں ان کی ایک بار بھی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ ایک بہت بڑے ٹیلی ویژن نے یہ سالگرہ منانے کا انتظام کیا اور ایک لائیو ٹیلی تھان پیش کیا۔ سالگرہ منانے کے دوران میزبان نے شوہر سے پوچھا، آپ کی پچیس سال کی زندگی میں یہ کیسے ہو گیا کہ آپ ایک بار بھی نہیں لڑے؟

میرا مطلب ہے کہ آپ کے لئے یہ کیوں کر ممکن ہو سکا؟

شوہر نے معصومیت سے جواب دیا۔ جب ہماری شادی ہوئی تو ہم شادی کی سالگرہ منانے کے لئے شملہ گئے تھے۔ وہاں ہم نے گھڑ سواری شروع کی۔ اتفاق سے میری بیوی کو جو گھوڑا دیا گیا وہ تھوڑا اڑیل تھا۔ اس نے راستے میں ایک بار میری بیوی کو گرانے کی کوشش کی تو میری بیوی نے گھوڑے سے مخاطب ہو کر کہا۔

تمہاری یہ پہلی غلطی ہے آئندہ ایسی غلطی ہرگز نہ کرنا۔

تھوڑی دُور جا کر گھوڑے نے پھر اسے گرانے کی کوشش کی، تو میری بیوی نے پھر گھوڑے سے مخاطب ہو کر کہا۔ یہ تمہاری دوسری اور آخری غلطی ہے میں تمہیں تنبیہ کرتی ہوں۔ آخر کار تھوڑی دُور اور جا کر اس گھوڑے نے میری بیوی کو گرا ہی دیا۔ میری بیوی اٹھی اور ریوالور نکال کر کہا یہ تمہاری تیسری غلطی تھی۔

ڈز، ڈز، ڈز اس نے تین فائر کیے اور گھوڑا مار ڈالا۔ میں چلایا، ارے عقل کی اندھی، احمق یہ تم نے کیا کیا ایک معصوم جانور کو مار ڈالا۔

تو میری بیوی میری طرف مڑی اور کہا، تمہاری یہ پہلی غلطی ہے آئندہ ایسی غلطی ہرگز نہ کرنا۔ اور پھر اس کے بعد ہماری زندگی بھر کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔

رنگ، کا چمکتا ہوا ہوتا ہے۔

سہارنی:۔ سائز درمیانہ ذائقہ قدرے میٹھا ہوتا ہے۔

بطور دوا استعمال

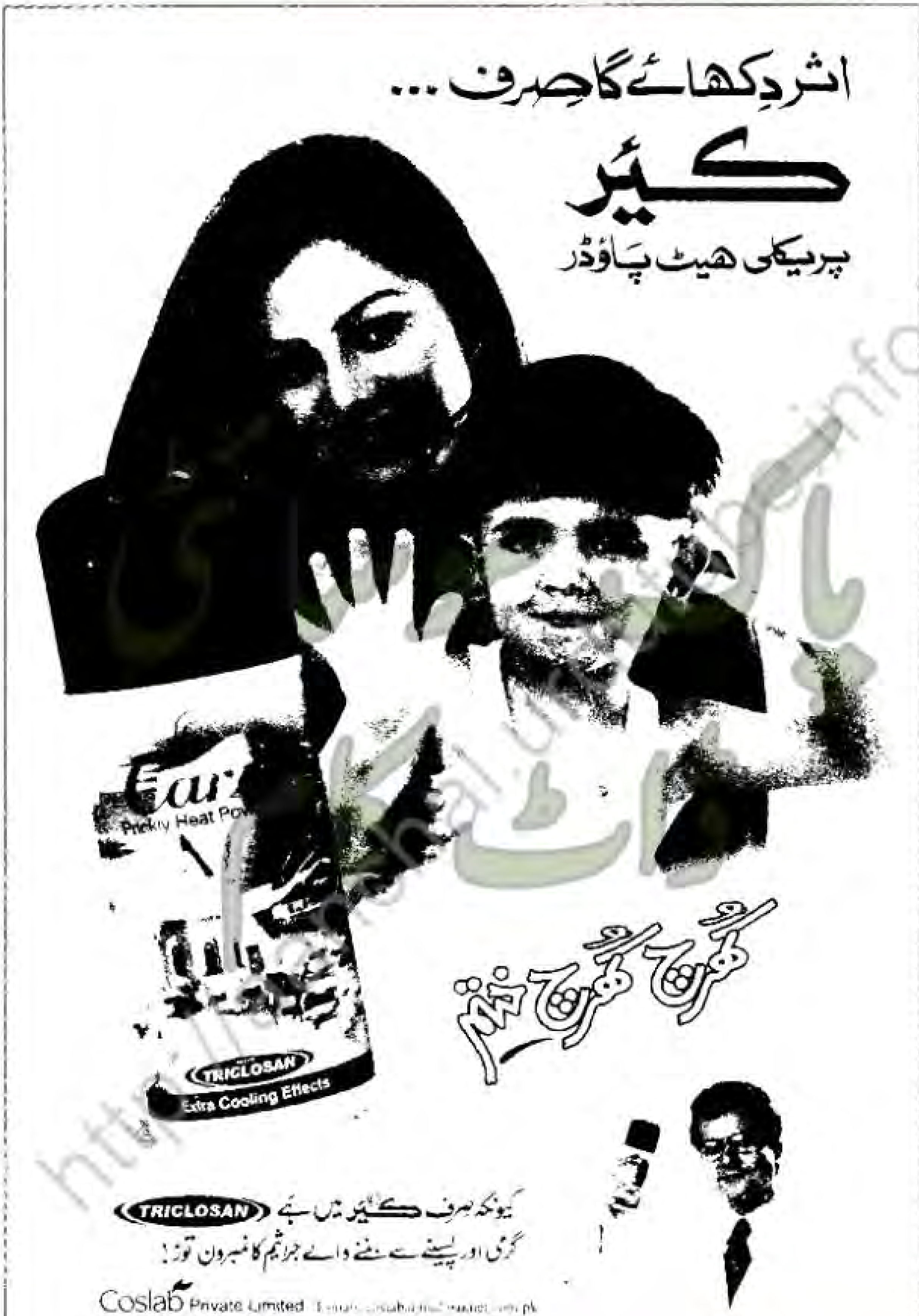
قدرت نے جتنے بھی پھل عطا فرمائے ہیں یہ موسمی تقاضے پورا کرنے کی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔ اس طرح آم موسم گرما کا پھل ہے اور موسم گرما میں دھوپ میں باہر نکلنے سے لو لگ جاتی ہے لو لگنے کی صورت میں شدید بخار ہو جاتا ہے آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں لو کے اثر کو ختم کرنے کے لئے کچا آم گرم راکھ میں دبا دیں نرم ہونے پر نکال لیں اس کا رس لے کر ٹھنڈے پانی میں چینی کے ساتھ ملا کر استعمال کرائیں لو لگنے کی صورت میں تریاق کا کام دے گا۔

آم کے پتے، چھال، گوند، پھل اور تخم سب دوا کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ آم کا اچار جس قدر پرانا ہو اس کا تیل گنج کے مقام پر لگائیں بال جڑ میں بھی فائدہ ہوگا۔

آم کے درخت کی پتلی ڈالی کی لکڑی سے روزانہ بطور مسواک کرنے سے منہ کی بدبو جاتی رہے گی۔

آم کے بور کا سفوف روزانہ نہار منہ چینی کے ساتھ استعمال کریں مرض جریان میں مفید ہے۔

جن لوگوں کو پیشاب رکنے کی شکایت ہو آم کی جڑ کا چھلکا برگ شیشم ایک ایک تولہ لے کر ایک کلو پانی میں جوش دیں جب پانی تیسرا حصہ رہ جائے تو ٹھنڈا کر کے چینی ملا کر پی لیں۔ پیشاب کھل کر آئے گا ذیابیطس کے مرض میں آم کے پتے جو خود بخود جھڑ کر گر جائیں سائے میں خشک کر کے سفوف بنالیں صبح و شام دو دو ماشہ پانی سے استعمال کرنے سے چند دنوں میں


اثر دِکھائے گا صِرف...
کیئر
پریکلی ھیٹ پاؤڈر
Prickly Heat Pow
TRICLOSAN
Extra Cooling Effects
گھمور گھمور ختم
کیونکہ صرف کیئر میں ہے TRICLOSAN
گرمی اور پسینے سے بننے والے جراثیم کا نمبر ون توڑ!
Coslab Private Limited

فائدہ ہوتا ہے۔

نکسیر کی صورت میں آم کے پھولوں کو سائے میں خشک کر کے سفوف بنائیں اور بطور نسوار ناک میں لینے سے خون بند ہو جاتا ہے۔

جن لوگوں کے بال سفید ہوں، آم کے پتے اور شاخیں خشک کر کے سفوف بنالیں، روزانہ تین ماشہ یہ سفوف استعمال کریں۔

کھانسی، دمہ اور سینے کے امراض میں مبتلا لوگ آم کے نرم تازہ پتوں کا جوشاندہ ارنڈی کے درخت کی چھال اور سیاہ زیرے کے سفوف کے ساتھ استعمال کریں۔

آم کی چھال قابض ہوتی ہے اور اندرونی جھلیوں پر نمایاں اثر کرتی ہے۔ اس لئے سیلان الرحم (لیکوریا) آنتوں اور رحم کی ریزش، پیچش، خونی بواسیر کے لئے بہترین دوا خیال کی جاتی ہے۔ ان امراض میں چھال کا سفوف یا تازہ چھال کا رس نکال کر اسے انڈے کی سفیدی یا گوند کے ساتھ دیا جاتا ہے۔

چھال کا رس چونے کے پانی کے ساتھ سوزاک میں ایک تیر بہدف دوا سمجھی جاتی ہے۔ تازہ چھال کا رس مرض آتشک کا بہترین علاج ہے۔ چھال سے نکلا ہوا گوند تلوؤں پر لگایا جاتا ہے۔ تیل اور عرق لیموں کے ساتھ بنایا ہوا مرہم خارش اور دوسرے امراض جلد میں استعمال کرایا جاتا ہے۔

آم کا کچا پھل (کیری) ترش اور مسہل ہونے کے علاوہ اسکربوط (مرض اسکروی) کو ختم کرتا ہے۔

کیری کے چھلکے کو گھی میں تل کر شکر ملا کر کھانے سے کثرت حیض میں فائدہ ہوتا ہے۔ یہ چھلکا مستوی اور قابض ہوتا ہے۔

آم کی گٹھلی کی گری قابض ہوتی ہے چونکہ اس میں بکثرت گیلک ایسڈ ہوتا ہے اس لئے پرانی پیچش، اسہال، بواسیر اور لیکوریا میں مفید ہے۔ پیچش میں آنتوں کو روکنے کے لئے گری کا سفوف دہی کے ساتھ دیا جاتا ہے۔ نکسیر بند کرنے کے لئے گری کا رس ناک میں ٹپکایا جاتا ہے۔

دستوں کی شکایت میں آم کی گٹھلی کا مغز فائدہ مند ہوتا ہے۔ خاص طور پر پرانی گٹھلی زیادہ مفید ہے۔ اسے باریک پیس کر تین گرام کی مقدار پانی کے ساتھ کھانے سے دست رک جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ خواتین کے مخصوص ایام میں خون زیادہ جاری ہو یا خونی بواسیر کی زیادتی سے روز بروز کمزوری بڑھ رہی ہو تو اس کے کھانے سے شکایت رفع ہو جاتی ہے۔

ایک عجیب کرشمہ

جب آم کے درخت پر پھول آئیں اور وہ خوشبو دینے لگے تو انہیں توڑ کر دونوں ہتھیلیوں میں اچھی طرح ملیں، جب سارے پھول ختم ہو جائیں تو مزید پھول لے کر تقریباً ایک گھنٹہ تک آم کے پھولوں کو ہتھیلیوں پر ملیں، اس کے تین چار گھنٹے بعد پانی سے ہاتھ نہ دھوئیں ایسا کرنے سے ہاتھ میں ایک حیرت انگیز تاثیر پیدا ہوگی جو کرشمہ سے کم نہیں ہے۔ جس جگہ بچھو، بھڑ وغیرہ کاٹے تو اس جگہ ہاتھ رکھنے سے فوراً درد اور جلن موقوف ہو جاتی ہے اور ہاتھوں میں یہ تاثیر ایک سال تک رہتی ہے۔



ماہ رمضان

سید عبدالرحمان شیخ

چونکہ اس میں مسلمان بھوک پیاس کی تپش برداشت کرتے ہیں یا یہ گناہوں کو جلا ڈالتا ہے اس لیے اسے رمضان کہا جاتا ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس مہینے کا نام رمضان رکھا گیا ہے کیونکہ یہ گناہوں کو جلا دیتا ہے۔''

رمضان المبارک کیا ہے؟

ماہ رمضان اللہ تعالیٰ کا مہینہ ہے کیونکہ رمضان المبارک کے ہر روزہ کا بدلہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ یہ ''رمضاء'' سے مشتق ہے۔ رمضاء موسم خریف کی بارش کو کہتے ہیں، جس سے زمین دھل جاتی ہے اور ''ربیع'' کی فصل خوب ہوتی ہے۔ چونکہ یہ مہینہ بھی دل کے گرد و غبار دھو دیتا ہے اور اس سے اعمال کی کھیتی ہری بھری رہتی ہے اس لیے اسے رمضان کہتے ہیں۔

ساون میں روزانہ بارشیں چاہئیں اور بھادوں میں چار۔ پھر اساڑ میں ایک۔ اس ایک سے کھیتیاں پک جاتی ہیں تو اسی طرح گیارہ مہینے برابر نیکیاں کی جاتی ہیں۔ پھر رمضان کے روزوں نے ان نیکیوں کی کھیتی کو پکا دیا یا یہ رمض سے بنا جس

کے معنی ہیں ''گرمی یا جلنا۔'' چونکہ اس میں مسلمان بھوک پیاس کی تپش برداشت کرتے ہیں یا یہ گناہوں کو جلا ڈالتا ہے اس لیے اسے رمضان کہا جاتا ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اس مہینے کا نام رمضان رکھا گیا ہے کیونکہ یہ گناہوں کو جلا دیتا ہے۔''

ماہ رمضان کے چار نام

ماہ مبارک کے کل چار نام ہیں اور یہ نام درج ذیل ہیں:

(1) ماہ رمضان، (2) ماہ صبر، (3) ماہ مواسات، (4) ماہ وسعت رزق

مزید یہ کہ روزہ صبر ہے جس کی جزا اللہ تعالیٰ خود دیتے ہیں اس لیے اس کو ماہ صبر کہتے ہیں۔

مواسات کے معنی ہیں بھلائی کرنا چونکہ اس مہینہ میں سارے مسلمانوں سے خاص کر اہل قرابت سے بھلائی کرنا زیادہ ثواب ہے اس لیے اسے ماہ مواسات کہتے ہیں۔

اس میں رزق کی فراخی بھی ہوتی ہے کہ غریب بھی نعمتیں کھا لیتے ہیں اس لیے اس کا نام ماہ وسعت رزق بھی ہے۔

امیر المومنین حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

''اس مہینے کو خوش آمدید ہے جو ہمیں پاک کرنے والا ہے۔ پورا رمضان خیر ہی خیر ہے دن کا روزہ ہو یا رات کا قیام۔ اس مہینے میں خرچ کرنا جہاد میں خرچ کرنے کا درجہ رکھتا ہے۔''

احکام رمضان

احکام رمضان کا علم، ان ضروری علوم میں سے ہے جنھیں سیکھنا ہر مکلف مسلمان پر فرض ہے جبکہ ان سے ناواقف اور بے بہرہ رہنے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔

علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ بعض علوم فرض عین یعنی ہر شخص پر فرض ہیں اور بعض فرض کفایہ ہیں یعنی اگر کسی ایک شخص نے بھی اسے حاصل کر لیا تو اس جگہ کے دوسرے تمام لوگوں سے اس کی فرضیت ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن کون سے علوم فرض عین ہیں اور کون سے فرض کفایہ؟ اس سلسلے میں ان کا اختلاف ہے تاہم ہر اس چیز کا علم حاصل کرنا فرض عین ہے جس سے ناواقفیت انسان کے لیے نقصان دہ ہو۔''

پھر چند ضروری احکام ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''رمضان کا روزہ فرض ہے، اس لیے روزہ دار کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ کون سی چیزیں اس کے روزے کو باطل کر دیتی ہیں اور کون سی چیزیں ایسی ہیں جن کے بغیر اس کا روزہ مکمل نہیں ہو سکتا۔''

اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ اس مہینے کے جن احکام کی معرفت ان کے لیے ضروری ہے ان سے متعلق دستیاب مفید کتابوں کا مطالعہ کریں اور اپنے اہل و عیال، عزیز و اقارب اور پڑوسیوں میں سے جو ان کتابوں کو نہیں پڑھ سکتے، کو بھی یہ احکام سکھانے کی کوشش کریں جس پر وہ اجر عظیم کے مستحق قرار پائیں گے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''بھلائی کی رہنمائی کرنے والا (اجر میں) ایسے ہی ہے جیسے اس پر عمل کرنے والا ہے۔''

(صحیح الجامع: ۳۳۹۳)

''(وہ تھوڑے دن) ماہ رمضان ہے جس میں قرآن مجید بھیجا گیا ہے جس کا ایک وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لیے ذریعہ ہدایت ہے اور دوسرا وصف واضح الدلالت ہے منجملہ ان کتب کے جو کہ (ذریعہ) ہدایت بھی ہیں اور (حق و باطل میں)

فیصلہ کرنے والی بھی ہیں۔''

یہ قمری مہینوں میں سے نواں مہینہ ہے اس کی وجہ تسمیہ حدیث میں یہ آئی ہے۔ فانہا ترمض الذنوب یہ رمض سے مشتق ہے اور رمض کے معنی لغت عربیہ میں جلا دینے کے ہیں۔ چونکہ اس مہینہ میں یہ خصوصیت ہے کہ مسلمانوں کو گناہوں سے پاک صاف کر دیتا ہے (بشرطیکہ) رمضان المبارک کا پورا احترام اور اس کے اعمال کا اہتمام کیا جائے) اس لیے اس کا نام رمضان ہے۔

رمضان کا استقبال کیسے کیا جائے؟

کتاب و سنت نے بعض مقامات اور اوقات کو کثرت اجر و ثواب کے ساتھ ممتاز کیا ہے۔ کسی مسلمان کے لیے عبادت کے ان اوقات و مقامات میں بے پروائی برتنا درست نہیں ہے بلکہ اسے عبادات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے اور ایک دوسرے پر سبقت کی کوشش کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''رغبت کرنے والوں کو اسی کی رغبت کرنی چاہیے۔''

(المطففین: ۲۶/۸۳)

اولوالعزم سلف صالحین عبادات کے دنوں کو غنیمت سمجھ کر ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا کرتے تھے اور ہمارے لیے سلف صالحین اور ان سے پہلے رسول اللہ ﷺ بہترین نمونہ ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ مندرجہ ذیل امور سے رمضان کا استقبال کریں جو کہ سال میں عبادت کا عظیم موسم ہوتا ہے۔

آمد رمضان کی بشارت

رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ صحابہ کرامؓ کو رمضان المبارک کی آمد کی یوں بشارت دیتے تھے:

''تمھارے پاس رمضان کا بابرکت مہینہ آیا ہے، اللہ تعالیٰ اس مہینہ میں تمھیں اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لیتا ہے وہ اپنی رحمت نازل کرتا ہے اور گناہوں کو مٹاتا ہے، نیز دعاؤں کو قبول کرتا ہے وہ تمھاری رغبت، چاہت اور جوش و خروش کو دیکھ کر فرشتوں پر فخر کرتا ہے، اس لیے تم اللہ تعالیٰ کو اپنی طرف سے بھلائی دکھلاؤ اور جو اس مہینہ میں اللہ کی رحمت سے محروم ہو گیا وہ انتہائی بدبخت ہے۔''

بشارت سننے والوں کے اندر خوشی اور سرور پیدا کرنے کا نام ہے اور رمضان جو بھلائیوں کا موسم ہے اس کے قریب آنے کی خبر سے بڑھ کر اور کون سی بشارت ہو سکتی ہے؟

مسلمانوں کو اس دعا کے ساتھ رمضان کا استقبال کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ انھیں رمضان کا مہینہ اس حال میں میسر کرے کہ وہ صحت و عافیت سے ہوں تاکہ وہ پوری نشاط اور حوصلہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت (مثلاً صیام، قیام اور ذکر و اذکار) کر سکیں۔

کتنے لوگ ہماری نظروں کے سامنے ہیں جو رمضان کا انتظار کرتے کرتے اس کی آمد سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔

انسان کیلئے روزہ مقرر ہونے کی وجوہ

ماہ رمضان میں روزہ رکھنے کی وجہ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ فرمائی ہے۔

''یعنی ماہ رمضان وہ بابرکت مہینہ ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا۔''

(البقرۃ: ۱۵۸/۲)

لہٰذا یہ مہینہ برکات الٰہیہ کے نزول کا موجب (سبب) ہے اس لیے اس میں روزہ رکھنے سے اصل

غرض جو لعلکم تتقون میں مذکور ہے بوجہ اکمل (کامل طریقے سے) حاصل ہو جاتی ہے۔

فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ اس کی عقل کو اس کے نفس پر غلبہ اور تسلط دائمی حاصل رہے مگر بباعث بشریت (انسان ہونے کی وجہ سے) اکثر اوقات اس کا نفس اس کی عقل پر غالب آتا ہے لہٰذا تہذیب و تزکیہ نفس کے لیے اسلام نے روزہ کو اصول میں سے ٹھہرایا ہے۔

1- روزہ سے انسان کی عقل کو نفس پر پورا پورا تسلط و غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔

2- روزہ سے خشیت اور تقویٰ کی صفت انسان میں پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ لعلکم تتقون۔ یعنی روزہ تم پر اس لیے مقرر ہوا کہ تم متقی بن جاؤ۔

3- روزہ رکھنے سے انسان کو اپنی عاجزی و مسکنت اور خدا تعالیٰ کے جلال اور اس کی قدرت پر نظر پڑتی ہے۔

4- روزہ سے چشم بصیرت کھلتی ہے۔

5- دور اندیشی کا خیال ترقی کرتا ہے۔

6- کشف حقائق الاشیاء ہوتا ہے (یعنی چیزوں کی حقیقتیں کھلتی ہیں)

7- درندگی و بہیمیت سے دوری ہوتی ہے۔

8- ملائکہ الٰہی سے قرب حاصل ہوتا ہے۔

9- خدا تعالیٰ کی شکر گزاری کا موقع ملتا ہے۔

10- انسانی ہمدردی کا دل میں ابھار پیدا ہوتا ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جس نے بھوک اور پیاس محسوس نہ کی ہو وہ بھوکوں اور پیاسوں کے حال سے کیونکر واقف ہو سکتا ہے اور وہ رزاق مطلق کی نعمتوں کا شکریہ علی وجہ الحقیقت کب ادا کر سکتا ہے۔ اگرچہ زبان سے شکریہ ادا کرے مگر جب تک اس کے معدہ میں بھوک اور پیاس کا اثر اور اس کی رگوں اور پٹھوں میں ضعف و ناتوانی کا احساس نہ ہو وہ نعمت ہائے الٰہی کا ماحقہ شکر گزار نہیں بن سکتا کیونکہ جب کسی کی کوئی محبوب و مرغوب و مالوف چیز کچھ زمانہ گم ہو جائے تو اس کے فراق سے اس کے دل کو اس چیز کی قدر معلوم ہوتی ہے۔

11- روزہ موجب صحت (صحت کا سبب) جسم و روح ہے۔ چنانچہ قلت اکل و شرب (کم کھانے اور پینے کو) اطباء نے صحت جسم کے لیے اور صوفیاء کرام نے صفائے دل کے لیے مفید لکھا ہے۔

12- روزہ انسان کے لیے ایک روحانی غذا ہے جو آئندہ جہاں میں انسان کو ایک غذا کا کام دے گی جنہوں نے اس غذا کو ساتھ نہیں لیا وہ اس جہان میں بھوکے پیاسے ہوں گے اور ان پر اس جہان میں روحانی فاقہ ظاہر ہوگا کیونکہ انھوں نے اپنی غذا کو ساتھ نہیں لیا اور یہ بات ماننے کے لائق ہے جب کھانے پینے کی تمام اشیاء خداوند تعالیٰ کے خزانہ رحمت سے انسان کو ملتی ہے تو جن اشیاء کو وہ یہاں چھوڑتا ہے اس کا عوض وہاں ضرور دے گا۔ جو یہاں سے بہتر و افضل ہوگا۔

13- روزہ محبت الٰہی کا ایک بڑا نشان ہے جیسے کہ کوئی شخص کسی کی محبت میں سرشار ہو کر کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے اور بیوی کے تعلقات بھی اس کو بھول جاتے ہیں ایسے ہی روزہ دار خدا کی محبت میں سرشار ہو کر اسی حالت کا اظہار کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ روزہ غیر اللہ کے لیے جائز نہیں ہے۔

رمضان المبارک کے روزے فرض ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کے روزوں کی بابت بار بار فرمایا ہے۔ فرض کا انکار کفر و ارتداد ہے۔ اس سے بھی روزے کی اہمیت واضح ہے۔

روزہ کا وقت مقرر کرنے کی وجہ

یہ بات ضروری ہے کہ روزہ کی ایک مقدار مقرر کی جائے تاکہ کوئی شخص اس میں افراط وتفریط نہ کر سکے لہٰذا امور مذکورہ کے لحاظ سے یہ بات ضروری ہوئی کہ ایک مہینہ تک ہر دن برابر کھانے پینے اور جماع کرنے سے نفس کو باز رکھنے کے ساتھ روزہ کا انضباط کیا جائے کیونکہ ایک دن سے کم مقدار کا مقرر کرنا تو ایسا ہے جیسا کہ دوپہر کے کھانے کو کچھ دیر کر کے کھانا اور اگر رات کو ان امور کے ترک کرنے کا حکم دیا جاتا تو لوگ اس کے عادی نہیں ہوتے اس کی وجہ سے ان میں کچھ پرواہ نہ ہوتی اور ہفتہ اور دو ہفتہ ایسی قلیل مقدار ہے کہ جس کا نفس پر چنداں اثر نہیں ہوتا۔ اور دو مہینے کی ایسی مقدار ہے کہ اس میں آنکھیں گڑ جائیں اور نفس تھک کر رہ جاتا۔

ان امور سے روزہ کے لیے یہ بات ضروری ہوئی کہ طلوع فجر سے غروب آفتاب تک دن کا انضباط کیا جائے کیونکہ عرب اسی کو دن شمار کرتے ہیں۔

رات کو روزہ مقرر نہ ہونے کی وجہ

چونکہ رات کا وقت بالطبع ترک شہوات ولذات کا ہے لہٰذا اگر رات کا وقت روزہ کے لیے قرار دیا جاتا تو عبادت کو عادت سے اور حکم شرع کے مقتضائے طبع سے امتیاز نہ ہوتا۔ اسی واسطے نماز تہجد، وقت تلاوت اور مناجات شب کو قرار دیا گیا۔

روزے کا مقصد

اس تعریف اور عمل سے ہی روزے کا وہ مقصد واضح ہو جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں روزے کا حکم دیتے ہوئے لعلکم تتقون (البقرۃ ۱۸۳/۲) کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو۔ تقویٰ کا مطلب ہے، دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر اور اس کا خوف اس طرح جاگزیں ہو جائے کہ ہر کام کرنے سے پہلے انسان یہ دیکھے کہ یہ جائز ہے یا ناجائز۔ حلال ہے یا حرام اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوگا یا ناراض۔

روزے سے یہ تقویٰ کس طرح حاصل ہوتا ہے؟ جب ایک مسلمان روزے کی حالت میں گھر کی چار دیواری کے اندر بھی جہاں اس کو کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا ہے نہ اس کا کوئی موجود ہوتا ہے وہ نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے اور نہ ہی بیوی سے اپنی جنسی خواہش پوری کرتا ہے، کیوں؟ محض اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے روزے کی حالت میں ان چیزوں سے منع فرمایا ہے۔ تو پورے ایک مہینے کی [illegible] مسلمان خلوص دل اور ذوق [illegible] [illegible] اس میں اللہ تعالیٰ کا خوف [illegible] ہوتا ہے اور یہ بات اس کے اندر [illegible] ہوتی ہے کہ جب روزے کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے حلال چیزوں سے بھی میں اجتناب کرتا رہا ہوں تو جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے حرام قرار دی ہوئی ہیں ان کا ارتکاب مجھے کس طرح جائز ہو سکتا ہے یا اگر مجھے اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہے تو میں اللہ تعالیٰ کی ناراضی والے کام کیوں کروں۔

رمضان المبارک کی خصوصیت

اللہ تعالیٰ نے اس ماہ مبارک کو بہت سے فضائل وفیوض کی وجہ سے دوسرے مہینوں کے مقابلے میں ایک ممتاز مقام عطا کیا ہے۔ جیسے

- اس ماہ مبارک میں قرآن مجید کا نزول ہوا۔

شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن

(البقرۃ ۱۸۵/۲)

- اس کے عشرہ اخیر کی طاق راتوں میں ایک قدر کی رات ہوتی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے۔

رنگے ہاتھوں

○......بیوی نے شوہر کو فون کیا اور بولی: کیا کر رہے ہو؟
شوہر: آفس میں ہوں اور بہت مصروف ہوں اور تم کیا کر رہی ہو ڈارلنگ۔
بیوی: کے ایف سی میں ہوں اور تمہارے پیچھے بیٹھی ہوں۔

وقت

○ لڑکا شیخ سے: آپ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کر دیں میں اس کے وزن کے برابر آپ کو سونا دوں گا۔
شیخ: مجھے کچھ وقت دو۔
لڑکا: سوچنے کے لیے۔
شیخ نہیں۔ بیٹی کا وزن بڑھانے کے لیے۔

لیلۃ القدر خیر من الف شھر
''شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔''
(القدر: ۳/۹۷)

ہزار مہینے 83 سال 4 مہینے بنتے ہیں۔ عام طور پر ایک انسان کو اتنی عمر بھی نہیں ملتی۔ یہ امت مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے اسے اتنی فضیلت والی رات عطا کی۔

◆ رمضان کی ہر رات کو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جہنم سے آزادی عطا فرماتا ہے۔

◆ سرکش شیاطین کو جکڑ دیا جاتا ہے۔

◆ اللہ تعالیٰ روزانہ جنت کو سنوارتا اور مزین فرماتا ہے اور پھر جنت سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ میرے نیک بندے اس ماہ میں اپنے گناہوں کی معافی مانگ کر اور مجھے راضی کر کے تیرے پاس آئیں گے۔

◆ رمضان کی آخری رات میں روزے داروں کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ اگر انھوں نے صحیح معنوں میں روزے رکھ کر ان کے تقاضوں کو پورا کیا ہوگا۔

◆ جب تک روزے دار روزہ افطار نہیں کر لیتے، فرشتے ان کے حق میں رحمت و مغفرت کی دعائیں کرتے رہتے ہیں۔

◆ روزے دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے ہاں کستوری کی خوشبو سے زیادہ پاکیزہ اور خوشگوار ہے۔

یہ اس مہینے کی چند خصوصیات اور فضیلتیں ہیں۔ اب ہمیں سوچنا ہے کہ ہم کیسے اس کا استقبال کریں۔ کیا ویسے ہی جیسے ہر مہینے کا استقبال ہم اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں اور لاپروائیوں سے کرتے ہیں۔ یا اس انداز سے کہ ہم اس کی خصوصیات اور فضائل سے بہرہ ور ہو سکیں اور جنت میں داخلے کے اور جہنم سے آزادی کے مستحق ہو سکیں۔

اللہ تعالیٰ کے نیک بندے اس کا استقبال اس طرح کرتے ہیں کہ غفلت کے پردے چاک کر دیتے ہیں اور بارگاہ الٰہی میں توبہ و استغفار کے ساتھ یہ عزم صادق کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اس ماہ مبارک کی عظمتوں اور سعادتوں سے ایک مرتبہ پھر نوازا ہے تو ہم اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے اس کی فضیلتیں حاصل کریں گے اور اپنے اوقات کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے، اعمال صالحہ بجا لانے اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں سمیٹنے میں صرف کریں گے۔

اس لیے ضروری ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ اس مہینے کے کون سے وہ اعمال صالحہ ہیں جن کی خصوصی فضیلت اور تاکید بیان کی گئی ہے۔

چومہری

کرسٹینا برانڈ

"بات یہ ہے لوسی!" لزی نے اٹکتے ہوئے کہا "وہ گولیاں ذرا خاص قسم کی ہیں۔ ڈاکٹر فیصل مجھے وہ گولیاں دینے پر تیار نہیں تھے میرے شدید اصرار پر انہوں نے دی تھیں۔ میں دراصل اس منحوس عادت سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہی ہوں اور ڈاکٹر فیصل میری مدد کر رہے ہیں۔ اگر وہ میری وجہ سے بدنام ہو گئے تو مجھے بہت قلق ہوگا۔

ایک قیمتی ہار کی داستان، چوروں نے بڑی محنت سے اسے چرایا تھا

"اوہ مادام! کتنا خوش گوار اتفاق ہے۔ آپ سے اس اتفاقی ملاقات پر مجھے بے پایاں مسرت ہوئی"۔ اجنبی نے خوش اخلاقی سے کہا حالانکہ دل میں وہ یہ سوچ رہا تھا کہ بوڑھی چڑیل لعنت ہے تجھ پر۔ میں اس اتفاقی ملاقات کے لئے پورے دو گھنٹے سے ریستوران کے قریب منڈلا رہا ہوں۔

عورت کا نام گلیڈی تھا وہ ایک دولت مند ضعیفہ کی گھریلو ملازمہ تھی۔ اس کی مالکہ کا نام لیڈی بیلچٹ تھا۔ اس خوش اخلاق اجنبی سے گلیڈی کی ملاقات ایک ہفتے قبل اسی ریستوران میں ہوئی تھی اس روز گلیڈی بازار سے سودا سلف خرید کر واپس جا رہی تھی واپسی سے پہلے شیری کا ایک جام پینا اس کا معمول تھا۔ وہ اپنے معمول کے مطابق شیری کا جام پینے کے لئے ریستوران میں پہنچی۔ اس نے ایک خالی



بیٹھی تھی مگر چند لمحوں بعد شگفتہ مزاج اجنبی بھی اس کی میز پر آ گیا۔ اس کا نام اسمتھ تھا۔ مسٹر اسمتھ کی شائستگی اور عمدہ طبیعت نے گلیڈی کو بہت متاثر کیا۔ مسٹر اسمتھ کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ گلیڈی جیسی باوقار خاتون محض ایک گھریلو ملازمہ ہو سکتی ہے۔ [illegible] نے باتوں باتوں میں گلیڈی سے پوچھ لیا کہ وہ [illegible] ہے اور کیا کرتی ہے۔ پھر گلیڈی سے یہ [illegible] وہ ایک گھریلو ملازمہ ہے اسمتھ نے ہمدردی کے طور پر بھی پوچھ لیا کہ اس کی مالکن کس طبیعت کی [illegible] ہے۔ گلیڈی نے شکایت کے لہجے میں [illegible] لیڈی [illegible] خود غرض عورت ہے [illegible] [illegible] ہے۔ اگر میری طبیعت [illegible] ہے تو وہ یہ تک نہیں پوچھتی کہ میں [illegible] یا نہیں۔ گلیڈی عموماً ہوٹل میں [illegible] اس کا سو جھ بوجھ [illegible] تھی۔ مگر جس پر [illegible] رنگ جما چکی ہو انہیں دوسروں کی بات سننے کا ہوش کہاں رہتا ہے۔ اور پھر ایسے لوگوں میں یہ بہت بُری عادت ہوتی ہے وہ دوسروں کی بات بھی سے نہیں سنتے۔ درمیان سے جملہ اچک کر اپنی داستان شروع کر دیتے ہیں۔ اسمتھ کا شمار ان لوگوں میں نہیں تھا اس نے گلیڈی کی ہر بات پوری توجہ سے سنی۔ ایسے اچھے لوگ کہاں ملتے ہیں جو اپنے ہوش و حواس میں دوسروں کے دکھ بانٹتے ہوں اور درمیان میں قطعی دخل نہ دیتے ہوں۔ گلیڈی نے پہلی ہی ملاقات میں اس فرشتہ صفت مہربان کے سامنے اپنی زندگی کی کتاب کھول کر رکھ دی تھی۔ مسٹر اسمتھ کے تبصرے بہت مخلصانہ اور ہمدردانہ تھے۔

’’مادام!‘‘ اسمتھ نے کہا ’’یہ کیسا پُر مسرت اتفاق ہے کہ آپ سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ میں [illegible] ایک پیگ پینے آیا تھا۔ [illegible] گلیڈی نے [illegible]

’’شکریہ مسٹر اسمتھ‘‘ گلیڈی نے دعوت قبول کر لی ’’لیکن میں زیادہ دیر نہیں رک سکوں گی۔ [illegible] پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔ لیڈی بیلچٹ ٹھیک مقررہ وقت پر دروازہ مقفل کر دیتی ہے اور [illegible] کے چند جام پینے کے بعد سے جو پیاس [illegible] [illegible] ایسا ہو گیا تو مجھے ساری رات [illegible] [illegible] پڑے گی۔‘‘

’’خیر یہ تو آپ مبالغے سے کام لے رہی ہیں‘‘ اسمتھ نے چسکی لی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] نہیں [illegible] انہیں [illegible] ہے۔ گلیڈی نے بتایا ’’مسٹر اسمتھ! آپ لیڈی کی احتیاط پسندی کا علم نہیں۔ دروازے اور کھڑکیاں مقفل کرنا میری ذمہ داری ہے۔ میں اپنی ذمہ داری مستعدی سے پوری کرتی ہوں۔ اس کے باوجود لیڈی روزانہ خود ہر دروازہ ہر کھڑکی چیک کرتی ہے اور سونے سے پیشتر کئی کئی بار دیکھتی ہے۔ فرض کیجیے اگر میں کوئی دروازہ غیر مقفل بھی چھوڑ آؤں تو واپسی پر وہ مجھے مقفل ملے گا۔ لیڈی خصوصاً میری غیر موجودگی میں بہت زیادہ محتاط ہو جاتی ہے۔ میں آپ کو کیا بتاؤں مسٹر اسمتھ!‘‘ گلیڈی نے رازدارانہ انداز میں کہا ’’وہ مکان نہیں قلعہ ہے قلعہ۔‘‘ اس نے حفاظتی انتظامات کی تفصیل بیان کی اور کہا ’’لیڈی بے چاری بہت خوف زدہ رہتی ہے خاص طور پر سورج غروب ہونے کے بعد اس کا خوف انتہائی بڑھ جاتا ہے۔‘‘

اسمتھ کو لیڈی کے خوف کی وجوہ گزشتہ ملاقات میں معلوم ہو چکی تھی۔ گلیڈی نے بتایا تھا کہ لیڈی

بلیچٹ نے اپنے شوہر کی وصیت میں گڑبڑ کر کے ساری دولت پر تنہا قبضہ کرلیا ہے۔ اس کی گڑبڑ بہت جامع اور بے عیب تھی' اسے قانونی گرفت میں نہیں لیا جاسکتا۔ قانون کی طرف سے لیڈی مطمئن ہے مگر اسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ خاندان کا کوئی فرد انتقاماً اسے قتل نہ کردے۔ لیڈی کو سب سے زیادہ ڈر اپنے شوہر کی بھتیجی سے لگتا ہے یہ بھتیجی سکاٹ لینڈ میں رہتی ہے غالباً بلیچٹ نے جو دولت سنبھالی ہے اس میں بیشتر حصہ اسی بھتیجی کا ہے۔ لیڈی کو پورا یقین تھا کہ کسی روز وہ سوتے میں قتل کردی جائے گی۔ اسی لیے وہ ساری دولت سمیٹ کر ملازموں کے ساتھ سکاٹ لینڈ سے یہاں چلی آئی۔ یہاں کا پتا کسی رشتے دار کو نہیں معلوم۔ لیکن لیڈی کے خوف میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ... اپنی قوت برداشت سے ... وہ شراب پینے لگی ہے۔

معلوم ہوتا ہے لیڈی صاحبہ سٹھیا گئی ہیں مگر آپ تو بہت سمجھ دار عورت ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا آپ اس سنکی بڑھیا کے ساتھ کیوں رہتی ہیں۔'' اسمتھ نے حیرت سے پوچھا۔

''وہاں مجھے تنخواہ بہت اچھی ملتی ہے۔'' گلیڈی نے جواب دیا۔'' میں اتنی اچھی ملازمت کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ مجھے اپنے علاوہ اپنے بھائی کا خیال بھی ہے۔ میرا بھائی ذہنی مریض ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ اسے کسی عام خیراتی پاگل خانے میں داخل کیا جائے۔ آپ تصور نہیں کرسکتے' پاگل ہونے سے پہلے وہ کیسا شان دار نوجوان تھا۔ کیا بتاؤں' کتنے بڑے بڑے لوگ اس کے دوست تھے۔ وہ خود بھی انتہائی قابل.....''

اسمتھ گزشتہ ملاقات میں گلیڈی کے بھائی کی شان دار شخصیت اور بے انتہا قابلیت سے متعارف ہوچکا تھا۔ یہ گلیڈی کا سب سے زیادہ پسندیدہ موضوع تھا۔ اس موضوع پر وہ گھنٹوں بے تکان بول سکتی تھی۔ اسمتھ نے جلدی سے دستی گھڑی دیکھی اور گلیڈی کو یاد دلایا کہ دروازے مقفل ہونے کا وقت قریب ہے۔ گلیڈی گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ اسمتھ نے سکون کی سانس لی۔ وہ گلیڈی کو مکان کے بیرونی دروازے تک پہنچا کر آیا۔ یہ جگہ ریستوران سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ایک طویل سی گلی میں دونوں طرف مکانات تھے' گلی آگے جا کر بند ہوجاتی تھی۔ گلی کے نکڑ پر ایک طرف ریستوراں تھا' دوسری طرف تھانہ۔

اسمتھ واپس اپنے فلیٹ پہنچا تو لوری اس کی منتظر تھی۔ اس کی نیلی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں اور رخسار دہک رہے تھے۔ اسمتھ نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا ''بہت خوش نظر آرہی ہو؟''

''وہ ڈیئر! ڈاکٹر فیبل تو بالکل سیدھا سادہ آدمی نکلا اسے نہایت آسانی سے بے وقوف بنایا جاسکتا ہے۔''

''گویا تمہارا مشن کامیاب رہا؟'' اس کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔

لوری نے یہ بات فوراً محسوس کرلی۔''اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔ ڈیئر تمہی نے تو کہا تھا ڈاکٹر فیبل کو پھانسنا بہت ضروری ہے کیوں کہ اس کا کلینک لیڈی بلیچٹ کے مکان کے عین سامنے ہے۔''

''تو تم ڈاکٹر کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہوگئیں؟''

لوری نے چٹکی بجائی۔'' وہ بے چارہ تو میرے جال میں پھنس گیا''۔ اس کا لہجہ پرجوش تھا۔'' زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی وہ بس ایک دو اداؤں پر مر مٹا۔ سارا کام منصوبے کے مطابق ہوا۔ میں اس نے

آخری مریض تھی۔ میں واپس آنے لگی تو پتہ ہے اس نے کیا کہا؟ کہنے لگا ڈیئر لزی! رُک جاؤ' ابھی بھی کیا جلدی' ایک گلاس شیری تو پی لو۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔ مریض اور ڈاکٹر کے رشتے کا کچھ تو احترام کیجئے''۔

''تم شیری پینے کے لئے رُک گئیں؟''

''ہاں اور کیا کرتی لیکن بدگمانی نہ کرو میں تنہا نہیں تھی' میں نے ڈاکٹر کی استقبالی نرس لوسی کو بھی بلا لیا تھا۔ اسے ڈاکٹر نے ابھی کچھ دن پہلے ملازم رکھا ہے۔ ڈاکٹر تو مجھ پر فدا ہو ہی گیا تھا۔ لوسی بھی میری دوست بن گئی۔'' لزی نے ایک تو بہ شکن انگڑائی لے کر آنکھیوں سے ایڈگر کی طرف دیکھا۔ تم سناؤ' لیڈی بلیچٹ سے تمہارے تعلقات کہاں تک پہنچے؟''

ایڈگر نے اسے پوری روداد سنائی۔''وہ مکان واقعی ایک قلعہ ہے۔ چٹخنیاں اور زنجیریں اور خود کار قفل' نہ جانے کیا کیا ہے وہاں۔ ایک مرتبہ اندر گھسنے کے بعد چابی کے بغیر باہر نکلنا ممکن نہیں۔ میں نے ملازمہ گلیڈی سے فرمائش کی کہ وہ کوئی دروازہ یا کھڑکی کھلی چھوڑ دے لیکن یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ اول تو گلیڈی میں ایسا کرنے کی ہمت نہیں' دوم اگر وہ ہمت کر بھی لے تو ہمیں وہ دروازہ کھلا ہوا نہیں ملے گا۔ بڑھیا اسے مقفل کر چکی ہوگی اور گلیڈی کو سخت سست الگ کہے گی۔ وہ اپنی بھتیجی سے انتہائی خوف زدہ ہے۔ دروازوں اور کھڑکیوں کی طرف سے ایک لمحے بھی غافل نہیں رہتی۔''

''پھر بھی اس کی بھتیجی اس سے انتقام لے کر رہے گی۔'' لزی نے کہا ''اور جہاں تک میرا تعلق ہے' میں سچے موتیوں کے ہار پر اکتفا کرلوں گی۔''

''مکان میں ہار کے سوا کچھ ہے بھی نہیں۔ بڑھیا ہر چیز بینک والٹ میں رکھتی ہے۔''

دوسری شام انہوں نے اپنے منصوبے پر عمل شروع کردیا۔ دروازے پر ہلکی ہلکی دستک ہورہی تھی۔ گلیڈی نے دروازہ کھولا فرشتہ خصلت مسٹر اسمتھ اس کے سامنے کھڑے تھے۔''معاف کیجئے گا مادام! میں نے آپ کو زحمت دی......''

''مسٹر اسمتھ! آپ کو یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔'' گلیڈی نے سہمے ہوئے انداز میں پلٹ کر اندر دیکھا۔

مہربان! اجنبی غیرمحسوس طور پر آگے بڑھ آیا۔''میں وعدہ کرتا ہوں'' آئندہ کبھی نہیں آؤں گا۔'' بات یہ ہے مادام کہ کل رات میرا سگریٹ لائٹر کھو گیا ہے وہ بیش قیمت تو نہیں تھا لیکن اس سے مجھے جذباتی وابستگی بہت زیادہ ہے ممکن ہے' آپ نے اسے دیکھا ہو......''

''میں نے آپ کا لائٹر نہیں دیکھا۔ گلیڈی جلدی سے جواب دے کر دروازہ بند کرنے لگی۔

''میں نے سارا ریستوراں چھان مارا مگر لائٹر نہیں ملا۔'' وہ ایک قدم اور آگے بڑھ گیا۔ گلیڈی کے لئے دروازہ بند کرنا ممکن نہیں رہا۔''میں نے سوچا ممکن ہے' آپ نے لائٹر اپنے سامان کے تھیلے میں ڈال دیا ہو۔ آپ مجھ سے باتیں کرتے وقت لائٹر سے کھیل رہی تھیں۔ ایسی باتیں غیر شعوری طور پر ہر شخص سے سرزد ہوجاتی ہیں۔'' اسمتھ کی آواز اضطرابی کیفیت میں بلند ہونے لگی۔

گلیڈی نے گھبرا کر دوبارہ اندر دیکھا۔''نہیں' نہیں یہ ناممکن ہے۔''

''مادام! اگر آپ ایک نظر اپنا تھیلا دیکھ لیں تو مجھے اطمینان ہوجائے گا۔ اس زحمت کے لئے میں بے حد شرمندہ ہوں''۔

''مہربانی کرکے آواز اونچی نہ کیجئے۔ لیڈی باہر آجائے گی۔ آپ کے اطمینان کے لئے میں تھیلا

دیکھے لیتی ہوں۔"

گلیڈی عجلت اور گھبراہٹ میں باورچی خانے کی طرف گئی تو دروازہ کھلا رہ گیا۔ وہ اسمتھ جیسے مہربان آدمی پر دروازہ بند کر بھی نہیں سکتی تھی۔ یہ بات تہذیب کے خلاف ہوتی ایسا سلوک تو چوروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

گلیڈی بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھیلے میں بھرے ہوئے سامان کے نیچے چاندی کا لائٹر چمک رہا تھا۔ وہ لائٹر اٹھا کے تیزی سے پلٹی اسمتھ کو جلد از جلد رخصت کرنا ضروری تھا۔ اس نے ندامت سے لائٹر اسمتھ کے حوالے کردیا۔ اسمتھ اس کا تہہ دل سے شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔ وہ شکریہ ادا کرنے میں حق بجانب تھا کیونکہ اسی دو منٹ کے وقفے میں لزی مکان میں گھس کر ایک جگہ چھپ چکی تھی۔

گلیڈی کا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ لیڈی بیلچیٹ نے کچھ عرصے سے اتنے زینے چڑھنا ترک کردیا تھا۔ ان کی خواب گاہ پہلی منزل پر تھی۔ گلیڈی نے اپنا رہنا سہنا بہت آرام دہ بنا رکھا تھا۔ رات کو کھانا کھا کے وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر کشیدہ کاری کرنے لگتی اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے باہر نکل کر نیچے نظر کرلیتی۔ ایڈگر نے لزی کو مکان کا پورا نقشہ سمجھا دیا تھا۔ یہ معلومات اسے گلیڈی سے حاصل ہوئی تھیں وہ جانتا تھا کہ دوسری منزل پر تین کمرے ہیں ایک کمرہ ملازمہ کی خواب گاہ ہے باقی دو کمرے مہمانوں کے لئے خالی پڑے رہتے ہیں' ان میں بھی کوئی مہمان نہیں آتا۔

لزی مکان میں گھس کر سیدھی دوسری منزل پر پہنچی اور بالکل آخری کمرے میں چھپ گئی۔ کمرے کی کھڑکی بند تھی' ہر چیز پر گرد نے ڈیرا جما رکھا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے لزی کو کچھ پریشانی ضرور ہوئی مگر آسائش کی ہر چیز موجود تھی۔ غسل خانہ' آرام دہ بستر اور الماری میں شب خوابی کا لباس۔

آدھی رات کو لزی نے سیڑھیاں چڑھنے اور باتیں کرنے کی آواز سنی وہ سمجھ گئی کہ گلیڈی اپنی مالکہ کو سہارا دے کر نیچے سے اوپر لے جارہی ہے۔ اب لیڈی بیلچیٹ کل دوپہر تک سوتی رہے گی۔ کچھ دیر بعد گلیڈی کے کمرے کا دروازہ بند ہوا پھر پورے مکان پر سکوت چھا گیا۔

دوسرے دن گیارہ بجے معمول کے مطابق گلیڈی نے اپنی مالکہ کی خواب گاہ کا دروازہ کھولا اور اندر جھانک کر دیکھا لیڈی گہری نیند میں خراٹے لے رہی تھی۔ سچے موتیوں کا ہار آدھا تکیے کے نیچے تھا آدھا باہر گلیڈی ہی چند لمحوں تک موتیوں کی ٹھنڈی روشنی دیکھتی رہی پھر دودھ والے نے عقبی دروازہ کھٹکھٹایا گلیڈی نیچے چلی گئی۔ دودھ لے کر وہ اندر آئی تو اسے لیڈی کی خواب گاہ سے عجیب و غریب آوازیں سنائی دیں وہ دوڑتی ہوئی اوپر پہنچی اس کی آنکھوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا لیڈی کا سر اور چہرہ اور آدھا بدن دو تین چادروں میں بری طرح لپٹا ہوا تھا۔ لیڈی بستر پر ایسے مچل رہی تھی جیسے کوئی اسے زبردستی ذبح کر رہا ہو۔ اس کے حلق سے جگر خراش آوازیں نکل رہی تھیں۔ گلیڈی نے اسے ہاتھ لگایا لیڈی بیلچیٹ کے حلق سے ایک دہشت ناک چیخ نکلی اس نے تڑپ کر اپنی ملازمہ سے علیحدہ ہونا چاہا۔ اس کوشش میں وہ مسہری سے نیچے گر پڑی۔ گلیڈی نے چلا چلا کے مشکل سے اسے یقین دلایا کہ وہ اس کی ملازمہ ہے۔ اسکاٹ لینڈ والی بھتیجی نہیں ہے پھر اس نے لیڈی کو چادروں سے رہائی دلائی۔ لیڈی نے مسہری کے سرہانے کی طرف اشارہ کیا۔ گلیڈی کو اس ہار کا خیال آیا جو لیڈی تکیے کے نیچے رکھ کر سوتی تھی۔ اس نے تکیہ ہٹا کر دیکھا' مسہری کے نیچے جھانک کر دیکھا پھر خواب گاہ کا کونا

کو تو پھان مارا لیکن سچے موتیوں کا ہار غائب تھا اور ہار کے ساتھ دروازے کی چابی بھی۔ اس نے فوراً تھانے فون کیا کہ یہ واردات محض چند منٹ قبل ہوئی ہے پولیس اگر فوراً گلی کے نکڑ پر پہرا لگا دے تو ممکن ہے چور فرار ہوتے ہوئے پکڑ لیا جائے۔ گلی کے ایک سرے پر تھانہ تھا۔ دوسرا سرا بند تھا۔ اتفاق دیکھیے پچھلے دس منٹ سے ایک کانسٹیبل تھانے کے باہر کھڑا تھا اس نے بتایا کہ اس دوران کوئی شخص نہ گلی میں داخل ہوا نہ گلی سے باہر نکلا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چور ابھی گلی ہی میں ہے ہوسکتا ہے وہ گلی کے کسی مکان میں چھپ گیا ہو۔ تھانے کا پورا عملہ اس سنہرے موقع پر اپنی کارکردگی دکھانے کے لئے فوراً حرکت میں آگیا۔

لزی صبح جلدی بیدار ہوگئی تھی۔ اس نے شب خوابی کا لباس اتار کر دوبارہ الماری میں لٹکایا، اپنے کپڑے پہنے اور میک اپ کر کے تیار ہوگئی۔ اس کے پرس میں میک اپ کی چیزوں کے علاوہ ایک چیز اور تھی۔ اسے گیارہ بجنے کا انتظار تھا۔ گیارہ بجے وہ حرکت میں آنے والی تھی۔ دودھ والے کی دستک اور ملازمہ کے سیڑھیاں اترنے کی آواز سنتے ہی لزی نے اپنا کام شروع کر دیا پھر صرف چند منٹ بعد وہ اطمینان کے ساتھ مکان کے داخلی دروازے سے باہر نکلی اور ٹہلتی ہوئی گلی عبور کر کے ڈاکٹر فیلن کے کلینک میں پہنچ گئی۔ استقبالی نرس اسے دیکھ کر کھل گئی

"اوہ مس لزی! آج تو آپ جلدی آگئیں۔"

"کیا میں جلدی آگئی؟" لزی نے حیرت ظاہر کی۔ "ایسا نہیں ہوسکتا میں تو ہمیشہ وقت پر آتی ہوں پھر جلدی آنے کا کیا سوال۔"

نرس نے ملاقاتی ڈائری کھول کر لزی کے سامنے رکھ دی۔ "خود دیکھ لیجئے، آپ کا وقت ساڑھے گیارہ کا تھا۔"

"اوہ، کوئی بات نہیں۔ میں پندرہ بیس منٹ انتظار کرلوں گی۔" اس نے وقت گزاری کے لئے ایک رسالہ اٹھالیا۔ اسی وقت ڈاکٹر کے کمرے سے ایک مجہول سا مریض برآمد ہوا۔ لزی دلچسپی سے اس کی مضحکہ خیز اور ناقابل فہم حرکتیں دیکھتی رہی بعد میں اس نے خوب نمک مرچ لگا کے اس کی حرکتیں تفصیل سے بیان کیں۔

ساڑھے گیارہ بجے لزی اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ اٹھلاتی ہوئی ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر کو اس نے بتایا کہ اس کا سردرد بدستور موجود ہے۔ ڈاکٹر فیلن کو کوئی تعجب نہیں ہوا۔ اس نے اس بات پر لزی سے اتفاق کیا کہ درد کے مکمل علاج کے لئے شاید اسے کئی بار آنا پڑے۔

"آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے نا؟" لزی نے ایک ادا سے پوچھا۔ "وہی گولیوں کا نیا ڈبا دینے کا وعدہ۔ آپ نے کہا تھا کہ وہ آپ کو کسی دوا ساز کمپنی کی طرف سے مفت ملتا ہے۔ اوہ ڈاکٹر! آپ بہت اچھے ہیں بہت ہی اچھے! مجھے مفت دوا دیتے ہیں۔"

"بس یہ آخری ڈبا ہے۔" ڈاکٹر نے لزی کو کارڈ بورڈ سے بنا ہوا سفید رنگ کا ایک گول ڈبا دیتے ہوئے کہا، اس سربمہر ڈبے پر پلاسٹک چڑھا ہوا تھا۔ "اگر ان گولیوں سے فائدہ نہ پہنچا تو مجھے دوسری دوائیں لکھنی پڑیں گی آئندہ آؤ تو بتانا کہ گولیوں سے فائدہ ہوا یا نہیں۔"

"ضرور ڈاکٹر صاحب! ضرور۔ اب کے میں شام کے وقت آؤں گی تاکہ آپ کی عمدہ شیری پھر چکھ سکوں۔"

لزی نے کمرے سے باہر نکل کر استقبالی کاؤنٹر پر اپنا پرس رکھا، دستانے اتارے اور پرس کھول کر ڈائری نکالی۔ ڈائری کے صفحات الٹتے ہوئے وہ نرس سے مذاق کرتی رہی، آخر اسے ایک تاریخ ایسی نظر

عاشقانِ رسول کی خدمت میں

سیارہ ڈائجسٹ کی ایمان افروز اور لازوال پیشکش



فرمانِ رسولؐ

شائع ہو گیا ہے

اللہ کے آخری پیغمبرؐ کے ارشاداتِ گرامی کا ایک بے نظیر، دلکش و مقدس
خزینہ جو عام انسانیت کی ظاہری اور باطنی زندگیوں کی مکمل فلاح کا باعث ہے

244 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور
فون نمبر 7245412

آ گئی جس کی شام خالی تھی' اس نے نرس سے اس تاریخ کے لئے وقت لیا اور کسی لطیفے پر بے تحاشا قہقہے لگاتی کلینک سے نکل گئی۔ ڈاکٹر فیصل سے ملنے والا ڈبا وہ کاؤنٹر پر بھول آئی تھی۔ نرس لوسی کاؤنٹر سے نکل کے لزی کے پیچھے بھاگی لیکن اتنی دیر میں لزی خاصی دور جا چکی تھی۔ نرس نے لوٹ کے گولیوں کا سفید ڈبا شوکیس میں رکھی ہوئی بے شمار دواؤں کے ساتھ رکھ دیا۔

لزی گلی کے سرے پر پہنچی۔ ایک کانسٹیبل نے راستہ روک کے اسے تھانے چلنے کا اشارہ کیا۔ چوری کی سنسنی خیز واردات سن کر لزی کے گال تمتمانے لگے۔ ''اوہ بالکل ٹی وی کی طرح''۔ اس نے تالی بجائی۔ پولیس والوں کی ناک کے نیچے' ڈاکٹر فیصل کے کلینک کے عین سامنے والے مکان سے سچے موتیوں کے ہار کی چوری' وہ بھی دن دیہاڑے۔ کیا پولیس اسے بھی مشتبہ افراد میں شمار کرے گی؟ کیا اس کی بھی جامہ تلاشی لی جائے گی؟ اوہ اسے تلاشی دینے کی کتنی تمنا ہے۔ بس پولیس والوں کی چٹکیوں سے ڈر لگتا ہے۔ پولیس نے اسے یقین دلایا کہ جامہ تلاشی کے دوران چٹکیاں نہیں لی جائیں گی' اس کی تلاشی ایک لیڈی کانسٹیبل لے گی۔

لیڈی کانسٹیبل نے تلاشی لی، لزی کو بہت مزا آیا۔ تلاشی کا نتیجہ صفر نکلا۔ لزی کا پرس کھنگالا گیا۔ اس میں میک اپ کی چیزوں کے علاوہ ایک سر بمہر ڈبا بھی تھا۔ پولیس نے مہر توڑ کر ڈبا کھولا۔ ڈبے سے سفید سفید گولیاں برآمد ہوئیں۔ کئی گولیاں توڑ توڑ کر دیکھی گئیں لیکن خلاف توقع ان کے اندر سے سچے موتی نہیں نکلے۔ پولیس والوں کو بے حد مایوسی ہوئی۔ جیسی سنسنی خیز واردات تھی' ویسا ہی سنسنی خیز اختتام بھی ہونا چاہئے تھا۔ ٹی وی اور فلموں کی ایسی وارداتوں میں کوئی نہ کوئی خوب صورت لڑکی ضرور ملوث ہوتی ہے۔ لزی نے پولیس کی مایوسی سے لطف اٹھاتے ہوئے کہا ''انسپکٹر! میں نے ڈاکٹر فیصل کے کلینک میں ایک انتہائی مضحکہ خیز آدمی دیکھا تھا۔ مجھے یقین ہے چور وہی شخص ہوگا۔''

''کون مضحکہ خیز آدمی؟''

''مجھے اس کا نام نہیں معلوم۔ میں وہاں اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے کمرے سے نکلا' نرس اس وقت ایک اور مریض سے باتیں کر رہی تھیں اس آدمی نے اپنی جیب سے گلابی دوا کی شیشی نکالی اور اسے منہ سے لگا کے اس طرح دوا پینے لگا جیسے ہم کوکا کولا پیتے ہیں۔'' پولیس کی دلچسپی اس مضحکہ خیز آدمی میں بڑھ گئی حالانکہ وہ لزی سے پہلے آ چکا تھا اور اس کی تلاشی بھی ہو چکی تھی۔ وہ ابھی تھانے ہی میں تھا۔ اس کی تلاشی بیکار ثابت ہوئی تھی۔ پھر لزی نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ''وہ اچھل کر اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا اور دیوار پر آویزاں ایک تصویر کے پاس جا کر بہت غور سے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے خوب اچھی طرح ٹٹول ٹٹول کر تصویر دیکھی' چاروں طرف سے اور فریم کا بھی ٹھوک بجا کے معائنہ کیا۔ تصویر بہت واہیات تھی میرا خیال ہے ڈاکٹر فیصل نے غلطی سے الٹی لٹکا رکھی ہے۔ خیر وہ شخص کچھ دیر تک تصویر کا معائنہ کرتا رہا پھر اس نے کھڑے کھڑے دوبارہ دوا کی شیشی نکالی اور بچی ہوئی ساری دوا حلق میں انڈیل لی پھر چلا گیا''۔

اس آدمی کی دوبارہ تلاشی لی گئی۔ دو پولیس والے فوراً کلینک کی طرف دوڑے کلینک میں تصویر اب بھی موجود تھی۔ پولیس کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ تصویر الٹی لٹکی ہوئی ہے یا سیدھی۔ انہوں نے فریم کے شیشے پر پاؤڈر چھڑکا اس پر دستانوں کے نشانات ابھر آئے' کہیں کہیں گلابی دھبے بھی پڑے ہوئے تھے۔ فریم کھول کر دیکھا گیا' شیشہ نکالا گیا' کینوس الٹا پلٹا گیا لیکن سچے

موتیوں کا ایک دانہ بھی نہیں مل سکا۔

ہار چوری ہونے میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا تھا' ملازمہ گلیڈی گیارہ بجے کے قریب اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی لیڈی ہیلچٹ کا بیان تھا کہ رات کو سوتے وقت اس نے ہار گلے سے نکال کر اپنے ہاتھوں سے تکیے کے نیچے رکھا تھا۔ یہ چوری گیارہ بجے کے لگ بھگ چند منٹ کے وقفے میں ہوئی تھی اور اس کے بعد کوئی شخص گلی سے گزر کر باہر نہیں گیا تھا۔ گویا چور مسروقہ مال سمیت اب تک گلی میں موجود تھا۔ لیڈی ہیلچٹ کی ملازمہ گلیڈی شکوک و شبہات سے بالا تھی۔ لیڈی ہیلچٹ کی ملازمت میں اسے بارہ سال بیت گئے تھے۔ اس سے پہلے وہ ایک معزز خاندان میں دس سال ملازمت کرچکی تھی۔ اس کا ماضی اور کردار بے داغ تھا۔ ڈاکٹر فیصل ایک نیک نام اور کامیاب معالج تھے۔ ان پر بھی شک نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ان کی استقبالی نرس مس لوسی کا ماضی بھی بے داغ تھا۔ لوسی کو ڈاکٹر فیصل کی ملازمت میں تو زیادہ دن نہیں گزرے تھے لیکن گزشتہ بیس سال سے وہ آدھے درجن ڈاکٹروں کے پاس ملازمت کرچکی تھی ان سب نے اسے بہترین کردار کے تصدیق نامے دیئے تھے۔ آس پڑوس کے مکانوں میں تفتیش جاری تھی' خصوصاً پولیس ان مریضوں کے بارے میں چھان بین کررہی تھی جو اس صبح ڈاکٹر فیصل کے کلینک میں آئے تھے۔ پہلی مریضہ ایک حاملہ تھی' اس کا قیام سنگٹن میں تھا۔ دوسرا مریض وہی مضحکہ خیز آدمی تھا' تیسری ایک مریضہ تھی اسے کم خوابی کا مرض تھا' چوتھی مس لزی تھی۔ یہ سب لوگ تھانے میں جمع تھے۔ لزی کھسک کر استقبالی نرس مس لوسی کے قریب ہوگئی اور سرگوشی میں بولی ''میں نے کہا' لوسی! میں گولیوں کا ڈبا تمہارے پاس بھول آئی تھی۔''

''میں نے اٹھا کے شیلف میں رکھ دیا ہے' تم مطمئن رہو'' نرس نے اسے تسلی دی۔

''بات یہ ہے لوسی!'' لزی نے اٹکتے ہوئے کہا ''وہ ......وہ گولیاں ذرا خاص قسم کی ہیں۔ ڈاکٹر فیصل مجھے وہ گولیاں دینے پر تیار نہیں تھے' میرے شدید اصرار پر انہوں نے دی تھیں۔ میں دراصل اس منحوس عادت سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کررہی ہوں اور ڈاکٹر فیصل بے چارے اس سلسلے میں میری مدد کررہے ہیں۔ اگر وہ میری وجہ سے بدنام ہوگئے تو مجھے بہت قلق ہوگا۔ میں خود کو بھی معاف نہیں کروں گی۔ اگر تم میری مدد کرو تو ہم ڈاکٹر فیصل جیسے نیک انسان کو بدنامی سے بچاسکتے ہیں۔''

''میں ہر طرح تیار ہوں' مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''تم پولیس سے یہ ذکر نہ کرنا کہ میں کوئی ڈبا بھول آئی تھی۔ ممکن ہے' پولیس کلینک کی تلاشی لے اس لئے ڈبا وہاں سے اٹھا کر کسی جگہ چھپا دینا۔ پولیس کی اس پر نظر پڑ گئی تو یہ لوگ خوامخواہ اُلٹے سیدھے سوالات کریں گے' اس سے ڈاکٹر فیصل کی بے وجہ بدنامی ہوگی۔''

''ٹھیک ہے' فکر نہ کرو۔''

''یہ بات ہمارے درمیان راز رہے تو اچھا ہے۔ ڈاکٹر فیصل کو بھی مت بتانا' میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ گولیوں کی بات کسی سے نہیں کہوں گی۔''

''میں بھی نہیں کہوں گی۔''

پولیس نے مضحکہ خیز مریض کو ہر طرح ٹٹولا۔ اس کے پیٹ کا بھی ایکسرے کرایا گیا لیکن پیٹ میں موتی ہوتے تو نکلتے اس کی انگلیوں کے نشانات عادی مجرموں کے ریکارڈ سے ملائے گئے یہ کوشش کامیاب ثابت ہوئی پتہ چلا کہ یہ مضحکہ خیز مریض وہی شخص ہے جو لیڈی ہیلچٹ کی ملازمہ گلیڈی سے مسٹر اسمتھ کے نام سے ملتا تھا۔ اس کا اصل نام اسمتھ نہیں ایڈگر تھا اور

پولیس جانتی تھی کہ ایڈگر ایک عادی مجرم ہے اور وہ جواہر چرانے میں ماہر تصور کیا جاتا ہے۔ مزید تفتیش سے یہ بات سامنے آئی کہ ایڈگر حال ہی میں لندن آیا ہے۔ اس کے طریقہ کار کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ تنہا کام نہیں کرتا اور اپنے ساتھی بدلتا رہتا ہے۔ پولیس نے اس کے ساتھیوں کا سراغ لگانے کی کوشش کی تو یہ اطلاع ملی کہ ڈاکٹر فیصل، نرس لوسی، مس ٹری اور دوسرے دو مریض کبھی اس کے ساتھی نہیں رہے۔ یہ ضرور پتہ چلا کہ اس نے حال [illegible] لیڈی بیکچپٹ کی ملازمہ گلیڈس سے [illegible] ملاقاتیں کی تھیں۔ ان ملاقاتوں کا مقصد یہ تھا [illegible] لیڈی بیکچپٹ [illegible] سے زیادہ معلومات [illegible] بعض گواہوں نے بتایا کہ ایڈگر گزشتہ شام لیڈی بیکچپٹ [illegible] دروازے [illegible] گلیڈس سے باتیں [illegible] لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ [illegible] چار بجے [illegible] کے بعد بھی بار بار بیکچپٹ کے بنگلے میں موجود تھا۔ نرس لوسی نے بتایا کہ ایڈگر ڈاکٹر فیصل کے پاس دو روز قبل آیا تھا اسے پیٹ میں درد کی شکایت تھی اور اسے [illegible] آج شام گیارہ بجے [illegible] ملاقات کا وقت [illegible] ان تمام باتوں سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ ایڈگر کے ارادے نیک نہیں تھے اور وہ کسی جرم کی منصوبہ بندی کر رہا تھا لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا تھا کہ ہار اس نے کہاں چھپایا ہے۔

تھانے کا پورا عملہ نہایت سرگرمی سے تفتیش میں مصروف تھا اور مذکورہ مشتبہ افراد کی مسلسل تواضع کی جا رہی تھی۔ مشتبہ افراد ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے تھے اور آپس میں گفتگو کرنے لگے تھے۔ ایک موقع پر ایڈگر نے تلخی سے ٹری کو مخاطب کیا۔ ”آپ نے تو مجھے چور بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی مس! آپ نے یہ نہیں سوچا کہ میں دوا کی بوتل جیب میں کیوں ڈالے پھرتا ہوں؟ اطلاعاً عرض ہے پیٹ کا درد میرے لئے ناقابل برداشت ہوتا ہے لہٰذا جیسے ہی میں درد کے آثار محسوس کرتا ہوں فوراً دو چار گھونٹ دوا پی لیتا ہوں اس طرح درد میں افاقہ ہو جاتا ہے۔ رہا تصویر کا مسئلہ سو مجھے پورا یقین ہے کہ وہ تصویر اُلٹی لٹکا دی گئی ہے۔ میں یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اگر تصویر سیدھی لٹکائی جائے تو کیسی نظر آئے گی۔ اتنی سی بات کا آپ نے پہاڑ بنا دیا۔ میرے لئے خواہ مخواہ مصیبت پیدا ہو گئی۔“

ٹری نے [illegible] کوشش کر کے [illegible] آواز [illegible] نے کا اشارہ کیا اور سرگوشی میں [illegible] لگی۔ [illegible] دیکھنے والوں نے محسوس کیا کہ [illegible] [illegible] تمہارے پیچھے لگ گئی ہے۔

”[illegible] کب [illegible] دے گا؟“

”[illegible] پولیس تمہیں پریشان [illegible] دو تین روز [illegible] ہوتے [illegible] تمہیں زیادہ پریشان نہیں کیا جا سکے گا۔ تم اپنے منصوبے کے مطابق مجھ سے بعد میں رابطہ قائم کر لینا۔“

”دیکھو ٹری! مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرنا میں اچھا آدمی نہیں ہوں۔“

”میں بھلا تمہیں دھوکا دوں گی! [illegible] تو میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔“

چند روز بعد پولیس کا جوش و خروش سرد پڑ گیا۔ ٹری ایک شام ڈاکٹر فیصل کے کلینک میں داخل ہوئی۔ نرس لوسی کوٹ پہن کر کلینک مقفل کرنے والی تھی۔ اس نے ٹری کو بتایا ”ڈاکٹر صاحب چلے گئے ہیں تم [illegible] بہت دیر سے آئیں۔“ ٹری کو پہلے سے معلوم تھا کہ

ڈاکٹر صاحب چلے گئے ہیں۔ اس وقت وہ ان سے ملنے نہیں آئی تھی۔ "تم گولیوں کا ڈبا لینے آئی ہو؟" نرس نے کوٹ اتارتے ہوئے انتظار گاہ کھولی۔

"ممی نے...... میں نے ضبط کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ حوالات میں ان گولیوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔"

"بے شک مجھے پورا احساس ہے۔" نرس میز کے کونے پر بیٹھ گئی پھر اس نے براہ راست لزی کی آنکھوں میں دیکھا۔ "بات یہ ہے مس لزی! مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ وہ گولیاں کیسی ہیں۔"

لزی کا ماتھا ٹھنکا لیکن وہ لفظوں کی جنگ میں آسانی سے شکست ماننے والی نہیں تھی۔ "وہ تو میں نے خود بتایا تھا لوسی تم کو۔"

"آپ نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس ڈبے میں گولیاں نہیں ہیں۔"

"اوہ" لزی کے منہ سے بس یہی نکل سکا۔

"آپ سے ایک غلطی ہوگئی۔" نرس نے کہا۔ "آپ نے مجھے بالکل بیوقوف سمجھ لیا تھا۔ آپ کا خیال تھا کہ میں دوا دارو جمع کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوں۔ تھانے میں بیٹھے بیٹھے ایک بار آپ نے اپنا میک اپ درست کرنے کے لئے پرس کھولا تھا۔ اتفاقاً میری نظر پرس میں رکھے ہوئے ڈبے پر پڑ گئی‘ مجھے معاً آپ کی یہ ہدایت یاد آئی کہ میں دوسرے ڈبے کا کسی سے ذکر نہ کروں۔ ظاہر ہے میرا تجسس بیدار ہوگیا۔ میں نے کلینک آ کے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ گولیوں کا ڈبا کھول کر دیکھا۔

"گویا! ابھی کشتی پوری نہیں ڈوبی" لزی نے سوچا۔ لوسی نے ڈبا کھول کر ہار دیکھ لیا تھا لیکن پولیس کو اطلاع نہیں دی۔ سچ ہے دنیا میں ہر شخص کی ایک قیمت ہوتی ہے" "کیا تم نے کسی سے اس کا ذکر کیا؟"

"نہیں......" نرس نے انکار میں سر ہلایا۔ "میں تمہیں پہلی ہی ملاقات میں پسند کرنے لگی تھی۔ تمہارا رویہ بہت دوستانہ تھا۔ اس کے برعکس لیڈی بلیچٹ سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی نہ اس کے متعلق میں نے کبھی کوئی اچھی بات سنی۔ اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ کسی کو اطلاع دینے سے پہلے تمہاری کہانی سن لوں تاکہ بعد میں میرا ضمیر مجھے پریشان نہ کرسکے اور میں جو قدم اٹھاؤں سوچ سمجھ کر اٹھاؤں۔"

لزی نے ایک گہری سانس لی۔ شاید ابھی کچھ نہیں بگڑا‘ شاید میں لوسی کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاؤں۔ "بات یہ ہے لوسی کہ لیڈی بلیچٹ میری چچی ہیں میرے چچا کی موت کے بعد لیڈی بلیچٹ نے ان کی وصیت میں تحریف کرکے ہمارے حصے کے بیس ہزار پاؤنڈ ہضم کرلئے اور چپ چاپ اسکاٹ لینڈ سے فرار ہوکر یہاں روپوش ہوگئیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا‘ وہ ویسے بھی غلط تھا لیکن اب میرے ڈیڈی کے انتقال سے ہمارے حالات بہت زیادہ خراب ہوگئے ہیں۔ میری ممی بہت بیمار ہیں‘ ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے‘ جوان اور خوب صورت ہیں مگر بیماری نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔ بیس یا دس یا پانچ ہزار پاؤنڈ میری ممی کو نئی زندگی بخش سکتے ہیں‘ وہ کچھ دن اور زندہ رہ سکتی ہیں۔ ایک رات کا واقعہ سنو‘ ہمارے گھر میں ایک چور گھس آیا۔ میں نے اسے پکڑ لیا۔ اس پر سب سے زیادہ حیرت خود مجھے ہوئی۔ میں نے اسے کمرے میں بند کردیا پھر مجھے اچانک ایک خیال آیا اس خیال کے تحت میں نے پولیس کو بلانے کے بجائے چور سے ایک معاہدہ کرلیا۔ میں اسکی مدد سے اگر اپنا پورا نہیں تو کچھ حصہ ضرور حاصل کرنا چاہتی تھی۔ سچے موتیوں کا ہار میرے حصے کی پہلی قسط ہے اور معاہدے کے مطابق آدھے ہار کا حق دار چور ہے۔ تم سمجھ گئی ہوگی کہ اس چور کا نام ایڈگر ہے۔" لزی نے ہنس ہنس کر پولیس کو خوبصورتی

سے غلط راستے پر ڈالنے کا قصہ بیان کیا۔ پولیس ایڈگر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اس نے ہار کو ہاتھ بھی نہیں لگایا' اس کیخلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ ہاں اگر تم نے یہ واقعہ طشت ازبام کردیا تو اور بات ہے لیکن مجھے معلوم ہے تم اتنی سنگ دل نہیں ہو تم ضرور میری مدد کرو گی۔؟'' لزی نے التجا آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔ ''کیا میں ہار آپ کے حوالے کردوں؟'' نرس نے سادگی سے سوال کیا۔

لزی اسے بھی حصے کی پیشکش کرنا چاہتی تھی اس کا منہ کھل بھی گیا تھا لیکن ابھی اس کا موقع نہیں آیا تھا۔ ''پلیز لوی! میں تم سے درخواست کرتی ہوں۔'' لزی نے نظر جھکا کے کہا۔

نرس نے اُٹھ کر شیلف میں رکھا ہوا سفید ڈبا اٹھایا اور دوبارہ میز کے کونے پر بیٹھ گئی۔ وہ چند لمحے ڈبے سے کھیلتی رہی پھر اس نے خوش گوار انداز میں کہا۔ ''آدھا آدھا۔''

''آدھا آدھا۔'' لزی نے دہرایا۔

''آدھا حصہ میرا' باقی آدھا تم دونوں کا''۔ لوی نے وضاحت کی۔ لزی نے جھپٹ کر ڈبا اس کے ہاتھ سے چھین لیا مگر وہ خالی تھا۔ لوی مسکرائی۔ ''مجھے تم سے یہی توقع تھی اس لئے میں نے ہار پہلے ہی ایک جگہ چھپا دیا تھا۔ وہ قطعاً محفوظ ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔''

''آدھا آدھا'' لزی نے دوبارہ پوچھا۔

''ہاں' جلدی سے فیصلہ کرلو۔'' لوی نے جواب دیا۔

لزی کا ذہن تیزی سے کوئی راہ ڈھونڈ رہا تھا اچانک اسے لوی کی ایک کمزوری نظر آئی۔ اس نے سوچا کہ ممکن ہے وہ اس کمزوری سے فائدہ اٹھا سکے لیکن پہلے اسے تمام پہلوؤں پر سوچنا پڑے گا۔ چند لمحوں بعد وہ بولی۔ ''قانون کی نظر میں قبضہ سچا ہوتا ہے ہار تمہارے قبضے میں ہے۔ اس صورت میں تم آدھا حصہ مجھے اور ایڈگر کو کیوں دینا چاہتی ہو؟ سارا مال خود ہضم کیوں نہیں کرلیتی؟''

''میں کوئی عادی مجرم نہیں ہوں۔'' نرس نے سادگی سے جواب دیا۔ ''میں چوری کا ہار فروخت کیسے کروں گی۔''

''اچھا آدھا آدھا؟''

''ہاں آدھا آدھا۔''

''کوئی دوسرا راستہ؟''

''نہیں'' لوی ڈٹی رہی۔

''قبضہ سچا ہوتا ہے۔'' لزی نے کچھ سوچتے ہوئے دہرایا۔ ''لیکن چوری کے مال کا قبضہ کبھی سچا نہیں ہوتا۔ فرض کرو میں اپنے حصے کی قربانی دے کر پولیس کو یہ بتا دوں کہ مال تمہارے پاس ہے؟''

''بتا کے دیکھو پھر دیکھنا تمہارا کیا حشر ہوتا ہے۔'' اس جملے کے باوجود لوی کی خود اعتمادی متزلزل ہوتی نظر آئی۔

''میرا کچھ نہیں بگڑے گا' صرف تمہارا حشر خراب ہوگا''۔ لزی نے بے پروائی کا اظہار کیا۔ ''چوری کا مال ویسے بھی اونے پونے بکتا ہے۔ اس کا چوتھائی حصہ بنے گا ہی کتنا' اتنی ہی رقم کے لئے میں اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لوں حصہ وصول کرکے تو میں اس جرم میں برابر کی شریک ہوجاؤں گی سردست میرے ہاتھ صاف ہیں۔''

''تمہارے ہاتھ صاف ہیں؟'' نرس نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

''ہاں۔'' لزی نے شانے اچکائے۔ ''میرے ہاتھ صاف ہیں پولیس کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ایڈگر سے میرا کوئی تعلق ہے۔ ایڈگر کا بیان نہایت دلچسپ ہوگا۔ وہ پولیس کو اطلاع دے گا کہ ہار تم نے چرایا تھا اور اسے فروخت کرنے کے لئے اس سے رابطہ قائم

کیا تھا۔ اسی لئے وہ دو روز تک کلینک میں تمہارے پاس آیا۔ پیٹ کا درد محض ایک بہانہ تھا۔ وہ بتا دے گا کہ ہار تمہارے پاس ہے اور چوری کی واردات میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ تمہیں معلوم نہیں' ایڈگر بہت ذہین آدمی ہے۔ وہ پولیس کو آسانی سے بے وقوف بنا کر تمہیں پھنسوا دے گا اور خود صاف بچ جائے گا۔ تمہارے خلاف اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ ہار تمہارے قبضے میں ہے۔ ایڈگر کےخلاف پولیس کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتی۔ باقی رہ گئی میں تو میرے ہاتھ بالکل صاف ہیں' میرا ایڈگر سے اور اس واردات سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔"

"تمہاری ترکیب اچھی خاصی ہے لیکن اس میں ایک جھول ہے۔" نرس نے کہا۔"ذرا سی تفتیش پر یہ پتہ چل جائے گا کہ تم لیڈی بلیچٹ کی وہ بھتیجی ہو جس سے لیڈی خوف زدہ رہتی ہے کیوں کہ اس کے پاس جو کچھ ہے تمہارا ہے۔ پولیس کو یہ سوچنا پڑے گا کہ عین واردات کے وقت لیڈی بلیچٹ کی پیاری بھتیجی اس کے مکان کے سامنے کیا کر رہی تھی اور کیا وہ اسکاٹ لینڈ سے لندن محض اپنا علاج کرانے کیلئے آئی تھی۔"

"لوسی جان! تم اتنی بھولی ہو نہیں جتنی نظر آتی ہو۔ چچی بھتیجی والی داستان سناتے وقت میں سمجھ گئی تھی کہ تم نے اس پر یقین نہیں کیا ہے' ٹھیک ہے نا؟"

نرس نے اثبات میں سر ہلایا۔"یہ کہانی تم نے یہیں بیٹھے بیٹھے تراشی تھی تا کہ میری ہمدردی جیت کے تم ہار مفت حاصل کر لو میں تمہاری کہانی پر یقین کر ہی نہیں سکتی تھی۔ لیڈی بلیچٹ بہت بوڑھی عورت ہے تمہاری عمر کی کوئی لڑکی اس کی بھتیجی کیسے ہو سکتی ہے۔ اور پھر تمہاری جوان خوبصورت اور بیمار ممی کے جوڑ کا تو جواب ہی نہیں بھلا اس لنگڑی کہانی پر کون یقین کرے گا۔ اگر لیڈی بلیچٹ کی واقعی کوئی بھتیجی ہے تو اس کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان ہوتی

چاہئے"۔

لزی کی آنکھوں سے پردے ہٹنے لگے۔

"تمہاری طرح؟"

"ہاں' میری طرح۔" نرس نے جواب دیا۔

لزی احتراماً جھک گئی۔"تو تمہی اسکاٹ لینڈ والی بھتیجی ہو؟"

"اور تم ایک پیشہ ور چور ہو؟"

لزی کے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ لوسی کو ورثے سے محروم ہو کر ملازمت کرنی پڑی اور اس دوران وہ اپنی چچی کا سراغ لگاتی رہی۔ جب وہ اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی تو اس نے ڈاکٹر فیصل کے ہاں ملازمت کر لی تا کہ بوڑھی چچی کے قریب رہ کر کسی طرح اس کی محبت حاصل کر سکے پھر ممکن ہے چچی اپنی زندگی میں اسے اس کا ورثہ واپس کر دے یا کم سے کم اپنی وصیت میں اسے اپنی وارث نامزد کر دے۔ لیکن شاید چچی سے ملاقات کا شرف اسے اب تک نصیب نہیں ہوا تھا۔لزی اسکرٹ درست کرتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ میرا خیال ہے آدھا آدھا حصہ ایک مناسب تجویز ہے۔ لوسی! اب ہمیں اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔"

لیڈی بلیچٹ نے گھنٹی بجا کر گلیڈی کو طلب کیا۔ گلیڈی فوراً پہنچی۔ لیڈی نے اسے اجنبیوں کو گھریلو راز بتانے کی حماقت پر ایک طویل لیکچر دیا۔ لیکچر میں آخرت کے عذاب اور جنت و جہنم کا ذکر بھی تفصیل سے کیا گیا تھا۔ پھر کہنے لگی:

"لیکن میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں ایک موقع اور دوں اور کچھ عرصے تمہاری حرکات پر کڑی نظر رکھوں اگر تم نے آئندہ ایسی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا تو میں تمہیں کھڑے کھڑے نکال دوں گی۔"

گلیڈی کو اس تنبیہ پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ اس

نے لیڈی بلیچٹ کے ساتھ بارہ سال یوں ہی نہیں گزارے تھے۔ اس مدت میں اس نے خود کو لیڈی کی ذات کا ایک ناقابل تقسیم حصہ بنا لیا تھا۔ وہ بولی۔ ''بہت شکریہ میڈم! آئندہ مجھ سے کبھی ایسی غلطی نہیں ہوگی۔''

لیڈی نے بتایا۔ ''بیمہ کمپنی نے مجھے ہار کی قیمت ادا کر دی ہے۔ اب میں خود کو پہلے سے بہتر محسوس کر رہی ہوں۔''

''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے میڈم!'' گلیڈی نے اس طرح کہا جیسے اس کے سر سے بہت بڑا بوجھ اُتر گیا ہو۔ ''اب آپ نیا ہار خرید سکتی ہیں۔ ہار کے بغیر...... میرا مطلب ہے، میں نے آپ کے گلے میں وہ ہار ہمیشہ دیکھا ہے۔ اب اس کی غیر موجودگی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔''

''میرا ایسا کوئی ارادہ......'' لیڈی نے جملہ مکمل کرنے سے پہلے آئینہ دیکھا۔ اسے اپنی ابھری ہوئی ہڈیاں نظر آئیں' یہ ہڈیاں ہار کی وجہ سے دب جاتی تھیں لیڈی پہلے سے زیادہ بوڑھی نظر آ رہی تھی۔

''شاید تم ٹھیک کہتی ہو گلیڈی۔''

''پہلے جیسا ہار تو نہیں مل سکے گا'' گلیڈی نے رنجیدگی سے کہا ''لیکن میرا خیال ہے دو لڑیوں والا ہار کچھ نہ کچھ تلافی ضرور کر دے گا ممکن ہے آپ کو دو لڑیوں والے ہار کی تجویز پسند نہ آئے......'' لیکن لیڈی کو یہ تجویز پسند آ گئی تھی۔ اگر دو لڑیوں والے ہار پر اوپر سے بھی کچھ رقم خرچ کرنی پڑی تو مضائقہ نہیں ہے۔ پیسے بینک میں پڑے پڑے کیا فائدہ پہنچا رہے ہیں۔

چوری کی واردات سے گلیڈی بہت خوش تھی۔ اس کے لئے وہ کئی سال سے محنت کر رہی تھی۔ اس نے شراب خانے جا کر ہر بدمعاش چہرے کو موتیوں کے ہار کے راز سے آگاہ کیا تھا اور حفاظتی انتظامات کی تفصیل بتائی تھی تاکہ چور کو ہار چرانے میں پریشانی نہ ہو۔ اب تو اسے یہ شک ہونے لگا تھا کہ شاید انگلینڈ کے تمام چوروں نے چوری سے توبہ کر لی ہے۔ بھلا ہو اس فرشتہ صفت مسٹر اسمتھ کا اس نے ساری مشکل آسان کر دی۔ ہار کی فروخت کی ساری رقم گلیڈی نے اس ہسپتال کو بھیج دی تھی، جس میں اس کے عظیم بھائی کے ذہنی مرض کا علاج ہو رہا تھا۔ یہ رقم ساری زندگی نہیں چل سکتی تھی۔ کبھی نہ کبھی ختم ہو جاتی پھر اس کو بھائی کسی عام پاگل خانے میں داخل کر دیا جاتا۔ عام پاگل خانے میں اسے اپنے سے کم تر لوگوں کے درمیان رہنا پڑتا۔ یہ بات اس کی شان کے خلاف تھی۔ اس خیال نے گلیڈی کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ اب اسے ایک نئے ہار کی ضرورت تھی تاکہ اسے بیچ کے وہ اس کی رقم بھی ہسپتال بھیج دے۔ اس کے بعد چاہے اسے موت آئے یا وہ گرفتار کر لی جائے اسے کوئی پروا نہیں تھی۔

جوہری ایک شاندار دکان کے عقبی حصے میں لوسی' لزی اور ایڈگر نے جوہری سے ملاقات کی۔ جوہری ایک مخصوص آلے سے لیڈی بلیچٹ کے ہار کا معائنہ کر رہا تھا۔ ایڈگر لزی اور لوسی کی بے تاب نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ ''بلاشبہ اچھے موتی ہیں'' جوہری نے آلہ ایک طرف رکھتے ہوئے ایڈگر کو مخاطب کیا۔ ''کسی فن کار نے بنائے ہیں۔ میں اس ہار کے پچیس پاؤنڈ دے سکتا ہوں''۔ تینوں کے پیروں سے زمین نکل گئی۔ وہ بے یقینی سے جوہری کو دیکھتے رہ گئے۔

گلیڈی اپنے کمرے میں ہسپتال کی انتظامیہ کو انہماک سے خط لکھ رہی تھی۔



محمد سلیم اختر

”پیار کی خاطر“

اگلے ہی لمحے بریف کیس کھل گیا اور سارے زیورات و جواہرات فرش پر دور دور تک بکھر گئے۔ وہ خود ان دو پولیس افسروں کی گرفت میں جھول رہا تھا۔ میں حیرت میں گم پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے گھورتی چلی گئی مجھے یقین نہیں آرہا تھا میں یہ کیا دیکھ رہی تھی؟ ڈکیتی کا منصوبہ اس نے بنایا تھا؟ اس پر کون شک کرسکتا تھا؟

ایک شاطر کی کہانی جس نے لوٹ کا بے عیب منصوبہ بنایا تھا مگر......

میرے سارے احساسات فنا ہوچکے تھے۔ البتہ ایک احساس باقی تھا کہ میرا سر درد سے پھٹا جارہا تھا۔ یقیناً میرا کوئی نام بھی ہوگا لیکن کیا؟...... میرا کوئی گھر بھی ہوگا...... لیکن کہاں؟

اچانک دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور ایک دبلے پتلے کشیدہ قامت نوجوان نے اس کا خلاء پُر کردیا۔ اس کے ہونٹ تقسیم لیکن چہرہ سپاٹ تھا۔

”جاگ گئیں؟“ اس نے بے نیازی سے پوچھا۔

میرے درد میں خوف اور دہشت شامل ہوگئی۔ میں یہاں کیا کررہی تھی؟ میں واضح طور پر سوچ سکتی تھی جو میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب کیوں نہیں تھا؟ میرا ذہن بالکل سپاٹ ہورہا تھا یوں گویا کسی نے اس پر پردہ تان کر میرا رابطہ باقی دنیا سے منقطع کردیا ہو۔ میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولنا چاہا لیکن میرے ہونٹ

سختی سے بند تھے' کسی نے ان پر ٹیپ چپکا دیا تھا......
مجھے ٹونی کو خبردار کر دینا چاہیے۔ اچانک مجھے خیال آیا اور پھر یہی خیال بار بار میرے ذہن میں گردش کرنے لگا لیکن یہ ٹونی کون تھا؟ میں ایک عجیب سے کشمکش میں مبتلا ہوگئی۔ میں یہاں اس کمرے میں تھی میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں دن کا وقت تھا پھر میں یہ سمجھنے سے قاصر کیوں تھی کہ میرے ساتھ کیا پیش آ رہا ہے۔

''دھیرے دھیرے سوچو میں نے خود سے کہا۔ حواس باختہ ہونے کی ضرورت نہیں سوچو صرف سوچو۔''

وہ آدمی کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا اور پھر اس نے ایک سگریٹ سلگا کر اخبار کی تہہ کھول لی۔

ہفتہ 21 ......میں نے پڑھا۔ یہ یقیناً آج کی تاریخ ہوگی۔ اخبار بالکل تازہ اور غیر شکن آلود لگ رہا تھا پھر میں کل کہاں تھی؟ پچھلی رات؟ میرے ذہن نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں بالکل خالی الذہن ہو رہی تھی۔ مجھے ٹونی کو خبر کر دینا چاہیے۔ میں نے پھر سوچا لیکن کس بات سے؟ میں نے کمرے میں نظر دوڑائی یہ ایک مختصر سی خواب گاہ تھی۔ دیواروں پر مٹے مٹے سے وال پیپر تھے۔ کھڑکی پر معمولی سا پردہ تھا۔ ایک ہتھے والی کرسی تھی اور ننگا چوبی فرش جس پر میں پڑی تھی۔ میرے نتھنوں سے سگریٹ کا دھواں ٹکرایا مجھے کھانسی آ گئی لیکن ہونٹوں پر چپکے ہوئے ٹیپ نے مجھے کھانسنے سے باز رکھا۔ میں دہشت زدہ ہوگئی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ اس آدمی نے اخبار کا صفحہ پلٹا اور دھوئیں کا رخ بدل دیا۔

میں نے اپنے پیروں کو دھیرے دھیرے سے حرکت دی۔ وہ بندھے ہوئے نہیں تھے۔ مارے خوشی کے میرا دل اچھل کر گویا حلق میں آ گیا۔ ساتھ ہی رگ رگ میں اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میں چل سکتی تھی۔ یہاں سے بھاگ سکتی تھی کم از کم امید کی ایک کرن تو تھی۔ دفعتاً کھڑکی پر بارش کی بوچھاڑ پڑی اس آدمی نے سپاٹ نظروں سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ نچلی منزل سے کسی چیز کے تلنے کی اشتہا انگیز بو آنے لگی۔ میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ میں نے پچھلی بار کھانا کب کھایا تھا؟

''بھاگ کے آؤ'' نیچے سے کسی نے پکارا۔

اس آدمی نے آدھ جلے سگریٹ کا ٹکڑا بجھایا اور کھڑکی کھول کر اسے باہر پھینک دیا۔ پھر میری طرف دیکھنے کی زحمت کیے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ میں نے کروٹ لے لی۔ میرے سر کے درد میں اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ کھڑکی...... کاش میں اسے صرف کھول سکتی۔ میں نے کوشش کی اور ذرا سی کوشش سے کسی شرابی کی مانند جھولتی ہوئی...... اپنے پیروں پر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بارش کے قطرے کھڑکی کے شیشوں سے اپنا سر جوڑ رہے تھے۔ باہر کھڑکی کے نیچے ایک سپاٹ چھت تھی۔ کسی قسم کی توسیع ہوگی۔ میں احتیاط سے کھڑکی کی چوکھٹ پر بیٹھ گئی اور اس کے پٹ سے طبع آزمائی کرنے لگی۔ میرا دل دہشت سے کانپ رہا تھا۔ اگر وہ آدمی پلٹ آتا تو نہ جانے کیا ہوتا لیکن مجھے ہر قیمت پر اس موقع سے فائدہ اٹھانا تھا۔ کھڑکی بڑی آسانی سے کھل گئی۔ بارش کی بوچھاڑ اور یخ ہواؤں نے میرا سواگت کیا۔ میں شرابور ہوگئی۔ تاہم چوکھٹ کو تھام کر کھڑکی کے باہر لٹک گئی۔ وہ چھت میری توقع سے کہیں نیچے تھی۔ پھر بھی میں نے چوکھٹ چھوڑ دی اور دھپ سے چھت پر جا گری۔ اس کے ساتھ ہی میرا خون منجمد ہوگیا۔ کیا ان لوگوں نے یہ آواز سن لی ہوگی؟ لیکن چار سو گہرا سناٹا تھا۔ میرے نیچے باغ تھا جس میں اونچی اونچی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ مجھے جتنی چوٹ لگنی تھی لگ چکی تھی۔ اب مزید اس کا احتمال نہیں تھا۔ میں نے چھلانگ لگا دی اور گھاس پر جا گری۔ ایک لمحے کو یوں لگا جیسے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے ہوں درد کی ایک شدید ٹیس اٹھی اور سارے جسم میں پھیلتی چلی گئی۔ ذہن چکرانے لگا آنکھوں کے سامنے سیاہ دھبے رقص کرنے لگے میری سانس سینے میں ہی رک گئی تھی لیکن چند ہی

لمحوں میں یہ کیفیت معمول پر آ گئی "مجھے اٹھنا ہے میں نے تیزی سے سوچا اور ٹونی کو خبردار کرنا ہے۔"

بارش کے قطرے جسم میں برچھیاں چبھو رہے تھے۔ میرا لباس بھیگ کر جسم سے چپک گیا تھا۔ میرے دونوں طرف لکڑی کے جنگلے سے گھرے ہوئے طویل باغ تھے۔ میں تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور پیچھے رُکنے کی جرأت کیے بغیر وہاں سے بھاگتی ہوئی ایک تنگ سی گلی میں پہنچ گئی۔ جو گیراج کی ایک قطار تک رہنمائی کرتی تھی۔ وہاں سے نکلنے کا ضرور کوئی راستہ ہوگا۔ میرے پیچھے کسی بھی لمحے چیخ و پکار مچ سکتی تھی اور کئی ہاتھ مجھے پکڑنے کے لئے لپک سکتے تھے۔ میں کیچڑ اور پانی سے بھری گلی میں گرتی پڑتی بھاگنے لگی اور گیراج کے احاطے سے گزرتی ہوئی سڑک پر نکل آئی۔ وہاں کوئی نہ کوئی ضرور میری مدد کرتا لیکن سڑک تیز بارش اور طوفان کی وجہ سے بالکل سنسان ہو رہی تھی اور بارش کا پانی پرشور آواز میں گٹر میں بہہ رہا تھا۔ مجھے کہیں چھپنا تھا۔ ان لوگوں کو جلد ہی میرے فرار کا علم ہو جاتا۔ کسی بھی لمحے میرے کانوں میں ان کے قدموں کی دھمک گونجنے لگتی۔ "مجھے ٹونی کو خبردار کر دینا چاہئے!!..... میں نے ہانپتے ہوئے دہشت سے سوچا اور ایک بار پھر بھاگنے لگی ..... گلی در گلی ..... سڑک در سڑک ..... مکان در مکان..... میں بے تحاشا بھاگتی رہی میرا دل خوف سے لرز رہا تھا اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اچانک عقب میں کسی کار کے انجن کی آواز سنائی دی "کیا یہ وہی لوگ ہیں" ..... میں جلدی سے ایک جھاڑی کے پیچھے چھپ گئی اور بھیگی بھیگی جھاڑیاں میری زلفوں سے لپٹ گئیں وہ کار فٹ پاتھ پر چھینٹے اُڑاتی ہوئی گزر گئی۔ میں اُٹھ کھڑی ہوئی اور کچھ دور چلنے کے بعد ایک کونے سے مڑ گئی۔ شکر خدا کا وہاں دکانیں تھیں، لوگ تھے، ٹریفک تھی، چہل پہل تھی، کوئی نہ کوئی یقیناً میری مدد کرتا۔

میں پہلی دکان کا دروازہ اندر کی طرف دھکیل کر فرش پر گر گئی۔ اگلے ہی لمحے میری سماعت سے بھانت بھانت کی آوازیں ٹکرانے لگیں..... مجھے ٹونی کو خبردار کرنا چاہئے۔ میں نے ڈوبتے ذہن سے سوچا اور پھر جیسے کسی اندھے غار میں اُترتی چلی گئی..... آنکھیں کھلیں تو نیلی یونیفارم میں ایک شخص کو اپنی جانب گھورتے پایا..... "تم خیریت سے ہو عزیزہ۔" وہ شفقت سے بولا۔ "ہم تمہارے منہ سے یہ ٹیپ ہٹا دیں گے۔"

میرے منہ سے ٹیپ نوچا جانے لگا اور میں ایک جھرجھری لے کر رہ گئی اور پھر میرے شانوں کو کسی دبیز تولئے اور پیروں کو کمبل سے لپیٹ دیا گیا۔ میز پر کھولتی ہوئی چائے کی ایک پیالی رکھی تھی۔

"اب پیاری" اس پولیس آفیسر نے نرمی سے پوچھا "یہ سب کیا ہے؟"

میں بھلا کیسے وضاحت کرتی کہ کیا ہوا تھا اور کیا ہونے والا تھا۔ مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ "مجھے ٹونی کو خبردار کرنا ہے۔" میں نے بمشکل تمام سرگوشی کی۔

"ٹونی؟ ٹونی کون ہے؟" اس افسر نے پوچھا۔

"کاش میں جانتی.....!" میرے گلے سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

"لو..... یہ چائے پیو" وہ کمال مہربانی سے بولا۔ "ہم تمہیں پولیس سٹیشن لے جائیں گے۔"

میں پولیس کار میں شہر کے وسط سے گزر رہی تھی۔ شام کے چھ بج رہے تھے لوگ دفتروں سے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ میں خالی خالی نظروں سے لوگوں کے ہجوم کو، ٹریفک کو بڑی بڑی دکانوں، سپر مارکیٹوں، بینکوں اور عظیم الشان رہائشی عمارتوں کو تیزی سے پسپا ہوتا دیکھ رہی تھی..... "وہ رہی" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا "جہاں میں کام کرتی ہوں۔"

لیکن مجھے یہ کیونکر معلوم ہوا؟ پرانے طرز کی وہ تاریک سی عمارت مجھے بے حد مانوس لگی تھی۔ وہ جواہرات کی دکان تھی۔ پولیس کار سڑک کے کنارے رُک گئی۔ "تمہیں یقین

ہے" پولیس آفیسر نے پوچھا۔ "ٹونی... [illegible] تقریباً بچے ہوئے ہیں۔

میرا ذہن آہستہ آہستہ صاف ہو رہا تھا [illegible] یادداشت لوٹ رہی تھی۔ [illegible] ہم وہاں کام کر [illegible] میں اور ٹونی... "

[illegible] صاف [illegible] سب کچھ یاد [illegible] لگا۔ ہمارا فلیٹ... اطلاعی گھنٹی کا بجنا [illegible] میرا دروازہ کھولنا۔ اچانک [illegible] کسی چیز کی شدید ضرب اور پھر چکراتے ہوئے ذہن کا [illegible] کسی تاریک کنویں میں اترتے [illegible] ہوش میں آنے کے بعد میں نے انسانی [illegible] بالکل سیاٹ [illegible] تھا۔ [illegible] یادداشت [illegible] چھین لی گئی [illegible]

[illegible] "وہ لوگ [illegible] [illegible] یہ دکان [illegible] مجھے [illegible] [illegible] دل [illegible] سے [illegible]"

[illegible] سے [illegible] بولی سے جو۔

"[illegible] آرام سے [illegible] سے کام [illegible]"

"لیکن ٹونی؟" میں نے بے تابی سے آفیسر کی جانب دیکھا۔

"وہ اب تک گھر جا چکا ہوگا" آفیسر نے کہا "اس وقت تقریباً سات بج رہے ہیں کافی وقت ہے ہم ذرا چیک کرنے دکان کے پیچھے جاتے ہیں تم یہیں ٹھہرو!!"

ان کے جاتے ہی میں کار سے نکل کر جواہرات کی دکان کی طرف بھاگنے لگی۔ ممکن ہے ٹونی اب بھی دکان میں ہو میں اس سے شدید پیار کرتی تھی اگر اسے کچھ ہو گیا تو...؟ او خدایا! میں یہ کسی طور پر برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ دکان کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ راہداری بالکل تاریک تھی ان دونوں پولیس افسروں کا کچھ پتہ نہ تھا۔ کوریڈور بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ہر طرف گہرا سناٹا طاری تھا۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھنے لگی۔ میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ اچانک کسی نے پیچھے سے میرے منہ پر

[illegible] مجھے پیچھے گھسیٹ لیا۔ فرش پر دو [illegible] [illegible] ہوا [illegible]

[illegible]

[illegible] پیچھے [illegible] ایک [illegible] [illegible] اور پچ بلہ [illegible] [illegible] [illegible] بریف کیس [illegible] [illegible] تھا۔

"ٹونی" [illegible] [illegible] ذرا [illegible] کی طرف [illegible] اور مجھ پر نگاہ [illegible] اس کی آنکھیں [illegible] "کیتھی! تم [illegible] ہوا [illegible] بھاگیں"

[illegible] اچانک [illegible] بریف کیس اٹھا کر ہماری جانب [illegible] بھاگنے لگا اس کے پیر [illegible] میں الجھ [illegible] بریف کیس کھل گیا اور سارے [illegible] جواہرات فرش پر دور دور بکھر گئے۔ وہ خود [illegible] پولیس افسروں کی گرفت میں جھول رہا تھا۔ میں [illegible] میں گم پھٹی پھٹی آنکھوں سے سے گھورتی چلی گئی مجھے یقین نہیں آ رہا تھا میں یہ کیا دیکھ رہی تھی؟ ڈکیتی کا منصوبہ اس نے بنایا تھا؟ اس پر کون شک کر سکتا تھا؟... میرے اغوا ہونے اور مجھے حبس بے جا میں رکھے جانے پر ہر شخص اغوا کنندگان پر شک کرتا۔ ٹونی کی طرف کس کا خیال جاتا؟ کون سوچتا کہ اس منصوبے کے پیچھے اس کا دماغ تھا۔ میں چھ ماہ سے اسے چاہتی اور اس پر بھروسہ کرتی آ رہی تھی۔

پولیس آفیسر اسے جھکڑیاں پہنا رہے تھے پھر وہ اسے لے جانے لگے۔ وہ میرے قریب سے گزرتے ہوئے ایک لمحے کے لئے رُک گیا "احمق... کیتی" اس نے ہولے سے کہا۔ "یہ سب تمہارے ہی لئے تو تھا... مجھے تم سے کتنا پیار تھا...!!"



میک اپ کا مسلسل استعمال خواتین کو بانجھ بنا رہا ہے



بنا سنورنا ہر عورت اپنا حق سمجھتی ہے اور عصر حاضر میں ہر طبقے کی خواتین خوبصورت نظر آنے کے لیے میک اپ کے بے شمار سامان سے ضرور استفادہ کرتی ہیں لیکن یہ کاسمیٹکس درحقیقت خواتین کو فائدے سے زیادہ نقصان پہنچا رہی ہیں۔ واشنگٹن یونیورسٹی کے ماہرین نے 31 ہزار 575 خواتین پر مختلف کیمیائی مواد سے بنی لپ سٹک اور فیس کریم سمیت میک اپ کے دیگر سامان سے تجربات کیے اور چار سال تک ان کے اثرات کا جائزہ لیا۔ تحقیق کے دوران پتہ چلا کہ اس سامان کی تیاری میں استعمال ہونے والے 15 لازمی کیمیائی اجزا خواتین کی صحت کے لئے انتہائی مضر ہیں۔ تحقیقی ٹیم کی سربراہ پروفیسر امبر کوپر کا کہنا تھا کہ میک اپ کے مسلسل استعمال سے خواتین دل کی بیماریوں، ہڈیوں کی کمزوری اور بانجھ پن کا شکار ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ نوجوان خواتین میں کینسر کے بڑھتے ہوئے واقعات بھی اسی کا نتیجہ ہیں۔

خواتین کے لیے سورج کی روشنی زیادہ ضروری ہے

ایک نئی طبی تحقیق میں کہا گیا ہے کہ خواتین کو سورج کی روشنی کی مردوں سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ سورج کی روشنی میں موجود وٹامن ڈی کی کمی انسانی جسم میں اوسٹروپروسس اور فریکچرز کا سبب بن سکتی ہے۔ خواتین میں یہ خطرہ مردوں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے چنانچہ خواتین کو دھوپ میں زیادہ وقت گزارنا چاہیے۔

امریکا: حجاب پہننے والی مسلم خاتون کو ملازمت دینے سے انکار

امریکی پولیس نے حجاب پہننے کی وجہ سے خاتون کو بھرتی کرنے سے منع کر دیا جبکہ کینیڈا کی ایڈمونٹن پولیس سروس نے امریکا میں مقیم اس مسلمان خاتون کو کینیڈا میں ملازمت کی دعوت دی ہے۔ ایک مقامی کینیڈین اخبار کے مطابق ایڈمونٹن پولیس میں بھرتی کے ذمہ دار اسٹاف سارجنٹ مارک فارنیل کو انٹرنیٹ پر صومالی نژاد امریکی خاتون اسمہان عیسیٰ کی داستان پڑھنے کو ملی تو انہوں نے ان سے رابطہ کیا۔ فارنیل کے مطابق ایڈمونٹن پولیس



نے مسلمان خواتین کے لئے ایک ایسا یونیفارم تیار کیا ہے جس میں حجاب شامل ہے اور انہوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ 29 سالہ اسمہان کو پولیس سروس میں شامل ہونے کا موقع دیں گے۔ فارنیل کا کہنا ہے کہ وہ بہت شدت سے پولیس میں شامل ہونا چاہتی ہیں تو کیوں نہ انہیں موقع دیا جائے کہ وہ کینیڈا آئیں اور اس موقع کا فائدہ اٹھائیں۔ فارنیل کے مطابق اگر اسمہان نے رضامندی دکھائی تو انہیں پہلے کینیڈا کی شہریت حاصل کرنی ہوگی اور اس ملازمت کی وجہ سے ایسا بہت آسان ہو جائیگا۔

اونچی ھیل کمر کی خوفناک تکلیف کا باعث بنتی ھے، تحقیق

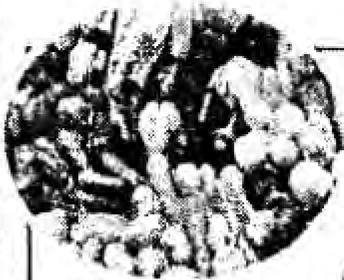
اکثر خواتین سمجھتی ہیں کہ اونچی ہیل والی سینڈل عورت کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہے اسی لیے تقریبات سے لے کر کیٹ واک تک خواتین اونچی ہیل والی سینڈل یا سینڈل پہننا پسند کرتی ہیں لیکن انہیں شاید یہ خبر نہیں کہ



اونچی ہیل پاؤں اور کمر سمیت ایڑھی میں خطرناک تکلیف کی وجہ بنتی ہے۔ کمر کی تکلیف اور اسپائنل کارڈ کو نقصان: اونچی ہیل کا مسلسل استعمال کمر کی اسپائنل کارڈ کو شدید نقصان پہنچاتا ہے اسی لیے ورکنگ ویمن میں کمر کی تکلیف عام ہوتی جارہی ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ کمر کی تکلیف اکثر مستقل اونچی ہیل استعمال کرنے والی خواتین میں سامنے آتی ہے کیونکہ اونچی ہیل کا استعمال جسم کو غیر متوازن کردیتا ہے اور یہی تمام قسم کی کمر کی تکلیف کا نقطہ آغاز ہے۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ مستقل طور پر اونچی ہیل والی سینڈل سے جسم کی ترتیب خراب ہوجاتی ہے جس سے ریڑھ کی ہڈی غیر معمولی طور پر مڑ جاتی ہے جو سپائن کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اونچی ہیل والی سینڈل پہننے والی خواتین کی ہڈیاں سخت اور اکڑن کی کیفیت سے دو چار ہوجاتی ہیں جو "لوئر لمبوسیکرال اسپائن" اور "پیلوس" سے آنے والے "ہیمسٹرنگ اور ہپ کے پٹھوں کی خرابی کا باعث بن جاتا ہے جسے ہائپرلوڈوسس اور ہائپرلورڈوسس کہا جاتا ہے۔ بیک بون میں یہ خرابی انٹروریبرال ڈسک پر دباؤ کو بڑھا دیتی ہے جس سے کمر اور پیلوس کے جوڑ بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ اگر یہ بیماری زیادہ دیر تک رہے تو خواتین تو جوانی میں ہی ہڈیوں کی لچک سے محروم ہوکر معذوری کا شکار ہوسکتی ہیں۔

سیارہ کچن کارنر

جویریہ کامران



خواتین قارئین کی دلچسپی اور پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے کھانوں کی تراکیب پر مبنی خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس میں آسان مگر معیاری اور نئی تراکیب پیش کی جائیں گی۔ ان تراکیب پر عمل کرکے نہ صرف آپ اپنے گھر والوں کو نت نئے ذائقہ دار کھانے فراہم کرسکتی ہیں بلکہ روایتی ڈشز پکانے کی بوریت سے بھی نجات حاصل کرسکتی ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو بہترین تراکیب فراہم کرسکیں۔ اس سلسلے میں آپ ہمیں اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے۔ نیز آپ ہمیں خود بھی نئی اور معیاری تراکیب لکھ کر بھیج سکتی ہیں جنھیں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور بہترین ترکیب پر اعزازی شمارہ بھی آپ کو ارسال کیا جائے گا!



email:sayyaradigest@gmail.com

www.facebook.com/sayyaradigest

اچاری چکن



اجزاء:۔ چکن بون لیس ایک کلو' پیاز چار عدد' لہسن ایک گٹھی' ادرک ایک انچ کا ٹکڑا' ہری مرچ پانچ عدد' لیموں دو عدد' ٹماٹر ایک پاؤ' ہرا دھنیا باریک کٹا ہوا تقریباً آدھی گٹھی' دہی ایک پاؤ' کوکنگ آئل ڈیڑھ پیالی' خشک دھنیہ ایک کھانے کا چمچ' میتھی دانہ ایک چائے کا چمچ' کلونجی ایک چائے کا چمچ' سونف ایک چائے کا چمچ' سرخ مرچ ثابت پانچ عدد کٹی ہوئی کالی مرچ ایک چائے کا چمچ' پسا ہوا گرم مصالحہ ایک چائے کا چمچ' نمک حسب ذائقہ' ہلدی ایک چٹکی

ترکیب:

دیگچی میں پیاز' لہسن' ادرک اور ٹماٹر کاٹ کر ڈالیں اور اُبالنے کے بعد گرائنڈ کرلیں۔ اسی دیگچی میں کوکنگ آئل گرم کرکے پیاز' ٹماٹر' ادرک' لہسن کا اُبلا ہوا پیسٹ شامل کریں اور کچھ دیر تک بھونیں ساتھ ہی گوشت بھی شامل کردیں۔ چمچ ہلاتی رہیں اور گوشت میں دہی ڈال کرگدری کٹی سیاہ مرچ اور سرخ مرچ ڈال کر پیسنے کے بعد چھان لیں۔ اب لہسن کے پانی کو تھوڑا تھوڑا کرکے

گوشت میں ڈال کر کے بھنائی کرتی جائیں۔ مصالحہ سے گھی الگ ہوجائے تو ڈھکن دے کر دم لگا دیں۔ گوشت گل جائے تو باریک کٹی ہوئی ادرک اور ہرا مصالحہ شامل کر کے چولہا بند کر دیں۔ مزیدار چکن اچاری تیار ہے۔



چکن چائنیز رائس

اجزاء:۔

چاول باسمتی ایک کلو' بیس منٹ کے لئے بھگو دیں مرغی کا گوشت' چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ایک پیالی ہری پیاز کے پتے' ایک پیالی باریک کٹے ہوئے گاجر' دو عدد باریک کٹی ہوئی پہاڑی مرچ' ایک عدد باریک کٹی ہوئی مٹر چھلے ہوئے آدھی پیالی اگر ڈالنا چاہیں لہسن کا عرق دو کھانے کے چمچے' سویا ساس دو کھانے کے چمچے' سرکہ ایک کھانے کا چمچہ' اجینوموتو آدھا چائے کا چمچ' نمک حسب ذائقہ' دار چینی ایک ٹکڑا توے کے اوپر بھون کر باریک پیس لیں۔

ترکیب:

سب سے پہلے ایک دیگچی میں تیل ڈال کر مرغی کے ٹکڑے' لہسن کا عرق' سویا ساس' نمک اور کالی مرچ ڈال دیں' اچھی طرح فرائی کرلیں' پھر کٹی ہوئی گاجر اور پتے وغیرہ ڈال کر اچھی طرح بھونیں پھر اس میں چاول ڈال دیں دس منٹ تک چاول بھونتے ہیں یہاں تک کہ چاول [illegible] تک پک [illegible] ہونے لگیں پھر پیاز [illegible] ڈال [illegible] ڈھکن ڈھانپ دیں [illegible] پانی خشک ہو جائے تو ہلکی آنچ پر دم پر رکھ دیں اور [illegible] ہری [illegible] اجینوموتو اور سویا



ساس ڈال دیں۔

فرائیڈ چکن ونگز

اجزاء: چکن ونگز آدھا کلو' کوکنگ آئل حسب ضرورت' لیموں کا رس تقریباً دو چمچ' مرچیں ڈیڑھ کھانے کا چمچ' نمک حسب ذائقہ' گرم مصالحہ آدھا چائے کا چمچ' لہسن اور ادرک کا پانی دو چائے کے چمچ' اجوائن پسی ہوئی ایک چائے کا چمچ' بریڈ کرمبز ایک کپ' انڈے دو عدد

طریقہ

ونگز کو اچھی طرح دھوئیں تاکہ ان پر پر نہ رہ جائیں بعدازاں تیل' بریڈ کرمبز اور انڈے کے علاوہ تمام مصالحہ جات لگا کر تقریباً ڈیڑھ سے ڈھائی گھنٹے تک فریج میں رکھ دیں۔ اچھی طرح میرینیٹ ہو جائیں تو چولہے پر چڑھا کر کچھ دیر تک پکالیں۔ اس کے بعد اتار کر ٹھنڈا کرلیں اور ایک ایک کر کے انڈے میں ڈبونے کے بعد بریڈ کرمبز لگا کر رکھتی جائیں آخر میں سب ونگز کے اوپر تیل چھڑک دیں اور کڑاہی میں ڈال کر فرائی کریں مزیدار چکن ونگز تیار ہیں۔



بزمِ شاعری

غزل

پیار میں یہ بھی ہوتا ہے
تنہا تنہا روتا ہے
مل جائے تو مٹی ہے
کھو جائے تو سونا ہے
دل تو ہم سے کھیل گیا
ہم سمجھے تھے کھلونا ہے
تجھ کو پاکر دل نے کہا
کھو جائے جو کھونا
کیا خوف محبت میں
ہوجائے جو ہونا ہے
دنیا کا دُکھ دیکھا ہے
دل میں اسے سموتا ہے
آنسو تو ہیں لاکھ امتیاز
موت ایک پروتا ہے
(ایس امتیاز احمد۔کراچی)

غزل

تُو میرا اپنا نہیں تھا تو پرایا بھی نہ تھا!!!
تیری آنکھوں میں شناسائی کا سایہ بھی نہ تھا
تُو بدل جائے گا اتنا تو یقین تھا لیکن
اس قدر جلد بدل جائے گا سوچا بھی نہ تھا
کیسے گم [illegible] میں مجھے ایسا لگا
تُو مرے پاس تھا اور پاس تو آیا بھی نہ تھا
جانے کس راہ گیا' ہجر کی شام میں دے کر
مجھ پر الزام کوئی اس نے لگایا بھی نہ تھا
چھن گیں پہلے ہی اس دل کی جہاں سے خوشیاں
میں نے آنکھوں کو ابھی رونا سکھایا بھی نہ تھا
جس کے میں کاندھے پہ سر رکھ کے بہاتا آنسو
کوئی ایسا تو مرا چاہنے والا بھی نہ تھا
مان لوں کیسے کہ وہ مخلص تھا مخلص نیّر
میں جو بکھرا تو مجھے اس نے سنبھالا بھی نہ تھا
(نیّر رضاوی۔کراچی)

غزل

کیونکر تُو پوچھے میرا حال اِدھر اُدھر سے
دیکھ لیتا ہے جو مجھے تُو دل کے نگر سے
اے قاصد! نہیں رہی تیری ضرورت اب مجھے
بادِ صبا کرتی ہے واقف مجھے ان کی خبر سے
سینے میں آگ لگا دی تیری اک ادا نے
اُٹھایا جو تُو نے پلکوں کو فخر سے
زلفوں کو سنوارا ہے تبھی ابر میں سیاہی ہے
یوں لگ رہا ہے آج مجھے انداز ابر سے
آتشِ عشق میں جل جائیں جو لوگ
کچھ ڈر نہیں رہتا انہیں تپشِ مہر سے
سرِشام چاند بھی خوش ہوگیا تجھے دیکھ کر
یوں لازم ہوا کہ دیکھوں تجھے الفت کی نظر سے

ستمگری عشق کا معلوم ہوا عدیل
پالا پڑا ہے جب کا تیرے آستانہ در سے
(عدیل الرحمٰن عدیل۔ خانیوال)

غزل

سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے بہاروں کا
کسی نے مقام پرکھا ہے تاروں کا
حوصلہ دیتے نہیں آجکل کے یار بھی
وہ پہلے سا جلوہ نہ تھا نظاروں کا
یادوں کے جلو میں ہمیشہ سے تھا تنہا
بیگانوں سے پوچھ لیتا ہوں رستہ رہگزاروں کا
ہاتھ ملا کے بھی لوگ چھوڑ جاتے ہیں یہاں
زندگی رستہ ہے پھر سے خارزاروں کا
بے رُخی سے تیری یہ زخم ملے ہیں ہم کو
وہ پہلے سا جذبہ نہیں رہا اب سہاروں کا
قسمت میں اپنی کچھ آنسو اور آہیں ہیں جاوید
موسم بدل گیا آج پھر سے شراروں کا
(محمد اسلم جاوید۔ فیصل آباد)

غزل

زندگی اپنی ہم لٹا بیٹھے
چار تنکوں کا گھر جلا بیٹھے
ان کو پانے کی آرزو میں ہم
اپنا سب داؤ پر لگا بیٹھے
چاندنی کتنی پڑ گئی پھیکی
وہ ذرا سا کیا مسکرا بیٹھے
دل میں لائیں یہ حوصلہ کیسے؟
ان کے بس میں تھا وہ بھلا بیٹھے
[illegible] دیکھ کر رانا
اپنی ہے تو یوں بڑھا بیٹھے
(قدیر رانا۔ راولپنڈی)

غزل

بنا ماں کے ویرانہ گھر لگے وہ اچھا نہیں لگتا
پرندوں سے جو خالی ہو وہ شجر اچھا نہیں لگتا
جس چوکھٹ نے ماں کے چرنوں کو نہ چھوا ہو اچھا نہیں لگتا
چاہے سنگ مرمر کا ہو وہ در اچھا نہیں لگتا
چھوڑ کر اپنی ماں کے قدموں کی حسین جنت
بنانا ہم کو جنت میں گھر اچھا نہیں لگتا
(نذیر چہل)

غزل

نیل گگن پر پنچھی گائے
دیکھ کے حسن یہ مسکائے
اس بادل سے کہہ دو اب
پیار سے من کی پیاس بجھائے
زیست کا حاصل بس وہی لمحے
جس لمحے میں تم تھے آئے
سچ مانو وہ خط ہے تمہارا
دور کو جو نزدیک لے آئے
چھوٹی سی خواہش ہے اپنی
شہر بھی میری وفا پہ آئے
(یاسمین کنول۔ پسرور)

غزل

اس محو تغافل کی جفا میرے لئے ہے
صد شکر کہ اتنا تو روا میرے لئے ہے
دشمن کے مٹانے سے مٹا ہوں نہ مٹوں گا
اور یوں تو میں فانی ہوں فنا میرے لئے ہے
اس میں بھی مجھے شک ہے کہ غائب ہے بناوٹ
وہ شوخ جو غیر دل سے خفا میرے لئے ہے
وہ حسن کے مالک ہیں جفا بھی انہیں جائز
میں بندہ خوباں ہوں وفا میرے لئے ہے

پاکر مجھے بے کس تری رحمت یہ پکاری
یہ بندہ بے برگ و نوا میرے لئے ہے
زاہد کو جو حق ہو بھی تو ہے تجھ پہ جزا کا
البتہ میں خاطی ہوں عطا میرے لئے ہے
دعوت میں تری میں بھی ہوں معلوم ہے لیکن
کیا غیر کی خاطر سے ہے کیا میرے لئے ہے
ارباب ہوس تجھ سے ہیں ناراں تو میں خوش ہوں
جو ان کی سزا ہے وہ جزا میرے لئے ہے
کہتے ہیں وہ اب قدر ہوئی ہم کو وفا کی
گویا کہ یہ سب مدح و ثنا میرے لئے ہے
اس گیسوئے برہم کی اڑا لائی ہے نکہت
آوارگی باد صبا میرے لئے ہے
اوروں پہ نوازش میں جو بے باک ہے حسرت
قسمت سے وہ مجبور حیا میرے لئے ہے
(کلام حسرت موہانی۔ انتخاب: سمیرا رانا)

غزل

شام کے لب پر گیت بہا اک تارے کا
اُگا ہوا کی ڈال پہ پھول پرندے کا
آدھی رات کو اتری نیند بشارت کی
ہونٹوں پر تھا درد ہوا کے جھونکے کا
کسی کی آہٹ ساتھ سفر میں رہتی ہے
جسم کی اوٹ بلاوا ہے کس سائے کا
آنکھوں میں ہے نیلی رات سمندر کی
اس کے اندر چاند ہے تیرے سینے کا
مجبوری کی چادر اوڑھ کے پھرتا ہے
جگہ جگہ پیوند ہے درد دلاسے کا
نیند بھری کچھ بوندیں میٹھے خوابوں کی
ساری رات سفر ہے تیز بگولے کا
دھیان کے صحراؤں میں رہتا ہے
وجہ مری خواہش کے میٹھے چشمے کا
(سرمد صہبائی)

غزل

محبت کا گماں ہوتا بہت ہے
کہ اب یہ لفظ بھی رسوا بہت ہے
میں انساں کو خدا کیسے سمجھ لوں
خدا کو بھی خدا کہنا بہت ہے
تیرے غم کی فسوں کاری سے پہلے
میں سمجھا تھا غم دنیا بہت ہے
یہ آنکھیں اور کیا دیکھیں کسی کو
ان آنکھوں نے تجھے دیکھا بہت ہے
نجانے کیوں بچا رکھے ہیں آنسو
ابھی شاید مجھے رونا بہت ہے
بہت آباد ہے یہ شہر پھر بھی
سحر اس شہر میں تنہا بہت ہے
(سحر انصاری)

غزل

خیال ترک محبت کو آزمانے لگے
اسے بھلاؤں تو کچھ اور یاد آنے لگے
اسے سنبھال کے رکھو خزاں میں لو دے گی
یہ خاک لالہ و گل ہے کہیں ٹھکانے لگے
تجھے میں اپنی محبت سے ہٹ کے دیکھ سکوں
یہاں تک آنے میں مجھ کو کئی زمانے لگے
یہ اس کا جسم ہے یا طلسم خواب کوئی
ادھر نگاہ اٹھاؤں تو نیند آنے لگے
وہ حرف تازہ جو گل سا کھلے کہاں سے ملے
کہ زخم بھر گئے اور درد سب پرانے لگے
میں بھول جاؤں تو وہ راستہ دکھانے کو
نئے چراغ سر رہگزر جلانے لگے
وفا بھی حل ہو تو ایسا نہ ہو سلیم کہ پھر

دل خراب نئے مسئلے اٹھانے لگے

(سلیم احمد)

غزل

مجھے خبر تھی مرا انتظار گھر میں رہا
یہ حادثہ تھا کہ میں عمر بھر سفر میں رہا
میں رقص کرتا رہا ساری عمر وحشت میں
ہزار حلقہ زنجیر بام و در میں رہا
ترے فراق کی قسمت ہمارے پاس نہ تھی
ترے وصال کا سودا ہمارے سر میں رہا
یہ آگ ساتھ نہ ہوتی تو راکھ ہو جاتے
عجیب رنگ ترے نام سے ہنر میں رہا
اب ایک وادیِ نسیاں میں چھپتا جاتا ہے
وہ ایک سایہ کہ یادوں کی رہگزر میں رہا

(ساقی فاروقی۔ انتخاب: جمشید خالد)

غزل

آج مقابلہ ہے تخت میر سپاہ کیلئے
ہوگئے سر کئی قلم ایک کلاہ کیلئے
تازہ رُخی کائنات ڈھونڈ رہی ہے آئینہ
جستجوئے ہزار میں ایک گواہ کیلئے
کھل ہی گیا طلسم دوست عین وصال میں کہ تھی
اک شب ہجر زندگی لذت آہ کیلئے
صورت گرد کا رواں ہے غم منزل جہاں
خواب جنون تازہ کار چاہئے راہ کیلئے
اک شب خودنمائی میں عصمت بے مقام نے
کتنے سوال کر لئے رمز گناہ کیلئے
تیرے وصال نے طلب میری خود آگہی بھی کی
ہجر ہزار شب کے بعد ایک نگاہ کیلئے

(حامد صمدانی۔ انتخاب: عمیر ناصر)

غزل

تصویر تیری مرا دل بہلا نہ سکے گی
یہ تیری طرح سے شرما نہ سکے گی
میں بات کروں گا تو یہ خاموش رہے گی
سینے سے لگا لوں گا تو یہ کچھ نہ کہے گی
آرام وہ کیا دے گی جو تڑپا نہ سکے گی
یہ آنکھیں ہیں ٹھہری ہوئی چنچل وہ نگاہیں
یہ ہاتھ میں سہمے ہوئے اور مست وہ بانہیں
پرچھائیں تو انسان کے کام آ نہ سکے گی
الجھی ہوئی راتوں کو یہ سلجھا نہ سکے گی
تصویر تیری دل میرا بہلا نہ سکے گی
یہ تیری طرح مجھ سے شرما نہ سکے گی
میں بات کروں گا تو یہ خاموش رہے گی
ان ہونٹوں کو فیاض میں کچھ کہہ نہ سکوں گا
ان زلفوں کو میں ہاتھ میں بھی لے نہ سکوں گا

(فیاض ہاشمی۔ انتخاب: نعیم مرتضیٰ)

غزل

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے
ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے
اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے
دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے
بھولے سے مسکرا تو دیئے تھے وہ آج فیض
مت پوچھ ولولے دل ناکردہ کار کے

(فیض احمد فیض۔ انتخاب: صائمہ آفتاب)

غزل

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی

کیا آپ چاہتے ہیں کہ

آپ، آپ کی اولاد، آپ کے بہن بھائی، عزیز و اقارب

- جھوٹ بولنے سے باز آ جائیں۔
- تجارت اور ملازمت میں بدعنوانی اور بددیانتی سے باز آ جائیں۔
- اپنے گھر والوں سے حسن سلوک سے پیش آئیں۔
- زندگی کا ہر لمحہ نیکی اور پارسائی میں گزرے۔
- تعلیم و تعلم کے شاندار درس ذہن نشین ہو جائیں۔
- والدین سے وہ سلوک کریں جو خدا پسند کرتا ہے۔

تو

سیارہ ڈائجسٹ کی شاندار روایات
کے پیش منظر میں پیش کیا جانے والا
دلکش، دلکشا اور نادر

شائع ہو گیا

اخلاق رسول ﷺ نمبر

مطالعہ کیجیے

احادیث رسول ﷺ کی روشنی میں

در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا
جلوہ از بس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا
عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا
عشرت پارہ دل زخم تمنا کھانا
لذت ریش جگر غرق نمکداں ہونا
(مرزا غالب۔ انتخاب۔ سیم ناز)

غزل

بھڑکا ہیں میری پیاس کو اکثر تیری آنکھیں
صحرا مرا چہرہ ہے سمندر تیری آنکھیں
پھر کون بھلا داد تبسم انہیں دے گا
روئیں گی بہت مجھ سے بچھڑ کر تیری آنکھیں
بوجھل نظر آتی ہیں بظاہر مجھے لیکن
کھلتی ہیں بہت دل میں اتر کر تیری آنکھیں
ممکن ہو تو اک تازہ غزل اور بھی کہہ لوں
پھر اوڑھ نہ لیں خواب کی چادر تیری آنکھیں
یوں دیکھتے رہنا اسے اچھا نہیں محسن
وہ کانچ کا پیکر ہے تو پتھر تیری آنکھیں
(محسن نقوی۔ انتخاب: غزالہ افضل)

غزل

اس شہر خرابی میں غم عشق کے مارے
زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے
یہ ہنستا ہوا چاند یہ پرنور ستارے
تابندہ و پائندہ ہیں ذروں کے سہارے
حسرت ہے کوئی غنچہ ہمیں پیار سے دیکھے
ارماں ہے کوئی پھول ہمیں دل سے پکارے
ہر صبح مری صبح پہ روتی رہی شبنم
ہر رات مری رات پہ ہنستے رہے تارے
کچھ اور بھی ہیں کام ہمیں اے غم جاناں
کب تک کوئی الجھی ہوئی زلفوں کو سنوارے
(حبیب جالب۔ انتخاب۔ عمران خان)

خاص اعلان

محترم قارئین! بزم شاعری میں آپ کی دلچسپی کے پیش نظر ادارہ نے ایک خصوصی سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت ہر ماہ ایک خوش نصیب شاعر/شاعرہ کا تعارف بمعہ تصویر شائع کیا جائیگا۔ جو احباب اس سلسلہ میں شریک ہونا چاہتے ہیں وہ اپنی تازہ غزل/نظم، پسندیدہ شاعر کی غزل/نظم اور دیگر تفصیلات کے ساتھ درج ذیل کوپن پُر کرکے سیارہ ڈائجسٹ 244 مین مارکیٹ ریواز گارڈن لاہور پر ارسال کریں۔

کوپن برائے اس ماہ کا شاعر

یہاں اپنی تصویر منسلک کریں

نام: .... تعلیمی قابلیت: ....
عمر: .... پسندیدہ شاعر: ....
پسندیدہ غزل/نظم: ....
مشغلہ: .... تاریخ پیدائش/برتھ: ....
شادی شدہ/غیر شادی شدہ: .... پتہ: ....
ای میل: ....

نوٹ: اپنی پسند ناپسند شاعری کی ابتدا مزاج اور دیگر تفصیلات الگ صفحے پر درج کرکے بھیجیے۔

قربانی

ضرغام محمود

"پھر اس کی شناخت کیسے ہوئی؟" انور سوہنگی نے پھر پوچھا۔ "ان کی گھڑی اور ہاتھ میں پہنی چاندی کی انگوٹھی سے۔" اس کی بیوی نے جواب دیا تو انور سوہنگی کو یاد [illegible]

ایک شخص کا فسانہ جو زندہ ہونے کے باوجود خود کو مُردہ ظاہر کرنے پر مجبور تھا



گاؤں سے آنے والے راستے پر اس کے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے حالانکہ اس کی صرف ایک ٹانگ تھی اور وہ بیساکھیوں کے سہارے آگے بڑھ رہا تھا۔ چہرے سے تو کوئی اجنبی لگتا تھا مگر جس تیے تلے انداز میں اس کے قدم کچی پگڈنڈی پر اٹھ رہے تھے تو اس سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ان راستوں کو برسوں سے جانتا ہے۔ اس کا الٹا پاؤں گھٹنے سے آگے غائب تھا اور وہاں شلوار کا خالی پائنچہ لٹک رہا تھا اس کے سر کے بال بھی بہت بڑھے ہوئے تھے۔ اس کی داڑھی بھی بہت بڑی اور بے ہنگم تھی جس نے اس کا آدھا چہرہ چھپا لیا تھا اس نے سر پر مخصوص سندھی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ چہرے سے سخت تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کا لباس گرد آلود تھا ایسا لگتا تھا جیسے بہت لمبے سفر سے آیا ہو۔ وہ وقفے وقفے سے رک کر

اپنا سانس درست کرتا اور آگے بڑھ جاتا۔ اس نے ایک بار پھر رک کر اپنا سانس درست کیا اور گاؤں کی طرف دیکھا جو بہت کم مسافت پر رہ گیا تھا۔ آہستہ آہستہ اسے گاؤں کی چیزیں یاد آنے لگیں۔ گاؤں کی ٹیڑھی میڑھی گلیاں گاؤں کی چوپال جہاں دن ڈھلتے ہی رونق لگ جاتی اور بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دینے لگتیں۔ اسے اپنا گھر یاد آیا اپنی بیوی اور بچی یاد آگئی۔

"اب تو رانی چھ برس کی ہوگئی ہوگی" اس نے سوچا اور اس کے قدم ایک دم تیز ہوگئے جیسے چراغ بجھنے سے پہلے بھڑکتا ہے۔ اسی وقت اس کی نظر ایک خوبصورت مقبرے پر پڑی جو گاؤں سے پہلے بنا ہوا تھا۔

"یہ کس کی قبر ہے پہلے تو نہیں تھی" اس نے سوچا اور مقبرے میں داخل ہوگیا۔ مقبرہ اندر سے معطر ہو رہا تھا جیسے کوئی ابھی ابھی عرق گلاب چھڑک کر گیا ہو۔ وہ قبر کے سرہانے کی طرف بڑھا جہاں پھولوں کی چادر رکھی تھی اور قبر کے سرہانے منت کے چراغ جل رہے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ لوگ اس قبر پر منت مانگنے آتے ہیں۔

"یہ کس بزرگ کی قبر ہے" اس نے پھر سوچا اور قبر کے سرہانے لگے سنگ مرمر کے کتبے کو پڑھنے لگا۔

"انور سولنگی.... تاریخ شہادت 2013ء"

اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اسے چکر آگیا اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ بیساکھیاں اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئیں۔ بیساکھیاں گرنے کی وجہ سے وہ بھی لڑکھڑا گیا مگر اس نے قبر کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچایا۔ وہ ہمت کرکے آگے بڑھا اور کتبے پر لکھے الفاظ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"مم..... میں تو زندہ ہوں" وہ بڑبڑایا "مگر..... میری قبر کیسے بن گئی"

اسے ایسا لگا جیسے وہ واقعی مر چکا ہو اسے اپنی پچھلی زندگی یاد آنے لگی..... وہ پولیس کے مخبر کی حیثیت سے نوکری کرتا تھا۔ اس نے بڑے بڑے ڈاکوؤں کی مخبری کی مگر کب تک ایک دن وہ پکڑا گیا ڈاکوؤں نے اس پر بے انتہا ظلم کیا۔ پھر ایک دن وہ موقع پا کر ڈاکوؤں کی قید سے بھاگ نکلا مگر ڈاکوؤں کو اس کے فرار کی خبر ہوگئی اور وہ اس کے تعاقب میں دوڑے اپنی دانست میں تو ڈاکوؤں نے اسے مار ہی ڈالا تھا مگر خدا کو اس کی زندگی منظور تھی وہ دریائے سندھ میں بہتا ہوا ایک دور دراز علاقے میں نکل گیا جہاں ایک حکیم نے اس کا بڑی توجہ سے علاج کیا اور پورے دو سال وہ بستر پر پڑا رہا اور بالآخر اللہ تعالیٰ کی مہربانی کے باعث اس کی جان بچ گئی بس اسے اپنی ایک ٹانگ کی قربانی دینا پڑی..... اور پھر جیسے ہی اس کی طبیعت بحال ہوئی وہ اپنے گاؤں کی طرف چلا مگر یہاں..... یہاں تو اس کی قبر بھی بن چکی تھی۔

"کیا وہ واقعی زندہ ہے" اس نے سوچا..... وہ مقبرے سے باہر نکلا اور اپنے گاؤں کی طرف بڑھا اور گاؤں میں داخل ہوگیا۔ ہر راستے سے گزرتے ہوئے اسے اپنے بیتے دن یاد آنے لگے پھر وہ چلتا ہوا اپنے مکان کے سامنے پہنچا۔

"اتنا شاندار مکان....." اس نے سر اٹھا کر مکان کی طرف دیکھا..... "مم..... مگر میرا مکان تو کچا سا تھا۔" وہ سوچ رہا تھا۔

"سائیں بات سننا" اس نے پاس سے گزرتے ہوئے ایک شخص کو پکارا۔

"جی..... کیا بات ہے....." اس شخص نے تفتیشی لہجے میں پوچھا۔

"بھائی اس گاؤں میں انور سولنگی صاحب رہتے ہیں....." اس نے پوچھا۔

"آپ انور سولنگی کے مکان کے سامنے کھڑے

ہیں...... اس شخص نے پختہ اور خوبصورت مکان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ خوبصورت سا مکان...... بھائی دو سال قبل میں یہاں آیا تھا تو انور صاحب کا مکان ٹوٹا پھوٹا اور کچا بنا ہوا تھا دو سال میں یہ تبدیلی......'' اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

''جی ہاں...... بات دراصل یہ ہے کہ انور سونگی صاحب دو سال قبل ڈاکوؤں سے مقابلے میں شہید ہوگئے تھے لہٰذا حکومت نے ان کے لواحقین کو دس لاکھ روپے نقد دیئے اور دس ہزار روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کردیا جب ہی یہ مکان بنا۔ اس شخص نے تفصیلی جواب دیا اور اپنی راہ پر چلتا بنا۔

''اتنا شاندار اور پختہ مکان تو میں ساری زندگی محنت کرکے بھی نہیں بنا سکتا تھا......'' اس نے سوچا...... اسی وقت گلی میں گاؤں کا وڈیرہ خدا بخش اپنے مصاحبوں کے ساتھ آتا نظر آیا...... وہ جلدی سے ایک کونے میں سکڑ گیا۔

وڈیرا خدا بخش اس کے مکان کے سامنے آکر رُک گیا اور اس نے دروازے کی کنڈی بجائی فوراً ہی دروازہ کھل گیا' اسے اپنی بیوی کی صورت نظر آئی جو بڑے عمدہ لباس میں تھی اور اس نے گلے میں سونے کا قیمتی ہار بھی پہنا ہوا تھا۔ اسی وقت اس کے کانوں میں وڈیرہ خدا بخش کی آواز آئی......

''بہن جی آج شام سے فصل کی کٹائی شروع ہو رہی ہے اگر آپ اپنے مقدس ہاتھوں سے اس کام کا افتتاح کردیں تو یہ ہماری خوش نصیبی ہوگی۔''

''کیا...... کیا میری موت سے میری بیوی کو سماج میں اتنا بڑا رتبہ مل گیا......'' اس نے سوچا اس نے دیکھا اس کی بیوی نے اپنے سر کو ہلا کر اپنی رضامندی کا اظہار کیا تو وڈیرہ خدا بخش جو بھی کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا سلام جھاڑتا ہوا اپنی راہ ہولیا۔ جب وڈیرہ خدا بخش گلی سے باہر نکل گیا تو اس نے آگے بڑھ کر اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا جواب میں ایک بار پھر اس کی بیوی نے دروازہ کھولا۔

''کون ہو تم...... کیا چاہئے......'' اس کی بیوی نے اس سے پوچھا۔

اس نے بولنا چاہا مگر الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے وہ کیسے بتاتا کہ وہ اس کا شوہر انور سونگی ہے جو زندگی میں تو اسے سوکھی روٹی بھی نہ دے سکا مگر اس کی موت نے اس پر آسائشوں کے دروازے کھول دیئے۔

''کیا بات ہے کون ہو تم......؟'' اس کی بیوی نے پھر پوچھا۔

''خدا...... خدا تمہارا بھلا کرے...... کئی دنوں کا بھوکا ہوں......'' بڑی مشکلوں سے اس کے منہ سے نکلا۔

''اچھا...... ڈیوڑھی میں بیٹھ جاؤ......'' اس کی بیوی دروازے سے ہٹتے ہوئے بولی تو وہ گھر میں داخل ہوگیا...... اندر سے گھر کی شان ہی نرالی تھی ہر چیز انتہائی عمدہ اور قیمتی تھی جن چیزوں کو وہ خواب میں خریدنے کا تصور نہیں کرسکتا تھا آج اس کے گھر والوں کے زیر استعمال تھیں۔

''لو کھانا کھالو......'' اس کی بیوی اس کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے بولی تو اس نے بڑی مشکلوں سے چند لقمے زہر مار کیے۔

''اس گاؤں میں انور سونگی نامی ایک شخص رہتا تھا'' اس نے اپنی بیوی سے سوال کیا۔ انور سونگی کے نام پر اس کی بیوی کے چہرے پر اذیت کے آثار نمودار ہوئے مگر اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔

'وہ میرے شوہر تھے...... ڈاکوؤں کے خلاف ایک آپریشن میں شہید ہوگئے......''

''اوہ تو وہ شہید ہوگئے...... مم...... مگر کیسے'' انور

سونگی نے حیرت سے پوچھا۔

''ڈاکوؤں نے نہایت بے دردی سے انہیں شہید کیا ان پر اتنا ظلم کیا گیا کہ ان کی شکل تک نا قابل شناخت ہو گئی تھی۔

''پھر اس کی شناخت کیسے ہوئی'' انور سونگی نے پھر پوچھا۔

''ان کی گھڑی اور ہاتھ میں پہنی چاندی کی انگوٹھی سے.....'' اس کی بیوی نے جواب دیا تو انور سونگی کو یاد آیا کہ جس وقت ڈاکوؤں کو پتا چلا تھا کہ وہ پولیس کا مخبر ہے تو انہوں نے اسے مار پیٹ کر اس کے ہاتھ سے انگوٹھی اور گھڑی اُتار لی تھی۔ انور سونگی نے ایک گہرا سانس لیا اب اس کی سمجھ میں آیا کہ اسے مُردہ کیسے سمجھ لیا گیا یقیناً کسی ڈاکو نے اس کی انگوٹھی اور گھڑی پہن لی ہوگی اور پھر پولیس مقابلے میں مارا گیا ہوگا۔

''میں انور کے ساتھ ہی ڈاکوؤں کی قید میں تھا اور انور نے ہی مجھے فرار کرایا تھا..... ہاں..... یاد آیا انور کی ایک بیٹی تھی قید کے دنوں میں وہ اس کو بہت یاد کرتا تھا۔'' اس نے اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''رانی..... ہاں وہ رانی کو اپنی جان سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ اب تو رانی شہر کے بڑے سکول میں پڑھ رہی ہے اور اس کی تعلیم کے سارے اخراجات حکومت برداشت کر رہی ہے۔'' اس کی بیوی نے کہا۔

''شہر کے سکول میں.....'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ہاں میرے شہید شوہر کی خواہش تھی کہ رانی پڑھ لکھ کر بڑی آفیسر بنے.....'' اس کی بیوی نے پھر جواب دیا۔

''ایک..... ایک گلاس پانی ملے گا'' اس نے کہا تو اس کی بیوی پانی لینے کیلئے دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''کیا..... کیا مجھے بتا دینا چاہئے کہ میں ہی انور سونگی ہوں'' اس نے سوچا۔

''اگر..... تم دنیا پر یہ ظاہر کر دیتے ہو کہ تم زندہ ہو تو تمہارے گھر والوں سے یہ تمام آسائشیں چھین لی جائیں گی اور وہ دوبارہ ان ہی سوکھی روٹیوں پر آ جائیں گے جو پانی میں ڈبونے کے بعد بھی نرم نہیں پڑتی تھیں..... تمہاری اچھی بھلی رانی شہر کے سکول میں [illegible] تو کیا گاؤں کے سکول میں بھی تعلیم [illegible] پائے گی..... کیا تم..... [illegible] ان کو دوبارہ [illegible]

لے جانا چاہتے ہو..... بولو..... [illegible] ہو.....'' انور سونگی کو اپنے اندر سے آواز آئی۔

''نہیں'' وہ بے اختیار چیخ اُٹھا۔

''کیا ہوا.....'' اس کی بیوی [illegible] تھی گھبرا گئی۔

''کچھ..... کچھ نہیں..... [illegible] جلدی سے پانی کا گلاس لے لیا اور غٹاغٹ پی گیا۔

''انور کی ایک نشانی میرے پاس ہے جو اس نے مجھے دی تھی'' وہ پانی پینے کے بعد بولا اور اپنے گلے میں ہاتھ ڈالا اور گلے کا تعویذ نکال لیا اور اپنی بیوی کے ہاتھ پر رکھتا ہوا بولا ''انور کو آپ لوگوں سے بے حد محبت تھی'' تعویذ دیکھ کر اس کی بیوی کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ بے اختیار تعویذ کو چومنے لگی۔

''اچھا میں چلتا ہوں.....'' اس نے کہا اور اپنی بیساکھیاں سنبھال لیں اور آخری بار اپنی بیوی کی جانب دیکھا اور بولا ''خدا آپ سب کو ساری زندگی خوش رکھے'' وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر الفاظ اس کے حلق میں پھنس گئے اور وہ اپنے آنسوؤں کو چھپاتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا..... باہر سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا انور کے قدم ایک انجانی راہ پر اٹھنے لگے جس کی کوئی منزل نہ تھی!!

خرم احمد خان

گلمیر کا آدم خور

ہماری رفتار احتیاط کی بنا پر بے حد دھیمی تھی چلتے چلتے اچانک ایک شخص کے منہ سے چیخ نکل گئی اور سب ہی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے میں نے فوراً رائفل سیدھی کی اور جھاڑی کا جائزہ لیا۔ وہاں اس بدنصیب لڑکی کا خون آلود لہنگا پڑا ہوا تھا۔ جو آدم خور نے اس کے جسم سے نوچ ڈالا تھا۔

ایک آدم خور شیر سے پنجہ آزمائی کی کہانی، وہ لوگوں کے لیے عفریت کا روپ دھار چکا تھا



یہ تھی ۵ ... میں گاڑی سے ہوا تھا۔ ان ... سے گلمیر کا رابطہ صرف بیل گاڑی سے ممکن تھا۔ ان دنوں ... اور گلمیر کے درمیان بیل گاڑیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بند ہو چکا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ علاقے کا کاروبار معطل تھا۔ ہر طرف آدم خور کی سرگرمیوں کا چرچا تھا۔ لوگ اپنے گھروں کے آس پاس چلتے پھرتے ہوئے ڈرتے تھے اور راتوں کو ذرا سی انجانی آواز پر کان کھڑے ہو جاتے۔ ہم ... اچھل پڑتے اور دل دھڑکنے لگتے۔ جب میں کوس کے ریلوے سٹیشن پر اترا شام ہو رہی تھی۔ تین دن اور دو راتیں ریل گاڑی میں مسلسل سفر کرتے ہوئے گزری تھیں۔ میں تھکن سے چور تھا، جسم درد سے ٹوٹ رہا تھا۔

اس علاقے کے فاریسٹ آفیسر کا دفتر اور مکان کوس ہی میں تھا۔ دوسرے سرکاری کارندوں کا

مرکز بھی کوس ہی تھا۔ اخبارات کے ذریعے دو تین بار شکاریوں سے اپیل کی گئی تھی کہ اس آدم خور کو ہلاک کرنے کی کوشش کریں جو وادی کلمیر اور اطراف و اکناف کے جنگلات میں مہینوں سے بلاشرکت غیرے حکومت کر رہا تھا۔ اس اپیل کو شائع ہوئے ایک ماہ ہو چکا تھا۔ اس لئے غالباً سرکاری کارندوں کو کسی شکاری کی آمد کی توقع نہیں رہی تھی۔ میں ریلوے سٹیشن سے فاریسٹ آفیسر کا مکان تلاش کرتا ہوا چلا جب میں ان کے مکان پر پہنچا تو وہ مجھ سے مل کر کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئے۔

"میں کوشش کروں گا کہ آپ کی ہر طرح مدد کروں۔ ویسے بڑے بڑے تجربہ کار شکاری اس آدم خور سے شکست کھا چکے ہیں۔" انہوں نے بجھی ہوئی آواز سے کہا۔ لیکن نہ یہ الفاظ میرے لئے نئے تھے اور نہ فاریسٹ آفیسر صاحب کا مایوس کن لہجہ۔ مجھ جیسے چھریرے اور کمزور شہری بابو کی وضع قطع کے آدمی سے کون توقع کر سکتا تھا کہ ایک خوفناک آدم خور کو ہلاک کر سکے گا۔ فاریسٹ آفیسر نے اپنے مکان سے کچھ فاصلے پر ایک دوسرے مکان میں میرے سونے کا انتظام فرمایا۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ لیٹے لیٹے نہ جانے کب نیند آ گئی۔ صبح جب آنکھ کھلی تو آٹھ بج چکے تھے۔ میں نے منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا اور فاریسٹ آفیسر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے کہا "صبح ہی سے اس فکر میں ہوں کہ آپ کو کلمیر کیوں کر پہنچاؤں۔"

"کیوں۔"

"آپ کے ساتھ چلنے پر کوئی آمادہ نہیں۔" انہوں نے مجبوری کا اظہار کیا لیکن میں نے اس مجبوری کو محسوس کرنے اور ان سے ہمدردی جتلانے کے بجائے خاموشی اختیار کی۔ میرا خیال ہے کہ فاریسٹ آفیسر صاحب اگر چاہتے تو دو چار آدمی میرے ساتھ چلنے پر تیار ہو ہی جاتے لیکن کسی وجہ سے انہوں نے اپنی حاکمانہ حیثیت سے کام لینا مناسب نہ سمجھا۔ اس کا سبب کیا تھا میں کبھی نہ جان سکا...... فاریسٹ آفیسر صاحب کی سرد مہری سے مجھے صدمہ ضرور ہوا لیکن اس صدمے کو برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ اسی تگ و دو میں بارہ بج گئے۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا لیکن میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ چھلکے...... سوا بارہ بجے ایک شخص فاریسٹ آفیسر کی خدمت میں حاضر ہوا ..... وہ کسی سرکاری کام سے آیا تھا...... اور کلمیر سے ایک مختصر سے قافلے کے ساتھ آیا تھا۔ یہ قافلہ خرید و فروخت کے لئے کلمیر سے کوس پہنچا تھا اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد کلمیر واپس ہونے والا تھا۔ فاریسٹ آفیسر کا چہرہ دمک اٹھا جیسے کوئی ناگوار بوجھ ان کے سر سے اتر گیا ہو۔ پہلی بار اس سلسلے میں انہوں نے گرم جوشی کا مظاہرہ کیا اور قافلے کے دو تین آدمیوں کو طلب کیا جب وہ آئے تو ان سے میرا تعارف کرایا اور حکم دیا کہ مجھے ساتھ لے جائیں اور میرا ہر طرح سے خیال رکھیں۔ میں نے اس کرم فرمائی کے لئے فاریسٹ آفیسر کا شکریہ ادا کیا اور ان اشخاص کے ہمراہ روانہ ہو گیا۔

سوا دو بجے خرید و فروخت کے بعد یہ قافلہ کلمیر روانہ ہو گیا۔ کل سات آدمی تھے اور دو بیل گاڑیاں پانچ چھ زنگ خوردہ اور پچکے ہوئے ڈبے جن میں چھوٹے چھوٹے پتھر تھے۔ پانچ چھ کلہاڑیاں تھیں اور چار بڑے سائز کے دیسی کتے ایک گاڑی سے بندھے ہوئے تھے۔ یہ ساز و سامان آدم خور کی تواضع کے لئے تھا۔ کتے اس لئے ہمراہ تھے کہ وقت سے پہلے خطرے سے آگاہ کر دیں اور ڈبے اس لئے ساتھ تھے کہ جنگل سے گزریں تو بجاتے گزریں تاکہ آدم خور شور و غل سن کر بھاگ جائے۔ ہمیں ایک

گنجان جنگل سے گزرتا تھا۔ ہر طرف اونچے اونچے درختوں کا سلسلہ اور جابجا جھاڑیوں کی کثرت تھی اور جھاڑیاں بھی ایسی کہ آدم خور دبک کر بیٹھ جائے تو نظر ہی نہ آسکے۔ کلمیر جانے والی پگڈنڈی خاصی خطرناک تھی۔ ان جھاڑیوں کی آڑ لے کر آدم خور ہم پر بڑی آسانی سے حملہ کرسکتا تھا اور پھر کئی دنوں سے کوئی واردات نہیں ہوئی تھی یعنی کئی دنوں سے آدم خور کو موقع نہیں ملا تھا کہ کسی کو ہلاک کرکے اپنا پیٹ بھر سکے وہ یقیناً بھوکا تھا اور اس جنگل میں اس کے بھوک سے بے تاب ہوکر بھٹکتے پھرنے کا کافی امکان تھا۔ اور اس کا بھی خاصا امکان تھا کہ بھوک سے بے تاب ہوکر وہ ہمارے ہی قافلے پر ٹوٹ پڑے...... اگرچہ یہ قافلہ اسی جنگل سے صحیح سلامت گزر کر کوس پہنچا تھا۔ اس لئے گمان غالب تھا کہ آدم خور اس علاقے میں نہیں تھا لیکن ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں پہنچنے میں آدم خور کو دیر ہی کتنی لگتی ہے۔

جنگل میں داخل ہوتے ہی چاروں کتوں کو کھول دیا گیا اور وہ اپنی عادت کے مطابق ادھر ادھر دوڑتے اور جھاڑیوں کو تاکتے جھانکتے ہوئے ہماری گاڑیوں کے آگے پیچھے چلنے لگے۔ گاڑیوں میں ہر شخص بالکل تیار بیٹھا تھا کلہاڑیاں بیچ میں اس طرح رکھ لی گئی تھیں کہ جب موقع آئے فوراً ہاتھ آجائیں۔ ڈبے بھی پاس ہی تھے۔ اس اہتمام کے باوجود میں بڑی احتیاط سے اطراف و اکناف کا جائزہ لیتا رہا۔ رائفل میرے ساتھ تھی اور میں ہر امکانی خطرے کا مقابلہ کرنے کو بالکل تیار تھا۔ ہم کلمیر پہنچے تو میں نے محسوس کیا سب کے چہرے خوف سے سفید پڑ چکے تھے اور جسم درد سے ٹوٹ رہے تھے۔

وادی کلمیر میں کلمیر ہی ایک ایسی بستی ہے جسے گاؤں کہا جاسکتا ہے۔ یہ خاصا بڑا گاؤں ہے زیادہ تر لکڑی کاٹنے والے اس گاؤں میں آباد ہیں۔ بچہ بڑا ہوتے ہی کلہاڑی اور آرا لئے جنگل کا رُخ کرتا ہے۔ گاؤں سے کچھ فاصلے پر دریائے برہما کی سمت ایک مندر ہے۔ کلمیر کے علاوہ اس وادی میں کوئی اور آبادی اتنی بڑی نہیں ہے۔ اس وادی میں جابجا چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں ان بستیوں میں زیادہ سے زیادہ بیس بائیس جھونپڑے ہوتے ہیں۔ مٹی کی دیواریں اور گھاس پھوس اور پتوں کی ہلکی پھلکی چھت جو دو چار بانسوں کے سہارے مٹی کی دیواروں پر کس دی جاتی ہے۔

وادی کلمیر میں آدم خور کو ظاہر ہوئے چار مہینے گزر چکے تھے۔ دو تین شکاری اس عرصے میں اسے ہلاک کرنے کی ناکام کوشش کرچکے تھے۔ کئی مرد اور عورتیں اس کا لقمہ بن چکی تھیں۔ ابتداء میں جب اس وادی کے لوگ آدم خور کے وجود سے ناواقف تھے آدم خور کی سرگرمیاں تیز رہیں۔ وہ ہر دوسرے دن کسی نہ کسی کو کہیں نہ کہیں دبوچ لیتا...... کلمیر کے لوگ جب آدم خور کے ڈر سے جنگل کا رُخ کرنے سے باز رہنے لگے تو اس نے وادی کلمیر کے قصبوں کا رُخ کرلیا...... لوگ بے خبر ہوتے اور آدم خور کو موقع مل جاتا لیکن رفتہ رفتہ ساری وادی میں خوف پھیل گیا۔

مختلف اشخاص سے گفتگو کرنے کے بعد مجھے ضروری معلومات حاصل ہوسکیں۔ آدم خور کو دو تین حضرات نے دیکھا بھی تھا۔ وہ ایک طاقتور شیر تھا تازہ ترین واردات دو روز پہلے کلمیر سے کچھ میل دور ایک گاؤں میں ہوئی تھی۔ آدم خور ایک جھونپڑی کے دروازے سے بارہ چودہ سال کے لڑکے کو اُٹھا لے گیا تھا۔ یہ حادثہ صبح سویرے ہوا تھا مجھے اس اطلاع کی صداقت پر شک تھا۔ صبح کے وقت ایک طاقتور

شیر کا بستی میں داخل ہو کر کسی جھونپڑی سے بارہ چودہ سال کے لڑکے کو اُٹھا لے جانا بہت مشکل ہے۔ اگر کوئی اسے دیکھ نہ سکا تو گاؤں کے لاتعداد کتوں میں سے کسی ایک نے تو دیکھا ہوگا۔ صرف ایک کتے کا بھونکنا کافی ہوتا ہے۔ سارے ہی کتے دوسرے ہی لمحے راگ مالا چھیڑ دیتے ہیں اور آدم خور کے لئے اس ماحول میں جہاں اس کی شخصیت کی شان میں اس انداز سے خراج تحسین پیش کیا جا رہا ہو اپنی سرگرمیاں جاری رکھنا محال ہو جاتا ہے اور وہ فرار ہو جاتا ہے۔ محکمہ جنگلات کے کارندوں کے ذریعے وادی کلمیر کے اکثر دیہاتوں میں خبر پہنچائی گئی کہ میں کلمیر میں قیام پذیر ہوں اور جہاں کوئی تازہ واردات ہو مجھے فوراً اطلاع دی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کلمیر میں مجھے حکومت کا خاص آدمی سمجھا گیا چنانچہ ان کے کارندے ہر ہر قدم پر تعاون کے لئے آمادہ رہتے تھے۔

دو دن تک مجھے کہیں سے کوئی اطلاع نہ ملی۔ اس اثناء میں میں اکثر دریا کے کنارے دُور دُور تک نکل جاتا لیکن آدم خور سے کبھی میری مڈبھیڑ نہ ہوئی۔ مختلف مقامات پر اس کے پنجوں کے نشانات ضرور ملے۔ جنہیں دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ آدم خور دراصل ایک صحت مند نوجوان اور بھاری جسم کا نر ہے۔ دو تین بار ان نشانات کی مدد سے میں نے اسے ڈھونڈ نکالنے کی کوشش بھی کی لیکن میں کچھ زیادہ دُور تک نہ جا سکا۔ اپنی عادت کے مطابق میں تنہا ہی مارا مارا پھرتا رہا کسی کو ساتھ لے کر شکار کی غرض سے گھومنا جب کہ آدم خور سے واسطہ ہو بڑا ہی خطرناک ہوتا ہے اور اپنے علاوہ دوسرے شخص کی حفاظت کا خیال اکثر جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ ساری ساری رات میں کلمیر کی کسی جھونپڑی میں آدم خور کے انتظار میں جاگتا رہا..... چوتھے دن میں صبح دس بجے رائفل اٹھائے دریا کی طرف چلا تھا کہ چار آدمی مجھے پوچھتے ہوئے پہنچے۔ ان میں ایک محکمہ جنگلات کا کارندہ تھا اور اپنی پرانی وضع کی بندوق ساتھ لایا تھا۔ حوصلہ رکھنے کے لئے اس قسم کی بندوق مفید تو ہو سکتی ہے لیکن آدم خور کے مقابلے میں اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ چھ میل دُور ایک گاؤں سے آئے تھے۔ کلمیر کے بعد یہی گاؤں اس علاقہ کا بڑا گاؤں سمجھا جاتا تھا۔ آدم خور اس گاؤں کے مندر سے صبح صبح پجاری کو اٹھا لے گیا تھا۔ تفصیلات پوچھے بغیر میں نے اپنا تھرماس' بسکٹوں کا پیکٹ' ٹارچ' تمباکو کا پیکٹ اور پائپ وغیرہ بیگ میں ڈالے اور رائفل اٹھائے ہوئے ان کے ہمراہ روانہ ہوگیا۔ اگرچہ یہ لوگ طویل فاصلہ طے کر کے آئے تھے لیکن ہم سب بڑی تیزی سے ایک بجے منزل مقصود پر پہنچے۔ میں نے مندر کا جائزہ لیا یہ مندر بھی گاؤں سے ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھا۔ لیکن پجاری گاؤں سے اتنی دُور راتوں کو تنہا کیوں رہا کرتا تھا؟ کیا گاؤں میں رات گزارنے کی کوئی صورت نہ تھی؟ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی قضا اسے وہاں کھینچ لائی تھی...... ایک بوڑھے شخص نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ پجاری ساری رات بڑا بے چین تھا۔ وہ اس کی جھونپڑی میں رہا کرتا تھا رات کو وہ بارہا اُٹھ بیٹھتا اور کہتا کہ مندر چھوڑنے کی وجہ سے بھگوان اس سے ناراض ہوگیا ہے۔ چنانچہ وہ صبح صبح ہی مندر کو روانہ ہوگیا..... اور بھگوان نے اسے سزا دی۔

''بابا کاہے کی سزا دی بھگوان نے؟'' میں نے بوڑھے سے پوچھا اس کا انداز گفتگو مجھے بڑا بُرا لگا۔

''وہ مندر سے یہاں آ جاتا تھا بھگوان سب سے بڑا رکھوالا ہے وہ پجاری ہو کر اتنی بڑی بات

بھوت تھا؟" بوڑھے نے آنکھیں نچاتے ہوئے کہا۔

"جب بھگوان سب سے بڑا رکھوالا ہے تو تم کیوں جھونپڑی میں دم دبائے بیٹھے ہو کام پر جاؤ جنگل میں درخت کاٹو کیوں بھوکے مر رہے ہو کیا بھگوان تم لوگوں کا رکھوالا نہیں ہے؟"۔ میں نے کہا تو بوڑھے نے بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور سر ہلا کر رہ گیا۔

میں نے مندر کا جائزہ لیا۔ دروازے کے پاس ہی خون کے کچھ دھبے اور شیر کے پنجوں کے واضح نشانات نظر آئے۔ یہ وہی نشانات تھے جو میں کلمیر کے آس پاس بارہا دیکھ چکا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ آدم خور صبح صبح مندر تک آیا اور اس نے مندر کا دروازہ توڑ کر اندر کا جائزہ لیا..... جب وہ واپس جا رہا تھا تو اسے پجاری نظر آیا..... اور وہ اسے دبوچ کر روانہ ہو گیا۔ دروازہ ٹوٹا پڑا تھا اور اس پر شیر کے پنجوں کے دو چار نشان تھے۔

میں نے اپنے ساتھیوں کو اپنے اپنے گھر جانے کی ہدایت دی اور انہیں سمجھا دیا کہ اگلے دن اگر صبح نو بجے تک میں واپس نہ آسکوں تو وہ دس پندرہ آدمیوں کا جتھا بنا کر میری تلاش میں نکلیں۔ یہ لوگ بستی کی طرف روانہ ہوئے اور میں پنجوں کے نشانات کے سہارے آدم خور کی تلاش میں چل دیا۔ مندر کے پجاری کو آدم خور غالباً گردن سے پکڑ کر اٹھا لے گیا تھا۔ اس کے پنجوں کے نشانات کے علاوہ جابجا پجاری کی دھوتی کی دھجیاں ملتی گئیں۔ کہیں کہیں ان جھاڑیوں سے گوشت کے ٹکڑے چپٹے ہوئے نظر آئے۔ غالباً پجاری نے بار بار ان جھاڑیوں کو پکڑ کر خود کو آدم خور کے منہ سے چھڑانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ اس کوشش میں اس کی انگلیاں چھلنی ہوتی گئیں۔ آدم خور اسے اس طرح اٹھائے لیے جا رہا تھا کہ پجاری زمین سے رگڑ کھاتا اور نشان چھوڑتا چلا گیا تھا۔ مجھے تعاقب کرنے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہ آئی کہ آدم خور پگڈنڈی سے گزرا تھا..... میں قدم قدم پر سنبھلتے ہوئے تقریباً دو میل دُور نکل گیا..... میں نے اندازہ لگایا کہ مجھ سے پہلے آئے ہوئے شکاریوں نے اُلٹی سیدھی حرکتیں کر کے آدم خور کو بے حد محتاط بنا دیا تھا۔ جنگل کے اس حصے میں اس قدر گھنی جھاڑیاں تھیں کہ آدم خور کو اس قدر فاصلہ طے کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی..... مجھے اب ایک اور اندیشہ تھا۔ ممکن ہے آدم خور اس قدر محتاط ہو گیا ہو کہ پہلی بار وہ لاش کو جس قدر کھا سکے کھا لے اور باقی حصہ کھانے نہ آئے اور میری ساری محنت ضائع ہو جائے۔ ایک آدھ فرلانگ اور چلنے کے بعد ایک درخت کے پاس مجھے خون کا بڑا سا دھبہ نظر آیا۔ آدم خور نے یہاں رُک کر غالباً پجاری کا ناشتہ کیا تھا اور یہاں پہنچنے تک پجاری مر چکا تھا۔ ورنہ آدم خور سے کشمکش کے کچھ نہ کچھ نشانات زمین پر پائے جاتے..... میں نے رُک کر اطراف واکناف کا تفصیلی جائزہ لیا آدم خور کچھ کھانے کے بعد یا کھاتے کھاتے کسی خطرے کو محسوس کر کے لاش کو اُٹھا کر آگے نکل چکا تھا۔ کسی وقت بھی آدم خور سے میری مڈبھیڑ کا امکان تھا۔ میں ایک ایک قدم گن رہا تھا ایک ایک جھاڑی کو دیکھ رہا تھا۔ دائیں بائیں اور پیچھے بھی دیکھتا جاتا تھا..... کوئی ایک فرلانگ چلنے کے بعد مجھے ایک جھاڑی میں کسی شے کا احساس ہوا..... میں نے رُک کر رائفل سیدھی کی اور ہر امکانی خطرے کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہو کر غور سے دیکھا تو جھاڑی میں آدم خور نہیں تھا۔ پجاری کی لاش پڑی تھی' میں نے ایک بار پھر اطراف واکناف کا جائزہ لیا اور دبے پاؤں لاش کے پاس پہنچا۔ صرف جسم کا بالائی حصہ وہیں پڑا تھا اور نچلے حصے غائب تھے۔ آدم خور نے ناشتہ کر لیا تھا اور لاش

کو جھاڑی میں چھپا کر ستانے نکل گیا تھا۔ لاش کو اگر وہ یوں ہی چھوڑ جاتا تو میرا وہاں رُکنا لاحاصل تھا۔ لیکن لاش جھاڑی میں اس انداز سے رکھی ہوئی تھی کہ آدم خور کے دوبارہ آنے اور باقی حصہ کھانے کا ارادہ ظاہر ہوتا تھا۔ اب آدم خور کا تعاقب ہلاکت آفرین تھا۔ چنانچہ میں نے درختوں کا جائزہ لیا اور پھر ایک گھنے درخت پر چڑھ گیا اور پندرہ سولہ فٹ کی بلندی پر ایک مہ شاخے پر جا بیٹھا جہاں میں نہ صرف آرام سے بیٹھ سکتا تھا بلکہ بلاخوف و خطر اونگھ بھی سکتا تھا۔...... میں نے گھڑی دیکھی تین بج چکے تھے۔ میں نے تھرماس سے چائے پی اور پائپ جلا کر آدم خور کا انتظار کرنے لگا۔ دھیرے دھیرے وقت گزرتا گیا اور آخر کار اندھیرا ہو گیا۔ چاندنی رات بھی نہیں تھی کہ میں آدم خور کی آمد سے واقف ہو سکتا۔ مجھے اس جھاڑی کے محل وقوع کا اندازہ تھا ورنہ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ جنگلی گیدڑوں کا شور البتہ سنائی دے رہا تھا لیکن سناٹا اس قدر مہیب تھا کہ اس مسلسل شور سے سناٹے کے احساس میں کمی نہیں ہوئی تھی۔ میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا اور اس درخت پر مجھے رات بسر کرنی تھی۔ پائپ بجھ چکا تھا لیکن اسے دوبارہ جلانا ساری محنت پر گویا پانی پھیرنا تھا ماچس کی روشنی آدم خور کو چونکا سکتی تھی اور وہ کسی لمحہ بھی آ سکتا تھا۔

ساڑھے سات بجنے کو تھے مجھے کچھ فاصلے پر گیدڑ کی ہواں ہواں سنائی دی۔ یہ آواز بے حد معنی خیز ہوتی ہے میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ جنگل کا بگڑا ہوا بادشاہ آ رہا تھا۔ میں نے رائفل سنبھال لی۔ نالی پر میں ٹارچ پہلے ہی فٹ کر چکا تھا...... پانچ منٹ گزر گئے...... اور پھر دس...... پندرہ...... اور بیس منٹ گزر گئے...... ایک ایک لمحہ اس انداز سے گزر رہا تھا جیسے [illegible] یکایک مجھے آواز سنائی دی۔

ہڈی کی چڑ چڑ......

آدم خور دبے پاؤں آ چکا تھا اور کھانے میں مصروف تھا...... پھر دوسری آواز آئی اور پھر آوازوں کا سلسلہ شروع ہو گیا......

میں نے رائفل اُٹھائی اور جھاڑی کا نشانہ لے کر ٹارچ کا بٹن دبایا مگر ایک لمحے کے بعد میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ٹارچ کام نہیں کر رہی تھی میں نے دو تین بار بٹن دبایا ٹارچ پھر بھی نہ چلی ادھر آدم خور مصروف طعام تھا اور آوازوں کا سلسلہ جاری تھا۔ میں نے دھیرے سے ٹارچ کھول کر سیل دیکھے پہلا سیل ہی اُلٹا لگا ہوا تھا میں نے سیل درست کر لیے۔ ٹارچ سے روشنی پھوٹ پڑی......

”رہووف“ انتہائی غضب ناک ہو کر آدم خور نے اپنے جذبات کا اظہار کیا اور تاریکی میں غائب ہو گیا۔ میں اس کی صرف ایک ہلکی سی جھلک ہی دیکھ سکا۔ وہ بھی مجھے دیکھ چکا تھا اور اب اس کے دوبارہ نظر آنے کا کوئی امکان نہیں تھا بلکہ میں اپنے آپ کو موت کے منہ میں محسوس کر رہا تھا۔ وہ مجھ تک پہنچ تو نہیں سکتا تھا لیکن صبح کو واپسی کے وقت وہ جنگل میں کہیں چھپ کر مجھ سے انتقام ضرور لے سکتا تھا اور آدم خور کا انتقام بڑا بھیانک ہوتا ہے۔ میں نے فوراً پائپ جلایا اور پھر چائے پی کر ایک موہوم سی اُمید پر اس کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے یہ اندیشہ تھا کہ بھوک سے بے قرار ہو کر کہیں بستی کے کسی مکان پر دھاوا نہ بول دے...... میں بڑی دیر تک کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سننے کی کوشش کرتا رہا...... لیکن میں بستی سے بہت دور تھا۔ رات کے پچھلے پہر ٹھنڈی ہوا تیزی سے چلنے لگی۔ ہوا کے شور میں بھی کان لگائے بیٹھا رہا لیکن وہ نہیں آیا...... صبح جب سورج کی پہلی کرنیں نمودار ہوئیں تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ پجاری کی لاش غائب تھی۔ آدم خور یقیناً آیا تھا اور وہ لاش چپکے سے

اٹھا لے گیا تھا۔ ہوا کا شور اس قدر تھا کہ میں اس کی نقل و حرکت کی آواز ہی نہ سن سکا...... میں نے سوچا کہ آدم خور کس قدر چالاک ہے۔

ساری رات میں نے درخت پر بیٹھے بیٹھے گزار دی تھی چنانچہ میں گاؤں پہنچ کر سو گیا۔ چار بجے اٹھ کر میں نے ناشتہ کیا اور رائفل اٹھائے اسی پگڈنڈی پر روانہ ہو گیا جس سے آدم خور پجاری کو اٹھائے ہوئے گزرا تھا۔ اسی پگڈنڈی سے صبح لوگ ایک بڑے جتھے کی شکل میں مجھے ڈھونڈتے ہوئے آئے تھے اور اسی پگڈنڈی پر بہ مشکل ایک فرلانگ چلا تھا کہ مجھے شیر کے پنجوں کے نشانات نظر آئے۔ یہ وہی جانے پہچانے نشان تھے اس کا مطلب تھا کہ صبح آدم خور وہاں سے گزرا تھا۔ گزرا ہی نہیں تھا بلکہ جہاں وہ نشانات نظر آئے آدم خور وہاں تک آ کر لوٹ گیا تھا۔ کیا آدم خور نے میرا اور میرے ساتھیوں کا تعاقب کیا تھا؟ ہمارے جوتوں کے نشانات کو دیکھتا ہوا بہت دور تک چلا گیا۔ آدم خور نے ہمارا تعاقب کیا تھا۔ تعاقب کرتے ہوئے اس کی چال اور رفتار میں بار بار تبدیلی ہوئی تھی کہیں وہ تیزی سے آگے بڑھا اور کہیں دھیرے دھیرے پیچھا کرتا رہا۔ کبھی وہ پگڈنڈی پہ آیا اور کبھی جھاڑیوں کی آڑ میں پیچھا کرتا رہا۔ میں نے آگے بڑھنا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے آدم خور کی چالاکی کا اندازہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں بستی کو لوٹ آیا اور لوگوں سے میں نے دو بچھڑوں کی فراہمی کیلئے گفتگو کی۔ گاؤں میں جانور برائے نام ہی تھے اور کسی دوسرے گاؤں یا کلمیر سے بچھڑے فراہم کرنا دشوار تھا۔

میں آدم خور کی تلاش میں روزانہ بہت دور تک نکل جاتا اور اکثر ایک بستی سے دوسری بستی تک چلا جاتا اور وہاں رات گزار کر پھر صبح کو لوٹ آتا۔ مجھے آدم خور کہیں نظر نہ آ سکا اور ایک ہفتے تک کوئی واردات نہ ہوئی۔

آٹھویں دن آدم خور دریا کے پاس ہی ایک بستی سے کسی عورت کو اٹھا لے گیا۔ مجھے اس واقعے کی اطلاع تیسرے دن ملی جب میں وہاں پہنچا تو بڑی تلاش کے بعد مجھے کچھ ہڈیاں اور گوشت کے لوتھڑے مل سکے۔ مجھے اس کا کوئی اندازہ نہ ہو سکا کہ آدم خور نے ایک ہی مرتبہ سب کچھ کھا لیا تھا۔ یا اس نے دو قسطوں میں اپنا پیٹ بھرا تھا۔ پجاری کی لاش پر دوبارہ آنے اور خطرے سے دوچار ہو جانے کے بعد اسے سبق ضرور مل چکا تھا کہ دوبارہ جانا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے اس سے پہلے بھی اسے دوسرے شکاریوں نے یہ سبق دیا تھا۔ چوتھے دن آدم خور ایک قریبی بستی سے ایک بوڑھے شخص کو اٹھا لے گیا۔ اس کی اطلاع مجھے اس وقت ملی جب میں اس واقعے کے پانچویں دن اچانک وہاں جا پہنچا۔

اس واقعے کے دوسرے ہی دن آدم خور وادی کلمیر کی ایک چھوٹی سی بستی سے کسی لڑکی کو اٹھا لے گیا۔ مجھے اطلاع دینے آدمی دوڑائے گئے لیکن میں جنگل میں مارا مارا پھر رہا تھا وہ مجھے جنگل میں تلاش کرتے پھرے لیکن میں انہیں نہ مل سکا۔ جب میں آوارہ گردی کرتا ہوا بستی میں پہنچا تو دو بج رہے تھے اور چھ آدمی کلہاڑیوں سے لیس میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں بے حد تھک چکا تھا، وہ بھی مجھے تلاش کرتے ہوئے تھک گئے تھے لیکن میں نے محسوس کیا کہ اگر ان کے ہمراہ جانے سے انکار کرتا ہوں تو ان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں اور آدم خور کو ہلاک کرنے کا ایک موقع پھر ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ وادی کلمیر کے باشندے اس قدر خوف زدہ نظر آتے تھے کہ کسی واقعہ کی مجھے اطلاع تک دینے کے لئے آمادہ نہ ہوتے تھے۔ چنانچہ میں نے

اپنا بیگ سنبھالا، رائفل اٹھائی اور ان کے ہمراہ روانہ ہوگیا۔ فاصلہ خاصا تھا اور میرے ساتھیوں کا خیال تھا کہ ہم اندھیرے سے پہلے منزل مقصود تک پہنچ سکیں گے۔ اگر ہم جنگل کے درمیان سے ہو کر گزرتے تو فاصلہ تو ضرور کم ہو جاتا لیکن اس راستے پر اس قدر جھاڑیاں تھیں کہ ہم اس راستے پر تیزی سے بے خوف و خطر نہیں گزر سکتے تھے۔ چنانچہ ہم نے جنگل کے درمیان سے گزرنے کے بجائے کسی قدر طویل راستہ اختیار کیا جس پر جھاڑیاں اتنی نہ تھیں کہ اچانک حملے کے خوف سے ہمیں سنبھل کر چلنا پڑتا۔ ہم تیزی سے رواں دواں تھے۔ میں سورج ڈوبنے سے قبل وہاں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ہم دو تین چھوٹی بستیوں میں سے گزرے بھی تھے لیکن ہم برابر چلتے رہے اس کے باوجود سورج غروب ہونے سے پہلے منزل مقصود تک پہنچنا محال نظر آ رہا تھا..... جب ہم گاؤں کے قریب آ گئے تو مجھے بتلایا گیا کہ آدم خور بستی سے لڑکی کو اٹھائے ہوئے اسی طرف آیا تھا۔ جس طرف سے ہم بستی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یعنی کسی وقت بھی آدم خور سے ہماری ملاقات ہو سکتی تھی۔ اس کا بھی امکان تھا کہ آدم خور اچانک حملہ آور ہو جائے۔ یہ بھی ممکن تھا..... کہ آدم خور مال غنیمت لئے ہوئے بستی سے زیادہ دور نہ گیا ہو بلکہ اس علاقے میں کہیں موجود ہو اور ہماری آمد کو اپنے کاروبار میں بے جا مداخلت خیال کرتے ہوئے اس کے تدارک کا ارادہ کر لے۔ ہم نے رفتار کم کر دی اور حد درجہ محتاط ہو گئے۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور روشنی کچھ ہی دیر کی مہمان تھی۔ سلامتی اسی میں تھی کہ ہم اندھیرا ہونے سے قبل اس علاقے سے گزر کر بستی میں پہنچ جائیں لیکن ہر ہر قدم پر آدم خور کا اندیشہ تھا۔ ہماری رفتار احتیاط کی بنا پر بے حد دھیمی تھی چلتے چلتے اچانک ایک شخص کے منہ سے چیخ نکل گئی اور سب ہی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے میں نے فوراً رائفل سیدھی کی اور جھاڑی کا جائزہ لیا۔ وہاں اس بدنصیب لڑکی کا خون آلود لہنگا پڑا ہوا تھا۔ جو آدم خور نے اس کے جسم سے نوچ ڈالا تھا۔ ہم سب کو یقین ہو گیا کہ لاش بھی آس پاس ہی کہیں ہو گی اور بہت ممکن ہے کہ آدم خور بھی کہیں موجود ہو..... میں نے قرب و جوار کی جھاڑیوں کو ٹٹولنا شروع کیا۔ اندھیرا تیزی سے جنگل پر مسلط ہو رہا تھا یہ محض ایک اتفاق تھا کہ ہمیں اس قدر آسانی سے لاش کا سراغ مل گیا تھا میں نے کوشش کی کہ میرے ساتھی مجھے چھوڑ کر آگے نکل جائیں لیکن ان میں سے کوئی بھی جانے پر آمادہ نہ ہوتا تھا ان کا اصرار تھا کہ میں ان کے ہمراہ چلوں۔ گاؤں تین سوا میل کے فاصلے پر تھا اور میرے لئے یہ انتہائی دشوار تھا کہ انہیں گاؤں پہنچا کر میں پھر لوٹ آتا۔ ایسے علاقے میں جو جھاڑیوں سے پٹا ہوا ہو اور جہاں آدم خور موجود ہو اندھیرے میں میل سوا میل کا فاصلہ طے کرنا خواہ مخواہ اپنی جان سے کھیلنے کے مترادف ہے لیکن میرے لئے اب اس کے سوا کوئی صورت ہی نہیں تھی کہ میں لاش کو تلاش کرتا اور پھر اپنے ساتھیوں کو گاؤں پہنچا کر وہاں تک لوٹ آتا۔ لاش ڈھونڈتے ڈھونڈتے اندھیرا ہو گیا۔ آدم خور وہاں موجود نہیں تھا ہمیں لاش ایک جھاڑی میں پڑی ہوئی ملی یہ ایک نوجوان لڑکی کی لاش تھی جس کا لباس آدم خور نے نوچ پھینکا تھا۔

جیسے جیسے ہم گاؤں سے قریب ہوتے جا رہے تھے اور جیسے جیسے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا مجھے احساس ہوتا جا رہا تھا کہ واپس تنہا لوٹنے کی کوشش احمقانہ ہوگی۔

میرے ساتھیوں نے گاؤں کے لوگوں کو آگاہ کر دیا کہ اس بدنصیب لڑکی کی لاش ایک جھاڑی میں پڑی ہوئی ملی۔ اس کی ماں زمین پر لوٹتی جاتی تھی۔ سر پر مٹی ڈالتی اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر

کچھ کہتی اور پھر سینہ پیٹ لیتی۔ مجھ سے ایسے مناظر بھی نہ دیکھے گئے اور میں چپکے سے ایک درخت تلے جا بیٹھا۔ لڑکی کا باپ میرے پاس آیا اور میری منت سماجت کرنے لگا کہ لڑکی کی لاش کو اٹھا لانے میں مدد کروں تاکہ وہ اپنی لڑکی کی آخری رسومات انجام دے سکے۔ .... مجھے یقین تھا کہ آدم خور رات کو آئے گا اور لاش کے باقی حصے کھا جائے گا۔ اس لاش کو اٹھا لانا اسے محتاط ہونے کا سبق دینا تھا۔ آدم خور جتنا محتاط ہوتا ہے اسے ہلاک کرنا اتنا ہی دشوار ہوتا جاتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس مرتبہ بھی آدم خور اطمینان سے اپنا پیٹ بھر لے .... دو مرتبہ ایسا ہو ہو چکا تھا .... ایک بار اور سہی تاکہ آدم خور کو یقین ہو جائے کہ اس کے کاروبار میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جاتی اور وہ محتاط رہنے کی ضرورت نہ محسوس کرے۔ میں نے لاش لانے سے انکار کر دیا تو لڑکی کا باپ مایوس ہو کر اپنی بیوی کے پاس چلا گیا۔ [illegible] نے باپ چلایا تو لڑکی کی ماں روتی ہوئی میرے پاس آئی۔ [illegible] سے [illegible] مجھ [illegible] [illegible] تھی۔ میں نے [illegible] وہ منتظر تھی کہ میں لڑکی کی [illegible] دوں۔ اس عورت [illegible] [illegible] دن کو [illegible] رہی تھی بھی وہ ہاتھ جوڑتی، کبھی [illegible] تھا [illegible] بھی سینہ پیٹتی اور کبھی میری منت [illegible] [illegible] اس کی زبان سے میں بے بہرہ تھا۔ لیکن [illegible] الفاظ کا مفہوم میں سمجھ رہا تھا۔ میں نے [illegible] لوگوں سے کہا بھی کہ وہ [illegible] سمجھا [illegible] [illegible] اور مجھے پریشان نہ کریں لیکن وہ [illegible] [illegible] نہ مانتی تھی۔ اس بدنصیب عورت کی تڑپ مجھے آج بھی یاد ہے۔ اس کی درد بھری چیخیں اب بھی میرے کانوں میں گونجتی ہیں۔ وہ منظر اب بھی [illegible] تصور [illegible] ہوتا ہے۔

گاؤں ایسا تھا کہ ایک قندیل تک فراہم نہ

ہو سکی۔ میں نے کچھ آدمی ساتھ لئے جن میں اس بدنصیب لڑکی کا غمزدہ باپ بھی شامل تھا اور جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں ہم چلتے گئے نہ ہمیں کسی قسم کی دشواری ہوئی اور نہ کوئی حادثہ پیش آیا لیکن مجھے اتنا ضرور محسوس ہوا کہ میرا تنہا لوٹ کر آنے کا ارادہ کس قدر احمقانہ تھا۔ لاش اسی جھاڑی میں اور اسی حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ آدم خور ابھی نہیں لوٹا تھا۔ میرے ساتھی لاش کو اٹھا کر بے خوف و خطر گاؤں کو چل دیئے۔ میں نے ایک تناور درخت منتخب کیا تاکہ اس پر بیٹھ کر آدم خور کا انتظار کر سکوں۔ درخت پر چڑھ کر میں نے ٹارچ جلایا ہی تھا کہ درخت سے کچھ فاصلے پر جھاڑیوں کی اوٹ میں دو آنکھیں مجھے چمکتی ہوئی نظر آئیں [illegible] جیسے [illegible] تاریکی میں یہ خوفناک آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ دو تین لمحوں کے بعد یہ آنکھیں بستی کی طرف [illegible] غائب ہو گئیں .... میرے ذہن میں دو سوال [illegible]

کیا یہ آدم خور تھا؟

کیا آدم خور ان لوگوں کے تعاقب میں روانہ ہوا ہے جو لڑکی کی لاش لئے ہوئے ابھی ابھی بستی کی طرف گئے ہیں؟

کچھ دیر بعد جنگل [illegible] ایک [illegible] پھر [illegible] طاری ہو گیا۔ [illegible] آدم خور جا چکا تھا۔ [illegible] [illegible] گیا رہ بجے بستی کی جانب سے آدم خور کے [illegible] کی آواز سنائی دی .... آدم خور نے [illegible] خطرہ محسوس کر لیا [illegible] [illegible] اور [illegible] بستی کی جانب جا چکا تھا۔ [illegible] [illegible] رات [illegible] .... سورج طلوع ہوا تو بستی میں پہنچنے پر مجھے معلوم ہوا کہ [illegible] رات کو شمال سمت میں جمع ہو کر بھونکتے رہے تھے۔ ناشتے کے بعد میں [illegible] اٹھائے اسی طرف روانہ ہو گیا۔ بستی سے کچھ دور مجھے آدم خور کے پنجوں کے بڑے بڑے نشانات ملے نہیں [illegible] یہ نشانات واضح تھے اور [illegible]

کہیں غیر مبہم.....

تفصیلات پوچھے بغیر میں گلمبر روانہ ہوگیا۔
جب میں گلمبر پہنچا چار بج چکے تھے میں نے ایک بار پھر رات جاگنے کا پروگرام بنایا اس مرتبہ میں نے بستی کے مندر کا انتخاب کیا۔ یہ مندر بستی سے کسی قدر دور تھا اور آدم خور پہاڑیوں سے نکل کر اگر بستی کا رخ کرتا تو مندر کے آس پاس ہی سے گزرتا۔ مندر کیا تھا کانٹوں سے گھرے ہوئے احاطے میں ایک لمبے چوڑے اور پانچ چھ فٹ اونچے چبوترے پر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اس کمرے میں چند مورتیاں تھیں جن کو گلمبر کے باشندے اپنا حاجت روا مانتے تھے۔ ادھر ادھر تھوڑا بہت سامان رکھا ہوا تھا۔ مندر کا احاطہ خاصا بڑا تھا جو کانٹے دار جھاڑیاں کاٹ کر گھیرا گیا تھا تاکہ درندے اور جنگلی جانور داخل نہ ہوسکیں۔ اس احاطے میں داخل ہونے کے لیے ایک ہی راستہ تھا جو رات کو کانٹے لگا کر بند کردیا جاتا تھا۔ میں نے یہ راستہ کھلا ہی رہنے دیا۔
جنگل میں ہر طرف مدھم سی چاندنی پھیلی ہوئی تھی گاؤں میں مندر کے چبوترے پر میں اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ آدم خور کے اچانک حملے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ میں نے ایک بار پھر بڑے جوش سے مندر کی گھنٹی بجائی اور مندر کے چبوترے پر دروازے سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ پائپ جل رہا تھا اور رائفل گود میں رکھی ہوئی تھی۔

''واگ واگ واگ''...... اچانک کئی دلخراش چیخیں میرے کانوں میں گونج اٹھیں۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا...... میں نے دُور دُور تک نظر دوڑائی لیکن مجھے کچھ نظر نہ آسکا۔ چاند ڈوب چکا تھا اور چار سو تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ نہ گاؤں میں کوئی ہلچل تھی اور نہ کتے ہی بھونک رہے تھے جنگل پر سناٹا طاری تھا جس میں دریائے برہما کی شور و شنگ موجوں کے سریلے گیت صاف سنائی دے رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے نرم و نازک جھونکے مندر کے احاطے میں کھیل رہے تھے۔ میں نے فوراً گھڑی دیکھی، پانچ بج کر دس منٹ ہوچکے تھے......!!
رات گزر چکی تھی، اور میں آدم خور کے انتظار میں مندر کے چبوترے پر بیٹھا ہوا سو گیا تھا اور وہ دن گزار کر اور میں نے خواب میں کئی نہیں۔ اگر آدم خور ادھر نکل آتا تو کیا ہوتا؟
خوف سے میرا رواں رواں کانپ اٹھا اور مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا۔ میں نے سوچا چاہیے کہ گاؤں کا چکر لگاؤں۔ میں نے [illegible] مجھے جھنجوڑ [illegible] مجھے [illegible] نظر [illegible] قریب آ چکا ہے اور مجھے سنبھلنا چاہیے۔ میں نے رائفل اٹھائی اور [illegible] ہو کر آس پاس کا جائزہ لیا۔ مجھے کچھ نظر نہ آیا لیکن یہ احساس بدستور تھا کہ مجھے تاکا جارہا ہے۔ لمحہ لمحہ وقت گزر رہا تھا اور میں پسینے میں بھیگ رہا تھا۔ سارے جسم میں تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہورہی تھی۔ اسی عالم میں نصف گھنٹہ گزر گیا۔ میں نے تھک کر انتہائی احتیاط سے پائپ جلایا۔ مجھے یقین تھا کہ آدم خور آچکا ہے لیکن وہ حملہ کیوں نہیں کرتا۔ دھیرے دھیرے رات کی سیاہی چھٹنے لگی۔ طلوعِ آفتاب کے آثار پیدا ہونے لگے۔ میں نے دیکھا مندر سے کچھ فاصلے پر ایک لمبی سی سیاہ چیز پہاڑیوں کی طرف جارہی تھی آدم خور جارہا تھا۔ شاید وہ رائفل دیکھ کر تاڑ گیا تھا کہ میں شکاری ہوں اور میں یہ سوچتے ہوئے چبوترے کی سیڑھیوں سے اُترنے لگا لیکن آخری سیڑھی پر پہنچ کر رُک گیا...... آدم خور مجھے پہچان کر روانہ نہیں ہوا تھا بلکہ میں نے اسے پہچاننے میں غلطی کی تھی۔ دھندلی سی روشنی میں میں

نے دیکھا کوئی سیاہ چیز مندر کے احاطے کی کانٹی کے ساتھ دبکے ہوئے اس طرف بڑھ رہی ہے جس طرف باہر نکلنے کا راستہ تھا اور میں خود بھی ادھر ہی جا رہا تھا۔ میں نے رُک کر دیکھا لمحہ بھر میں وہ دھبہ غائب ہو چکا تھا۔ میں نے ٹارچ جلائی...... آدم خور مجھے کہیں نظر نہ آ سکا۔ میں نے آگے بڑھنے کے بجائے ایک بار پھر چبوترے پر اپنی نشست سنبھال لی آدم خور مجھ سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا اور یہ کھیل خطرناک تھا۔

صبح ہوئی تو مندر کے احاطے کے اطراف آدم خور کے پنجوں کے نشانات موجود تھے۔ وہ آیا تھا اور ناکام لوٹ گیا تھا...... نشانات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ ہی دیر پہلے آیا تھا اور پہاڑیوں کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ جب میں بستی میں پہنچا لوگوں نے مجھے بتلایا کہ رات بھر آدم خور بستی میں داخل ہونے کی کوشش کرتا رہا۔

میں نے چائے پی اور ان لوگوں کے ہمراہ دریا کی طرف روانہ ہو گیا جو جتھے کی شکل میں پانی لانے دریا پر جا رہے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ واپسی میں آگے آگے عورتیں تھیں اور پیچھے پیچھے مرد......

راستہ صاف تھا۔ میں مردوں کے ساتھ تھا جب یہ قافلہ مندر کے پاس پہنچا تو یکایک عورتوں کے ہاتھوں سے مٹکے چھوٹ گئے۔ اور وہ چیختی ہوئی پلٹیں اور مردوں کی طرف دوڑیں اور پھر مردوں کے ہاتھوں سے بھی مٹکے چھوٹ گئے اور دوسرے ہی لمحے مندر کی باڑھ سے آدم خور نمودار ہوا۔ خوفناک منہ کھولے ہوئے سینہ تانے ہوئے...... بھوک سے بے تاب۔

عورتیں اور مرد منہ اٹھائے دریا کی طرف بھاگے۔ دریا کی طرف نکل جانے کے بجائے اگر یہ لوگ دہشت میں مجھے گھیر لیتے تو میرے لئے بروقت کچھ کرنا دشوار ہو جاتا اور آدم خور کسی کو دبوچ لیتا...... میں نے رائفل کندھے سے اُتاری اور آدم خور پر ایک نظر ڈالی...... اس کا خوفناک منہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے خونخوار دانت چمک رہے تھے۔ آنکھوں سے جیسے خون ٹپک رہا تھا۔ مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر وہ اپنی پچھلی ٹانگوں پر جھکا ہوا مجھ پر جست لگانے ہی کو تھا...... میں نے اس کی پیشانی کا نشانہ باندھا اور گولی چلا دی...... اس نے چھلانگ لگائی گولی پیشانی پر لگنے کے بجائے اس کے منہ میں داخل ہو کر سر کے نچلے حصے کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی اپنی جست کے زور سے وہ ٹوٹے ہوئے مٹکوں کے ٹکڑوں پر آ پڑا...... غصے میں اس نے ان ٹکڑوں کو دُور دُور تک اُڑا دیا اور پچھلی ٹانگوں سے زور لگا کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا ایک بار تو وہ زمین پر منہ رگڑتے ہوئے اس قدر بھیانک انداز میں دھاڑا کہ عورتیں چیخ پڑیں جو تھوڑی دُور کھڑی دیکھ رہی تھیں۔ مرد تو میرے قریب آ گئے تھے...... میں نے دوسری گولی چلائی جو اس کے سر کو پاش پاش کرتی ہوئی مٹی میں دھنس گئی۔ مرد حلقہ بنا کر اور قریب ہو گئے عورتیں جو ابھی تک دُور تھیں تیزی سے قریب آ گئیں۔ میں نے ان کے چہروں کا جائزہ لیا۔ ان کے جذبات ان کے چہروں میں سمٹ آئے تھے۔ میں نے آدم خور پر ایک نظر ڈالی...... وہ زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ اس کا جسم جھٹکے کھا رہا تھا۔ پاؤں تھر تھرا رہے تھے منہ سے سرخ گاڑھا خون بہہ رہا تھا اور اس کے اردگرد ٹوٹے ہوئے مٹکوں کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔

ایس۔ امتیاز احمد

جادو نگاہ......

چوکیدار بیٹھ گیا اس کی نگاہ پیانسٹ پر جمی ہوئی تھی جو رومال میں ایک پنسل کو لپیٹ رہا تھا۔ ”اس رومال کو غور سے دیکھتے رہو۔“ مسمرو نے ہدایت کی۔ ”اب میری آنکھوں میں دیکھو۔“ بوڑھے پیانسٹ نے اپنی آنکھیں چوکیدار پر مرکوز کر دیں۔ ”تمہاری آنکھیں بھاری ہو رہی ہیں تم تھک رہے ہو... تمہیں نیند آ رہی ہے؟“

جب ایک بوڑھے شخص کی روشن آنکھوں نے خوف کی کہانی بیان کی......



پیانسٹ نے معمول لڑکی کے پیروں کے نیچے سے کرسی ہٹائی تو گہری خاموشی طاری ہوگئی۔ اب اس لڑکی کا جسم صرف ایک کرسی کے سہارے ٹکا ہوا تھا اور اس کی گردن دوسری کرسی پر رکھی تھی۔ کچھ دیر اسی طرح گزر گئی پھر ماہر عمل تو مسمر نے بلند آواز میں کہا۔ ”بیدار ہو جاؤ تمہیں آزاد کرتا ہوں۔“ [illegible] پیروں کو سہارا دیا تو وہ

تیج پر کھڑی ہو گئی۔ تنویمی نیند ختم ہو چکی تھی۔ پیانسٹ اسے سہارا دے کر [illegible] سے نیچے آڈیٹوریم کی طرف لا رہا تھا۔ [illegible] تالیوں سے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔

[illegible] اس وقت [illegible] سیٹ پر بیٹھا [illegible] دیکھ رہا تھا [illegible] آتی ہے۔ [illegible]

کہا۔ "میرا خیال ہے مجھے یہاں سے جانا چاہیے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ٹہلتا ہوا آڈیٹوریم میں آگے بڑھ کر اسٹیج کے دروازے میں داخل ہوا۔

ابھی وہ دروازے پر دستک دیے بغیر وہ داخل ہوا۔ "ہیلو" اس نے کہا۔ "کیا میں تم سے چند بات کر سکتا ہوں۔"

مسٹرو اس وقت اس لڑکی کے ساتھ تھا۔ ہم تنویم کی ترتیب تھی۔ کے کس کو لکھا ہوا ہے۔" "تم کیا چاہتے ہو؟" کیلی نے اندازہ لگایا کہ وہ بڑی کن ہے۔

اس نے سر ہلایا۔ "میں تمہارا کھیل دیکھتا رہا ہوں اور بہت متاثر ہوا ہوں۔" وہ لڑکی کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔" یہ سن کر لڑکی چونک پڑی اور اسے گھور کر دیکھنے لگی۔ ماہر عمل تنویم کے بارے میں یہ رائے سن کر اس کی بھنویں نفرت انگیز انداز سے بگڑ گئی تھیں۔ اس نے جلدی سے ایک پردہ اٹھایا اور اپنی نیم برہنہ ٹانگوں پر ڈال لیا۔

"جھوٹ ہے؟" مسٹرو اس کی طرف گھوم کر بولا۔ دونوں کی نگاہ چار ہوئی تو کیلی اس کی آنکھوں کی سحر انگیز چمک اور قوت کو محسوس کر کے بے چین ہو گیا۔ "اوہ! تو تمہارے خیال میں میرا فن جھوٹا ہے اور میں فراڈ ہوں؟ گویا تم میرے پیشے کی توہین کر رہے ہو میں یہ بات کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔"

"میں اس سے پہلے دو بار تمہارا کھیل دیکھ چکا ہوں۔" کیلی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ایک لمحے کے لئے اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پاؤں زمین سے اٹھ گئے ہوں اور وہ فضا میں تیر رہا ہے۔ اس نے سر ہلا کر اس کیفیت سے نکلنے کی کوشش کی اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں دیکھ رہا ہوں کہ ہمیشہ یہی لڑکی خود رضاکارانہ طور پر تنویمی عمل کے لئے پیش کرتی ہے۔" اس نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا جو نفرت سے ہونٹ سکوڑے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں شعلہ بار تھیں چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کیلی کے منہ کو ناخنوں سے نوچنے کے لئے بے تاب ہے۔

"دراصل کچھ لوگ اچھے معمول ثابت نہیں ہوتے اس لئے میں بھی خطرہ مول لینے کی کوشش نہیں کرتا۔" مسٹرو خفیف مسکراہٹ کے بعد بولا۔ "لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں ایک بہت اچھا ہپناٹسٹ ہوں۔"

کیلی نے مذاق اڑانے والے انداز میں قہقہہ لگایا۔ "تم مجھے کچھ زیادہ متاثر نہیں کر سکے۔"

"کیا واقعی؟" مسٹرو نے اسے کاغذ کا ایک ٹکڑا دیتے ہوئے کہا۔ "براہ کرم یہ خود ہی پڑھ لو کہ تم نے کیا لکھا تھا۔"

اس کاغذ کے پرزے پر جو کچھ لکھا تھا اسے دیکھ کر کیلی حیرت زدہ رہ گیا۔ خود اس کی اپنی تحریر میں لکھا تھا۔ "میں آرتھر کیلی اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ مسٹر مسٹرو ایک عظیم ہپناٹسٹ ہیں۔" وہ کبھی اس تحریر کو دیکھتا اور کبھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے مسٹرو کو گھورنے لگتا تھا۔ اس نے حیرت زدہ لہجے میں کہا "میں نے یہ سب کس وقت لکھا تھا؟"

"غالباً دو یا تین منٹ پہلے کی بات ہے۔ تم نے میرے زیر اثر یہ بات لکھی تھی۔"

کیلی کے جبڑے بھینچ گئے۔ "تمہارا مطلب ہے تم نے مجھے ہپناٹائز کر دیا تھا؟"

لڑکی اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہو کر ہنس پڑی۔ اس نے شراب کا جام ہونٹوں سے لگایا اور بمشکل اپنی بے ساختہ ہنسی پر قابو پانے لگی۔

مسرو بھی کیلی کی بوکھلاہٹ سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کیا اب تمہیں میری ذات پر اعتبار آ گیا ہے؟''

کیلی کے ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سکڑ گئے۔ ''آخر تم اس قوت کو استعمال کر کے اپنی قسمت کیوں نہیں سنوار لیتے؟''

''افسوس میوزک ہال ختم ہو چکا ہے۔'' مسرو بڑبڑایا۔ ''اور میرا چہرہ اس قابل نہیں ہے کہ مجھے ٹی وی پر دکھایا جا سکے۔''

''تمہاری عمر اس وقت ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔'' کیلی نے اندازہ لگایا۔ ''میں شرط لگا سکتا ہوں کہ تمہارے پاس اتنی دولت نہیں ہے کہ تم ریٹائرڈ زندگی اطمینان سے بسر کر سکو۔''

پیناسٹ نے بے پروائی کا اظہار کرنے کے لئے کندھے جھٹک دیئے۔

''اگر تم میرے لئے تھوڑا سا کام کرو تو میں تمہارے لئے کچھ رقم فراہم کر سکتا ہوں جس سے تمہارے بڑھاپے کا تحفظ ہو جائے گا۔'' کیلی نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ ''اگر تم مجھے کچھ دیر کے لئے مسرو کے ساتھ تنہا چھوڑ دو تو میں تمہارا مشکور رہوں گا۔''

کیلی کی بات سن کر لڑکی نے پیناسٹ کی طرف دیکھا جس نے سر کی جنبش سے اشارہ کیا کہ وہ باہر چلی جائے۔ لڑکی نے جلدی جلدی جام ختم کیا اور دروازے سے باہر نکل گئی۔ لڑکی کے جاتے ہی کیلی نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ''کیا تم جو کچھ یہاں سے کمارہے ہو اس سے مطمئن ہو؟''

پیناسٹ کیلی کو کڑے تیوروں سے گھورنے لگا۔ ''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

کیلی نے اپنی ناک کو کھجایا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ [illegible] کے لئے دیا

گیا اجازت نامہ چھ ماہ قبل ختم ہو چکا ہے۔؟'' مسرو نے جواب نہیں دیا البتہ اس کی آنکھیں غصے کا اظہار کر رہی تھیں۔ کیلی اس کی حالت پر فراخ دلی سے مسکرانے لگا۔ ''میں نے ایک کام کا بہترین منصوبہ بنایا ہے۔ لیکن مجھے ایک ٹھوس شہادت کی ضرورت ہے جو یہ ثابت کر سکے کہ میں واردات کے وقت وہاں موجود نہیں تھا۔'' وہ بڑے اعتماد سے آگے کی طرف جھکا۔ سترہویں اسٹریٹ کے بازار کا ایک بوڑھا چوکیدار میرا واقف ہے۔ وہ رات کے وقت ڈیوٹی دیتا ہے۔ شام کے وقت یا رات میں کبھی کبھی میں چائے کے لئے اس کے پاس بیٹھ جاتا ہوں۔ پولیس اس کی شہادت کو فوراً تسلیم کر لے گی۔''

''اوہ تو یہ بات ہے۔'' مسرو نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تم یہ چاہتے ہو کہ میں اپنی قوت سے اس شخص کو مجبور کر دوں کہ وہ تمہاری پسندیدہ شہادت دے سکے؟''

''ہاں۔ تم ٹھیک سمجھے۔'' کیلی نے تائید کی۔ ''میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھے ایک مخصوص وقت پر اپنے سامنے دیکھے اس کے بعد میں اس کے سامنے سے ہٹ جاؤں تو بھی اسے یہی یاد رہے کہ میں اس کے پاس ہی موجود رہا ہوں۔ یہ بات صرف اسی طرح ممکن ہے کہ تم اسے ٹرانس میں لا کر حکم دو کہ وہ نقب زنی کے سلسلے میں میری عدم موجودگی کو یاد نہ رکھے۔ کیا تم آمادہ ہو؟''

پیناسٹ چند ثانیوں تک کیلی کو گھورتا رہا پھر اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں یہ بات میرے پیشے کے اعتبار کو ختم کرتی ہے۔''

''دو سو پچاس پونڈ معاوضہ ملے گا۔'' کیلی نے نرمی سے کہا۔ مسرو ہچکچایا۔

''پانچ سو پونڈ ایک بڑی رقم ہے۔'' کیلی نے اصرار کیا۔

''ٹھیک ہے، میں آمادہ ہوں۔'' بالآخر ہپناٹسٹ رضامند ہوگیا۔ ''لیکن میری ایک شرط ہے۔ میں اس وقت مقام واردات کے قریب نہیں رہنا چاہتا۔ جب تم اپنے کام میں مصروف ہوگے۔''

''لیکن میں رات کے اس چوکیدار کو دوبارہ ہوش میں کس طرح لاؤں گا؟'' کیلی نے احتجاج کیا۔

''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

مسرو نے آئینے کی طرف رُخ کرتے ہوئے کہا۔ ''اب تم براہِ کرم یہاں سے چلے جاؤ۔ آج رات مجھے ایک شو اور بھی کرنا ہے اور اس کا وقت ہونے ہی والا ہے۔''

کیلی نے اثبات میں سر ہلایا اور مطمئن انداز میں چلتا ہوا دروازے سے نکل گیا۔

رات کا چوکیدار اس وقت چائے کی کیتلی پر ڈھکنا رکھ رہا تھا کہ اسے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کمرے کے باہر کوئی چل رہا تھا۔

''ہیلو پاپ۔'' کیلی نے خوش دلی سے اسے پکارا۔ اس نے دونوں ہاتھ رگڑے اور مسکرا کر کہا۔ ''اس وقت تو چائے کی بہت طلب ہورہی ہے۔''

''بیٹھو زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ پانی اُبلنے ہی والا ہے۔'' بوڑھے چوکیدار نے کہا۔ ''تمہارے ساتھ چائے پی کر مجھے خوشی ہوگی۔''

''میرے ساتھ ایک دوست بھی ہے۔'' کیلی نے جلدی سے کہا۔ ''میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ یہاں اسے بھی ایک پیالی چائے ضرور ملے گی۔ کیا تم محسوس تو نہیں کررہے ہو؟''

''دراصل...... یہ کمپنی کے قانون کے خلاف ہے۔'' چوکیدار نے کیلی کے کندھے کے اوپر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں سے شبہے کے آثار نمایاں تھے۔ ''لیکن خیر اب چونکہ یہ آچکا ہے اس لئے اندر بلالو۔''

''بہت بہت شکریہ پاپ۔'' کیلی نے کہا اور مسرو کو آواز دی جب وہ اندر آیا تو کیلی نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''یہ جادوگر ہے۔ تم نے میوزک ہال میں اس کے شعبدے ضرور دیکھے ہوں گے۔ آج کل شہر میں اس کی دھوم مچی ہوئی ہے۔''

''جادوگر...... کیا تم جادوگر ہو؟'' بوڑھے چوکیدار نے کیتلی میں پانی ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ گہری نگاہ سے مسرو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''میں شعبدہ بازی کو بہت پسند کرتا ہوں۔ کیا خیال ہے اس وقت دو ایک شعبدے تو دکھا ہی دو۔''

''اگر تمہیں پسند ہیں تو ایسا ہی سہی۔'' مسرو نے کہا۔ ''براہِ کرم بیٹھ جاؤ۔''

چوکیدار بیٹھ گیا اس کی نگاہ ہپناٹسٹ پر جمی ہوئی تھی جو رومال میں ایک پنسل کو لپیٹ رہا تھا۔ ''اس رومال کو غور سے دیکھتے رہو۔'' مسرو نے ہدایت کی اور پنسل کو اوپر اٹھایا۔ اب پنسل چوکیدار کی آنکھوں کے بالکل سامنے تھی۔ ''اب میری آنکھوں میں دیکھو۔'' بوڑھے ہپناٹسٹ نے اپنی آنکھیں چوکیدار پر مرکوز کردیں۔ ''تمہاری آنکھیں بھاری ہورہی ہیں تم تھک رہے ہو...... تمہیں نیند آرہی ہے؟''

بوڑھے چوکیدار نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں میں خود کو تھکا تھکا سا محسوس کررہا ہوں۔'' اس نے تائید کی۔ ''رات کے وقت میں عموماً تھک جاتا ہوں۔''

''تمہاری پلکیں بھاری ہورہی ہیں۔ تم اس بھاری پن سے بچنے کے لئے مدافعت نہیں کرسکتے۔'' مسرو نے سخت اور تحکمانہ آواز میں

کہا۔ ’’اپنی آنکھیں بند کرلو۔ آرام کرو۔ تم سو رہے ہو..... سو جاؤ..... سو جاؤ۔‘‘

چوکیدار کا سر اس کے کندھے پر ڈھلک گیا اور مسمرو نے اس آنکھوں پر تھوڑا سا دباؤ ڈالا۔

’’بہت خوب یہ تو ایک بہت ہی اچھا اور آسان معمول ہے۔‘‘

’’کیا یہ تمہارے کنٹرول میں ہے؟‘‘ کیلی نے دریافت کیا۔

مسمرو نے اثبات میں سر ہلایا۔ ’’کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟‘‘ اس نے چوکیدار سے کہا۔ بوڑھے چوکیدار نے آہستہ سے سر ہلا کر اقرار کیا۔

’’غور سے سنو۔‘‘ مسمرو کا لہجہ تحکمانہ ہو گیا۔ ’’تم یہ بھول جاؤ گے کہ تم نے مجھے دیکھا تھا۔ جب تم جاگو گے تو صرف یہ یاد رہے گا کہ تم اپنے دوست کیلی سے باتیں کر رہے تھے۔ تم یہ یاد رکھو گے کہ وہ تمہارے ساتھ آدھے گھنٹے سے ہے۔ کیا تم سمجھ رہے ہو؟‘‘

’’ہاں میں سمجھ گیا ہوں۔‘‘ چوکیدار نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

’’بہت خوب۔‘‘ مسمرو کیلی کی طرف متوجہ ہوا۔ ’’میں چاہتا ہوں کہ تم باہر جا کر کچھ دیر میرا انتظار کرو۔‘‘

’’کیوں؟ کیا تم کیا کرنا چاہتے ہو؟‘‘ کیلی نے مشکوک انداز میں کہا۔

’’میں اب اس بوڑھے کو وہ لفظ بتانے جا رہا ہوں جسے سن کر اس کی یہ حالت ختم ہو جائے گی۔‘‘ مسمرو نے جواب دیا۔ ’’اور کسی غلط فہمی سے بچنے کے لئے میں صاف گوئی سے کہتا ہوں کہ میں وہ لفظ تمہیں اس وقت بتاؤں گا جب تم میری رقم ادا کر دو گے۔‘‘

’’چھوڑو ان باتوں کو۔‘‘ کیلی نے احتجاج کیا۔ ’’تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔‘‘

’’شاید۔‘‘ مسمرو نے کہا۔ ’’اگر تم باہر نہیں جاؤ گے تو میں اسے بیدار کر دوں گا‘‘۔

کیلی کا منہ بن گیا اور وہ مجبوراً باہر نکل گیا۔

کیلی چوکیدار کے کمرے کے دروازے کے قریب کھڑا رہا لیکن وہ ہپناٹسٹ کی آواز اچھی طرح نہیں سن سکتا تھا اسے وہاں کھڑے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ مسمرو آ گیا۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا اور کہا۔ ’’نو بجنے میں پانچ منٹ ہیں میں تمہیں ساڑھے نو بجے ریڈ لائن شراب خانے میں ملوں گا۔ مجھے رقم دے کر تم وہ لفظ معلوم کر سکتے ہو جس سے یہ بوڑھا چوکیدار ہوش میں آ سکتا ہے۔‘‘

بوڑھا چوکیدار تن کر بیٹھا تھا مگر وہ بے حس و حرکت تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے چینی تھی وہ سامنے کسی غیر مرئی نقطے کو گھور رہا تھا۔ پٹرول کار کے پولیس مین نے اس کی نبض ٹٹولی۔ ’’یہ زندہ تو ہے۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’کیا بات ہے؟ کہیں یہ سکتے کے عالم میں تو نہیں؟‘‘

سراغ رساں نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’یہ مجھے گہری نیند کا شکار معلوم ہوتا ہے۔‘‘

پٹرول مین نے ٹوپی اتاری اور سر کھجانے لگا۔ ’’کیا خیال ہے ایمبولینس طلب کریں۔‘‘

’’میں حیران ہوں کہ یہ کب سے اس حالت میں مبتلا ہے۔‘‘ سراغ رساں نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ ’’یہ غالباً چائے بنا رہا تھا۔ اس چائے کی کیتلی کو دیکھو۔‘‘ اس نے کھولتی ہوئی کیتلی کا ڈھکنا اٹھایا۔

’’ارے یہ تو ہوش میں آ رہا ہے۔‘‘ پٹرول مین

سے کہا۔ چوکیدار نے آنکھیں کھولیں [illegible]
[illegible] کی وجہ سے اکثر میں چونکتا ہوں [illegible]
تب اس کی نگاہ پولیس والوں پر پڑی [illegible]
[illegible] اور [illegible] کیا ہوا ہے؟
کیں؟" [illegible] کیا معاملہ
[illegible] آرتھر کیا ہے [illegible]
"یقیناً" [illegible]
فوراً ہی چوکیدار [illegible]
بات کیا ہے؟ تم لوگ یہاں کیوں [illegible]
[illegible] اگر [illegible]
[illegible] کانسٹیبل [illegible]
[illegible] نقل کیا۔

میں نے دریافت کرنا چاہا [illegible]
ہے؟" چوکیدار نے [illegible] کے
تاثر کے ساتھ کہا۔ [illegible] ابھی تک [illegible]
بھی [illegible]

[illegible] بعد کانسٹیبل [illegible]
کے ساتھ تھا۔ [illegible] تلاش کر رہا تھا۔ کانسٹیبل
نے کہا۔ یہ مجھے [illegible] کے شراب خانے سے
باہر نکلتا ہوا نظر آیا تھا۔

سراغ رساں مسکرانے لگا۔ "بہت خوب، کیا تم
نے اب یہ دھندہ دوبارہ شروع کر دیا ہے؟"

کیلی نے سوگواری سے اپنے سر کو انکار میں
حرکت دی۔ "یہ اس کی جیب سے نکلی ہے۔"
کانسٹیبل بولا۔ اس نے کیلی سے مخاطب ہو کر
کہا۔ "کیوں آرتھر...... کیا کہانی ہے؟"

کیلی خاموش رہا۔

"جلدی بتاؤ۔" سراغ رساں غرایا۔ "ہمیں
رپورٹ تیار کرنی ہے۔" ...... کیلی نے کندھے
اچکائے۔ "خیر...... میں نے بیریز جوہری کے ہاں
تب اگلا تھا۔"

[illegible] کیا معاملہ [illegible] یہ بیداری
[illegible] بعض شہادت
[illegible] لیکن تم لوگ [illegible]
[illegible] پہنچ گئے؟"

[illegible]
[illegible] روپ
[illegible] چوکیدار کی طرف دیکھا۔ چوکیدار
[illegible] ہوتی ہے کہ وہ [illegible] بعد الارم کے
[illegible] سے منسلک گھڑی کو چابی دے۔ یہ الارم
پولیس اسٹیشن سے منسلک ہے۔ الارم ٹھیک نو بجے
خاموش ہو گیا تھا۔"

کیلی نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "ممکن ہے یہ
درست ہو لیکن تم اسے ہوش میں کیسے لائے ہو۔"
"یہ بات تو ہمیں خود بھی معلوم نہیں۔ البتہ میں
اس وقت چائے اور کیتلی کے بارے میں بات کر رہا
تھا غالباً یہ نی پاٹ کا لفظ سن کر ہوش میں آیا تھا۔"

"نیل ہپناٹسٹ۔" کیلی کراہنے لگا۔ اس
نے مجھے بتایا تھا کہ چوکیدار ٹی پاٹ نامی ایک
جرمن قصبے کا نام سن کر ہوش میں آئے گا۔
سراغ رساں مسکرانے لگا۔ "وہ واقعی ایک
ہوشیار آدمی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں آنے والا
پولیس مین ٹی پاٹ کا لفظ ہر حال میں استعمال
کرے گا۔ کیونکہ کیتلی چولہے پر کھول رہی تھی اور
بھاپ سے کمرے میں شور ہو رہا تھا۔"

کیلی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔
وہ سوچ رہا تھا کہ ہپناٹسٹ نے اس سے اپنے
پیشے کے خلاف توہین آمیز باتوں کا بھیانک
انتقام لیا ہے۔

حضرت حسین ابن منصور

[illegible]
داستان حیات



[illegible]

کیونکہ تُو اور میں ایک ہی تو ہیں۔ ہر حال، میں ایک رہنے والے۔

رات کے بیکراں اُداس سناٹے میں جب درد سے بھری پرسوز آواز فضا میں گونجی تو ان اشعار میں چھپے فساد، فتنوں سے گہری نیند میں ڈوبی آنکھیں اس آہ وزاری سے کھل گئیں۔

کانوں نے سنا، ذہن نے یقین نہ کیا اور دل غم وغصہ سے بے قابو ہوگیا۔ سننے والے آہستہ آہستہ آواز کے اور نزدیک تر ہوتے گئے۔ جستجو میں تحقیق کے لئے، لیکن یُوں یُوں یہ اشعار پڑھنے والا وجد میں آتا گیا اس کے الفاظ بیباکی و نڈرپن کی ہر حد کو توڑ کر جرأت مندی کا وہ مظاہرہ کرنے لگے کہ دنیا والے طیش میں آ گئے۔ انہوں نے بھلا کب کہاں یہ قدر بیباکی دیکھی تھی۔ یہ حق گوئی بھلا اس سے ان کے کان کب آشنا تھے۔

چھپ کر سننے والے جب بالکل ہی نہ جان سکے کہ کہنے والا یہ کیا کہہ رہا ہے؟ کس کیفیت میں کہہ رہا ہے؟ وہ طیش میں بول اُٹھے۔

"یہ بدبخت تو کفر بول رہا ہے، اس کے ذہن پر یقیناً ابلیس سوار ہے یہ کافر بن گیا ہے۔" دوسرا فوراً اس کی مخالفت میں بولتا ہے "یوں بلا سوچے سمجھے کسی کو کافر بنانا کہاں کا انصاف ہے؟" تیسرا بولتا ہے "بالکل ...... پھر یہ تو مقام کی اس کیفیت میں ہے۔ جہاں دوئی کا جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔ ایسے میں بھلا ہم جیسے جو اس منصب کے کسی صورت لائق نہیں کہ کسی کو کافر قرار دے سکیں، کیوں اسے کافر بناتے ہیں۔"

ایک اور بڑھ کر کہتا ہے۔ "ہاں یہ فقہا کا مسئلہ ہے کہ اسے کیا قرار دیتے ہیں۔"

بحث طول پکڑتی گئی۔ لوگوں کی جماعت دو گروہوں میں بٹ گئی ایک حمایت میں اور ایک مخالفت میں، ہر دو کا انجام ...... ہم خیالی کوسوں دور، لیکن وہ بیباک، نڈر انسان سب سے بے نیاز ابھی بھی دھن میں اشعار پڑھتا جا رہا تھا۔

یہ جرأت مندانہ اظہار خیال کرنے والی بے باک، حق گو ذات تھی جسے دنیا آج انا الحق حسین بن منصور کے نام سے یاد کرتی ہے۔ 224ہجری میں پیدا ہونے والا یہ نڈر و بے باک صوفی اپنے افکار و کردار میں کس قدر کھرا، سچا، صاف گو تھا کہ اس کی تندی اور تیزی دیکھ کر بڑے بڑے عصر خوف زدہ ہوگئے۔ وہ ہم عصر صوفی درویش جو اس سے متفق تھے اس کے ہم عقیدہ تھے اس کی اس کیفیت سے واقف تھے اس کی سچائی کے معترف تھے۔ مگر انجام سے خوفزدہ تھے۔ مصائب و تکالیف کے دور کو دیکھ رہے تھے جو لحظہ بہ لحظہ اس حق پرست کے نزدیک سے نزدیک تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اس سزا سے اپنا دامن بچانا چاہتے تھے جو اس حق گو کا مقدر بن چکی تھی۔ وہ اس سے ہم خیالی اور ہم مشربی سے برات کا اظہار کرنے میں ہی عافیت محسوس کرتے تھے۔

حسین ابن منصور ایرانی شہر بیضا میں پیدا ہوئے اور نو عمری میں عراقی شہر واسط آ بسے۔ واسط والوں کے نزدیک وہ ایک عجیب و غریب نوجوان تھا۔ ہم عمروں سے بالکل علیحدہ جدا، نوجوانی کے تقاضوں سے دامن بچائے خاموش طبع، چپ چاپ سا رہنے والا، نظریں جھکا کر راستے سے گزر جانا اس حال میں کہ دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر، انجان، نجانے کس فکر میں غلطاں و پیچاں، اپنی ذات میں گم رہنے والا اسے کھویا کھویا سا دیکھ کر احساس ہوتا کہ جیسے کسی شے کی جستجو ہی اسے ادھر ادھر لئے پھرتی ہے۔ اس کے چہرے پر پھیلی بے چینی و بیقراری، اس کے چال کے اضطراب سے ہم آہنگ ہوتی، لوگ اسے خاموشی سے دیکھتے۔ دلچسپی محسوس کرتے، نزدیک ہونے کی

کوشش کرتے اس کے بارے میں جاننے کی جستجو میں رہتے لیکن وہ سب سے الگ تھلگ اپنے آپ میں مگن رہنے والا دور دور رہتا لوگ اس کی اس کیفیت پر ہنستے' افسوس کرتے مگر وہ ان سب کے رد عمل سے بے نیاز لوگوں کی ہنسی یا افسوس سے بے اثر اپنے حال میں مست رہتا۔ تنگ آ کر لوگ کبھی کبھی پھبتی کسنے سے باز نہ آتے لیکن مجال ہے جو اس شخص کے چہرے پر یا اس کے حال میں کوئی تغیر رونما ہو وہ ان سب باتوں سے بے نیاز تھا۔ لاتعلق رہنا چاہتا تھا چنانچہ لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ وہ نوعمر نوجوان ان کی کسی بات کا اثر قبول ہی نہیں کرتا نہ ان کے طیش دلانے والے طرز عمل پر غصہ کا اظہار کرتا ہے نہ ان کی طرف سے باتیں کرنے کی پیش رفت کا حوصلہ افزاء جواب دیتا ہے تو انہوں نے بھی آہستہ آہستہ اسے تنگ کرنا' پریشان کرنا چھوڑ دیا مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ لوگ اس کی ذات سے مکمل طور پر ہی غافل ہو گئے تھے۔ بلکہ اب بھی جب وہ ان کے سامنے سے گزرتا وہ اپنی پرانی دلچسپی کا اظہار کرتے حیرت کرتے کہ آخر اس نوجوان کو انسانوں کے کس درجے میں لائیں۔

یہ شہر کے وسط میں آباد' بازار کی ایک روئی کی دکان ہے جس کا مالک دکان کے دروازے کے سامنے بے قراری سے چکر لگا رہا ہے۔ اس کی اس اضطرابی کیفیت سے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ کہیں جانا چاہ رہا ہے مگر پھر خود کو آمادہ نہیں کر پا رہا۔ اچانک اس دکاندار کی بے چین نظریں شہر کے واحد اپنی ذات میں گم رہنے والے نوجوان پر پڑی۔ وہ فوراً اس کی طرف لپکا اور بازو سے پکڑ کر بولا "حسین..... مجھے تم سے فوری کام ہے ذرا میری دکان تک تو آنا۔" نوجوان خاموشی سے دکاندار کے ساتھ اس کی دکان پر پہنچتا ہے۔ دکان کے دروازے پر پہنچ کر وہ شخص عاجزی سے کہتا ہے "حسین..... مجھے ایک بہت ضروری کام ہے بازار جانا ہے لیکن دکان کو اکیلا چھوڑ کر جاتے خوف محسوس ہوتا ہے کیونکہ اس میں لوگوں کا مال بھرا ہے۔ اگر کوئی روئی اٹھا کر لے جائے میں تو ڈوب گیا نا..... تو اے شریف النفس نوجوان تو مجھ پر اتنا احسان کر دے کہ جب تک میں دکان پر نہ آؤں تو میری دکان کی رکھوالی کرتا رہ۔ یہ سن کر اس نوجوان حسین ابن منصور نے اپنی فطری بے نیازی سے سر جھکا کر کہا "کیوں نہیں..... تم اطمینان سے اپنے کام کو جا سکتے ہو مطمئن ہو کر جاؤ میں تب تک تمہاری دکان کی رکھوالی کرتا رہوں گا۔"

یہ سن کر دکاندار کے چہرے پر اطمینان کی کیفیت چھا گئی۔ وہ خوشی سے بولا "حسین خدا تیرا بھلا کرے تو نے اس وقت مجھے بڑی مشکل سے بچا لیا ہے۔" پھر جاتے جاتے کہتا گیا۔ میں بھی کیا کروں..... ایک تو گاہکوں کی طرف سے پریشانی جو روئی دھنکی ہوئی لینے آ پہنچیں گے اور روئی کو پرانی حالت میں دیکھ کر میرے سر پر سوار ہوں گے۔ اوپر سے یہ کام یہاں نہیں پہنچوں گا تو اپنا نقصان کرا لوں گا۔" پھر زیر لب بڑبڑاتا ہوا دکان سے باہر نکل گیا۔ کوئی بات نہیں گاہکوں کو سمجھا دوں گا کہ شام کسی وقت اپنا سودا لے لیں گے۔"

دکاندار کو گئے تھوڑی دیر گزری تھی کہ اچانک وہ اپنا کام مکمل کر کے آتا دکھائی دیا' لیکن دکان میں داخل ہوتے ہی ٹھٹھک کر وہیں دروازے میں ہی کھڑا رہ گیا۔ حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں' سامنے وہ عجیب و غریب نوجوان کھڑا روئی کے ساتھ انہوتا سا سلوک کر رہا تھا۔ وہ اپنی پُراثر آواز میں روئی سے کہتا جا رہا تھا روئی الگ ہو جائے..... بنولے علیحدہ ہو جائیں اور اس کی آواز

میں نجانے کیا تاثیر تھی کیا اثر تھا کہ نگاہوں کے سامنے وہ انہونا سا مسحور انگیز و دلکش منظر تھا کہ روئی اور بنولے علیحدہ علیحدہ ہو کر الگ الگ جگہ ڈھیر ہوتے جا رہے تھے۔ دکاندار انگشت بدنداں ہو کر حسین کے معصومانہ چہرے پر نگاہ ڈالتا پھر روئی کے اس ڈھیر پر نظر ڈالتا جہاں سے روئی اور بنولے علیحدہ ہو کر ڈھیری کی صورت میں ایک دوسرے کی مخالف سمت ڈھیر ہوتے جا رہے تھے۔ دکاندار نے یہ منظر دیکھا تو تاب نہ لا سکا پھر بڑھ کر حسین ابن منصورؒ کے قریب آ گیا اور اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر حیرت و خوف سے بولا "حسین یہ کیا کر رہا ہے یہ سب کیسے ہو رہا ہے۔"

ہاتھ کے لمس سے حسین پیچھے مڑا اور دکاندار کو دیکھ کر کہا۔ "جناب آپ جاتے جاتے کہہ گئے تھے کہ مجھے روئی دھنکنے کا موقع نہیں ملا اب گاہک مجھے آ کر تنگ کریں گے تو میں نے سوچا کہ آپ کو اس پریشانی سے بچا لوں اور پھر یہ کونسا اتنا مشکل اور مشقت طلب کام تھا جو میں نہ کر سکتا تھا۔"

یہ سن کر دکاندار حیرت و خوف کے ملے جلے تاثرات سے بولا۔ "حسین...... لیکن یہ تو جادو تھا خدا کی قسم ایک دم جادو کی مانند، کیا تم یہ جادو وادو جانتے ہو؟"

لفظ جادو سن کر اس نوجوان کے چہرے پر کرب کے آثار پیدا ہوئے پھر وہ درد بھرے لہجے میں بولا۔ "حضرت یہ جادو نہیں تھا۔ اسے جادو نہیں کہتے۔ میں تو اسی کوشش میں ہی سرگرداں ہوں کہ جس طرح روئی کے اس ڈھیر سے روئی اور بنولے علیحدگی اختیار کرتے جا رہے ہیں اسی طرح میں بھی اپنی ذات سے روئی یک مشت علیحدہ کر کے نکال دوں، کاش مجھ سے یہ ہو سکتا، میں یہ کر سکتا۔"

نوجوان کی یہ باتیں اس دکاندار کے علم میں تو نہ پڑیں اور نہ ہی وہ انہیں صحیح طریقے سے سن سکا۔ ہاں البتہ اب اسے اس نوجوان سے ایک عقیدت سی ہو چلی تھی۔ اس نے اپنی سمجھ کے مطابق حسین ابن منصور کی عزت کی اور پھر ہنس کر بولا۔ "حسین اگر تم برا نہ محسوس کرو تو میں تم سے ایک گزارش کروں؟"

"گزارش..... کرو گزارش۔" نوجوان نے حسب معمول بے اثر آواز میں لاتعلقی سے پوچھا۔

دکاندار کی ہمت بندھی تو اس نے کسی قدر شوخ لہجے میں کہا۔ "حسین...... تم نے میری روئی دھنک کر میری جو پریشانی دور کی ایک تو میں اس کے لئے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں اور دوسری بات یہ کہ چونکہ تم نے میری روئی دھنکی ہے اس لئے اگر میں تم کو آج حسین ابن منصور حلاج کہوں تو تم برا تو محسوس نہیں کرو گے۔"

نوجوان نے اس کی پوری بات سنی اور پھر بے نیازی سے دکان سے باہر نکل کر اپنی راہ ہو گیا اور دکاندار نے مڑ کر دھنکی ہوئی روئی کو ایک مرتبہ پھر حیرت زدگی سے دیکھنا شروع کر دیا۔ پھر سر جھٹک کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا لیکن یہ بات اس قدر عجیب و حیرت انگیز تھی کہ راز نہ رہ سکی اور جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں اس کا چرچا ہو گیا۔ لوگ جو حسین کو پہلے ایک دیوانہ قرار دے کر اس پر اچٹتی سی نظر ڈالتے تھے وہ بھی اب اسے غور سے دیکھنے لگے۔ لوگوں کی اکثریت اب اس پر مزید گہری توجہ مرکوز کرنے لگی۔ وہ اس آس میں اسے دیکھتے کہ شاید کوئی اور کرامت دیکھنے کو ملے۔ نوجوان تو ان سب کے احساسات سے بے خبر تھا اور آگ میں جل رہا تھا۔ کرب و اذیت میں مبتلا حسین ابن منصورؒ تو دوئی مٹانے کی فکر میں تھا۔ ذات احدیت کے وجود میں گم ہو جانے کی کوشش میں تھا اور جب اس نے محسوس کیا کہ یہاں رہ کر وہ کچھ

حاصل نہیں کر پارہا تو اس کی بے چین نظریں کوئی دوسرا مقام تلاش کرنے لگیں۔ اس فکر اور کوشش میں سرگرداں اس بیقرار کی نظریں اہواز صوبے کے شہر تستر پر پڑیں۔ تستر جہاں ایک نہایت مشہور و معروف بزرگ صاحب عرفان ذات سہل بن عبداللہ کی رہائش تھی چنانچہ اس نے تستر کا رُخ کیا اور عبداللہ کی صحبت میں رہنا شروع کیا۔ ہر دم ان کے ساتھ رہتا اس سوچ میں کہ شاید دل میں بھڑکی آگ کو بجھا سکیں۔ اندر کی شوریدگی کو کم کرسکیں مگر یہاں بھی اس کی بیقرار طبیعت کو قرار نہ آسکا۔ جس کی جستجو میں وہ یہاں تک آیا تھا۔ وہ اب بھی اس سے بہت دور تھی منزل کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ شب و روز گزرتے رہے۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ دل میں پروان چڑھتی شوریدگی جوان ہوتی گئی۔

خانقاہ کے سہل بن عبداللہ نے بھی اس بے چین نوجوان پر گہری نظر رکھی۔ وہ اس کے حال سے واقف ہوئے تو اس خطرے کو بھی بھانپ گئے جو اس نوجوان کی ذات میں چھپا تھا۔ جس سے یہ نوجوان جل کر بھسم ہوسکتا تھا۔ انہیں اس نوجوان پر ترس آیا خلوت میں بلا کر کہنے لگے۔

”حسین ہم محسوس کرتے ہیں کہ جیسے تم یہاں خوش نہیں ہو۔ تم ہماری صحبت سے مطمئن نہیں ہو۔ نہ ہی تم ہماری صحبت سے فیض حاصل کرتے ہو۔ ہم تمہاری اس اندرونی جوش و جذبے کی کیفیت کو سمجھ نہیں سکے کہ تم کیا چاہتے ہو۔“

یہ سن کر وہ نوجوان بولا ”حضرت میں سمجھا نہیں کہ آپ میری کس کیفیت کی طرف اشارہ کررہے ہیں۔“

سہل بن عبداللہ بولے ”دیکھو...... ہمیشہ ایسی باتوں یعنی راز دار باتوں سے خود کو کہنے سے محفوظ رکھو جن کا دل میں القا تو بے شک ہوتا ہے لیکن ان کا کہنا جائز نہیں ہوتا۔ ان کے اظہار و انکشاف کی اجازت نہیں دی جاسکتی جو تم برسرعام لیتے پھر رہے ہو کیا تمہارا یہ طرز عمل مناسب ہے؟ کیا تمہیں ایسی باتیں زیب دیتی ہیں؟“

حسین نے پوچھا ”حضرت آپ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے کونسی باتیں؟ آخر وہ کونسے راز ہیں جو میں منکشف کرتا پھر رہا ہوں۔“

حضرت سہل بن عبداللہ اس کی طرف غور سے چند لمحے دیکھتے رہے۔ پھر سر جھکا کر ٹھہرے ٹھہرے انداز میں نرمی سے بولے ”حسین...... ہر وہ راز...... ہر وہ انکشاف جو اللہ اپنے رازداں بندوں پر منکشف کرتا ہے کیا تم اسے مناسب سمجھتے ہو کہ وہ راز عام لوگوں پر عیاں کردیا جائے۔ نہیں ہرگز نہیں...... حسین ابن منصور یہ ہرگز قابل تعریف فعل نہیں۔ یہ تو جذباتیت ہوگی۔ نری جذباتیت یہ تو ایک قسم کی کم ہمتی ہوگی مرشد مرید کو اپنا ہمراز بناتا ہے اور مرید مرشد کے رازوں کو ایک عالم پر عیاں کرتا پھر رہا ہے کیا تمہارا یہ طرز عمل کسی صورت بھی قابل قبول ہے؟“

یہ سن کر حسین ابن منصور کے چہرے پر تلخی پھیل گئی ان کی آواز پرجوش ہوگئی اور وہ جرأت مندانہ بے باک لہجے میں بولے ”حضرت یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ کا خیال ہے کہ مجھ سے اگر ایسا فعل سرزد ہوتا ہے تو کیا اس میں میرا کوئی دخل ہے؟ ہرگز نہیں...... یہ قطعی خام خیالی ہے میرا اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں نہ میرے ارادوں کا اس میں کوئی دخل ہے۔“

سہل بن عبداللہ بولے ”حسین...... اب مجھے نہیں معلوم کہ تم ذہنی طور پر کس چیز سے متاثر ہو۔ آیا تم کسی سلسلے کے ماتحت ہو یا تم کسی مسلک سے تعلق رکھتے ہو لیکن تمہاری باتوں سے یہ صاف دکھائی دیتا

ہے کہ تم جو کچھ کرتے پھر رہے ہو یا جو کچھ کہتے رہتے ہو وہ تمہیں جبر یہ ثابت کرتا ہے۔"

یہ سن کر حسین ابن منصور رکھائی اور تلخی سے بولے "حضرت...... مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ جو کچھ میرے دل پر گزرتی ہے وہ میں راز میں رکھوں۔ میں واردات قلبی کو چھپا نہیں سکتا' روحانی انکشاف کو دوسروں سے اوجھل نہیں رکھ سکتا اور میرا یہ فعل صد فی صد اس پروردگار عالم کی خواہش کے عین مطابق ہے جو مجھے ان رازوں میں ان انکشافات میں شریک کرتی ہے۔ وہ خود نہیں چاہتا کہ اس کا راز راز رہے [illegible] کے حکم کے مطابق اس کا جبر راز سب پر [illegible] پھرتا ہوں۔"

سہل بن عبداللہ نے حیرت و ناگواری سے اس نوجوان کے چہرے پر نظر ڈالی جو اپنی [illegible] سے [illegible] تھا۔ پھر بولے "حسین یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تمہیں کس طرح خدا کی رضا و منشا کا علم ہوا؟ تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ وہ پروردگار جس نے تمہیں اپنے رازوں کا امین بنایا ہے وہ تمہیں ان رازوں کو عام پھیلانے کی اجازت دیتا ہے۔"

حسین ابن منصور نے جواب دیا۔ "حضرت یہ بالکل سوچنے کی بات ہے۔ وہ خدا خود چاہتا ہے کہ اس کے راز و نیاز نہ رہیں اگر وہ یہ چاہتا کہ یہ راز دنیا میں عام نہ ہو تو وہ مجھے جہاں ان رازوں سے واقف کرتا ہے وہاں وہ مجھے اس کا بھی حوصلہ دیتا ہے کہ میں ان رازوں کو سینے میں دبائے رکھنے کا پابند رہتا۔ وہ تو عالم الغیب ہے۔ اسے ہر چیز کا علم ہے کہ کیا ہوتا ہے کس کے ہاتھوں ہوتا ہے اگر میں اس کے راز فاش کر رہا ہوں بقول آپ کے اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اس حد تک لاعلم ہے کہ مجھ پر اپنے رازوں کا انکشاف کرتے ہوئے بھول گیا یا اس کے علم میں ہی نہ آیا کہ میں جو کمزور و ناتواں اس کا تخلیق کردہ بندہ ہوں کس طرح ان رازوں کا بوجھ سہہ سکوں گا۔ انہیں ایک عالم پر فاش کردوں گا۔"

سہل بن عبداللہ نے جو یہ تیز طرار' گستاخ و بیباک انداز دیکھا تو گھبرا گئے۔ ان کا وجود اس گستاخ لہجے کو ہی سن کر کانپ گیا اور وہ تھرتھراتی آواز میں بولے "بس...... بس حسین ابن منصور اس سے پیشتر کہ تم اپنی زبان سے کفر کے مزید کلمات ادا کرو میں خود تمہارے سامنے سے ہٹ جاتا ہوں۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں جو تمہاری اس گستاخانہ گفتگو کو سہہ سکے۔ مجھ میں اتنی تاب ہرگز نہیں' خدا تم پر رحم فرمائے۔"

اس گفتگو کے بعد جہاں [illegible] سہل بن عبداللہ کو حسین ابن منصور سے [illegible] وہاں حسین ابن منصور بھی حضرت سہل بن عبداللہ سے مایوس ہو گئے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ یہاں [illegible] خود کو پہچان نہیں سکتے خود کو [illegible] کی گرداب سے نکال نہیں سکتے تو انہوں نے یہ ڈیرہ بھی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ سہل بن عبداللہ کی اس خانقاہ سے مایوس و نامراد ہو کر بصرے جا پہنچے۔

بصرہ ان دنوں عمر بن عثمان مکی کی قیام گاہ بنا ہوا تھا۔ عمر بن عثمان مکی وہ برگزیدہ شخصیت تھیں کہ اپنے عہد کے بزرگان دین کو شرف مریدی بخش کر ایک عالم میں شہرت اختیار کر چکی تھیں۔ چنانچہ جب حسین ابن منصور آپ کے حضور پہنچے تو انہیں دیکھتے ہی عمر بن عثمان چونک پڑے۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔ ہاں البتہ انہیں قریب بٹھا کر حاضری کا سبب ضرور پوچھا۔ حسین بولے "حضرت میں شرف مریدی کے لئے آپ کی خدمت میں پہنچا ہوں۔"

عثمان مکی نے توجہ سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "پہلے کہاں تھے؟ کس کی صحبت میں وقت گزارا ہے۔"

حسینؒ نے جواب دیا۔ ''اھواز کے شہر تستر سے آ رہا ہوں، حضرت سہل بن عبداللہ کی صحبت میں وقت گزارتا رہا ہوں۔''

حسینؒ سے پوچھا گیا ''پھر...... پھر کیوں ان کی صحبت چھوڑ کر یہاں آن پہنچے ہو۔ آخر ان میں کیا خامی تھی جو تم مطمئن نہیں ہو سکے اور ہماری خانقاہ میں حاضری دینے آئے ہو؟''

حسینؒ بولے ''حضرت ان کی سب سے بڑی خامی تو یہی تھی کہ وہ بہت مصلحت اندیش ہیں اور وہ اپنے اس خول میں اس حد تک بند ہیں کہ مجھ جیسا صاف گو ان کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ وہ خاموش طبع ہیں، سست رو ہیں اور میں تیز رو۔ ہم دونوں میں آگ اور پانی کی سی مثال ہے۔ زمین و آسمان کا فرق ہے پھر بھلا میں کس طرح ان کی صحبت میں رہ [illegible] ہم دونوں یکجا رہتے۔''

عثمان مکیؒ نے اس تیز طرار نوجوان کو دیکھ کر کہا۔ ''میاں کچھ بھی ہو تم تو ادھر بھی [illegible] نظر نہیں آتے۔ تمہارے وجود میں بھی بےقراری [illegible] تمہیں اس در سے بھی [illegible] جائے گی۔ تمہارے اندر جو آگ بھڑک رہی ہے ایک دن تمہیں وہ آگ بھسم کر ڈالے گی نہ خود ہی اپنی جلائی آگ میں جل مرو گے۔''

پھر ذرا توقف کے بعد پوچھا۔ ''اچھا حسین ابن منصورؒ ذرا ہمارے ایک سوال کا جواب تو دو لیکن سوچ سمجھ کر۔'' حسینؒ نے کہا ''پوچھئے سوال'' عمر بن عثمانؒ بولے ''حسین فرض کرو حاکم وقت یا امیر المومنین تمہیں اپنا ہم راز بناتے ہیں، تمہیں اعتماد میں لے کر چند راز تم پر کھول دیتے ہیں ساتھ ہی کہہ دیتے ہیں کہ حسین ہم نے تم پر اعتماد کیا۔ تم ان رازوں کو اپنی حد تک رکھنا اور ہمارے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچانا۔ ایسا نہ ہو کہ تم ہمارے ان رازوں کا ایک عالم میں ہر چرچا کرتے پھرو۔ اگر ایسا ہوا تو تمہیں اس کی کڑی سے کڑی سزا جو موت بھی ہو سکتی ہے دی جائے گی۔ تب اے حسین ابن منصور تم کیا کرو گے؟''

حسین نے بےباکی سے جرأت مندانہ لہجے میں کہا ''اس صورت میں، میں تو ان رازوں میں ہر ایک کو شریک کر ڈالوں گا۔''

عمر بن عثمانؒ نے حیرت سے اس نڈر نوجوان کو دیکھا پھر ناگواری سے بھرے غصہ آمیز لہجے میں پوچھا ''کیا مطلب؟ گویا تم ان رازوں کو اپنے سینے میں نہیں رکھ سکو گے؟''

حسینؒ نے [illegible] انداز میں مسکراتے ہوئے کہا ''حضرت مجھے حیرت ہوتی ہے کہ آپ جیسے بزرگ دانش مند بھی میری بات کی گہرائی [illegible] نہیں پہنچ سکے... مجھے آپ یہ بتائیں [illegible] وقت یا امیر المومنین مجھ پر عیاں کرتے ہیں [illegible] بند رکھنے والا ہے تو پہلی غلطی [illegible] غلطی کہا جا سکتا ہے تو وہ حاکم وقت یا امیر المومنین مجھے اس میں شریک [illegible] کرتے ہیں [illegible] خیال نہیں کرتے کہ جس راز کو وہ خود سینے میں نہ رکھ سکے تو دوسروں سے ایسا کیوں سوچتے ہیں کہ وہ ان رازوں کو سینے میں دبائے رکھیں گے۔ جہاں تک سزا کا سوال ہے تو حضرت میں تو ہر وقت سر شمشیر کے نیچے رہنے کو تیار ہوں لیکن اس صورت میں مجھے اس بات کا مکمل یقین ہوگا اور میرا اس پر ایمان ہوگا کہ جس پاداش میں حاکم وقت یا امیر المومنین مجھے قتل کر رہے ہیں اس جرم کا اعادہ خود وہ پہلے ہی کر چکے ہیں مجھ پر ان رازوں کو افشا کر کے۔ سو اس صورت میں میں بے گناہ ہی مارا جاؤں گا۔ میرا جرم وہی ہوگا جس کا ارتکاب خود حاکم وقت یا امیر المومنین سے ہو چکا ہے۔''

یہ سن کر عمر بن عثمانؒ نے ناگواری سے دوسری طرف منہ کر کے بولے۔ ”تو واقعی گستاخ ہے۔ اسی لئے سہل بن عبداللہ کے پاس نہیں ٹک سکا۔ بھلا وہ تجھے کیسے برداشت کرتے؟ تیری باتوں سے تو لہو کا رنگ چھلکتا ہے۔ پھر بھی ہم تجھے اپنی صحبت میں رکھنا چاہیں گے۔ اس امید پر کہ شاید تم اپنی اس نادانی سے نکل سکو اور تمہاری جان بچ جائے تمہارے دامن سے جو فتنے چمٹے ہوئے ہیں شاید ہمارے اس طرز عمل سے وہ تم سے الگ ہو جائیں۔ کاش ایسا ہو۔“

حسین ابن منصورؒ نے خاموش ہو کر ان کی ہر بات سنی اور پھر بغیر شکریہ ادا کئے خاموشی سے ایک ادائے بے نیازی سے ان کی خدمت میں رہنے لگے۔

لیکن عمر بن عثمانؒ کی صحبت بھی ان کے لہجے کی وہ بیباکی، جرأت مندی نہ چھین سکی جس کا وہ اب تک مظاہرہ کرتے آ رہے تھے۔ عمر مکی بھی اب محسوس کر رہے تھے کہ اس مرید کے رنگ ڈھنگ ہی نرالے ہیں۔ اس کا لہجہ روز بروز گستاخانہ، تلخی آمیز ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی زبان جرأت و جسارت کی تمام حدود پھلانگ کر جو دل میں آتا ہے سرعام کہتی جاتی ہے انہوں نے کئی بار حسینؒ کو بلا کر ٹوکا اور زور دیا کہ وہ اپنی ایک حد میں رہے۔ اس طرح نہ سرعام زبان کو بے قابو کئے رکھے لیکن وہ کہاں ماننے والا نوجوان تھا۔ وہ اپنی ہی حالت میں مگن جو ہوتا کہہ جاتا کسی بات کو راز نہ رکھتا۔

مشہور تھا کہ عمر بن عثمانؒ کے پاس تصوف کی کچھ نادر کتب بھی تھیں۔ ایسی کتب جن میں تصوف کے راز ہائے سربستہ دفن تھے۔ جن میں انکشافات کا سمندر بلند تھا۔ چنانچہ جب حسینؒ کے علم میں بھی اس کی بابت آیا تو انہوں نے پورے جوش و خروش کے ساتھ ان کتب کے حصول کو اپنا مقصد بنا لیا۔ خود مرشد کے علم میں بھی یہ بات تھی کہ مرید آج کل کن چکروں میں ہے۔ چنانچہ وہ بھی اس معاملے میں پوری طرح ہوشیار تھے اور ضرورت سے زیادہ ہی ان کی رکھوالی کا کام سرانجام دیتے تھے۔

ادھر حسین ابن منصورؒ کو بھی اب اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ دال گلنی مشکل ہے چنانچہ انہوں نے اپنی جستجو ترک کر کے صاف صاف بات کرنے کی ٹھانی اور ان گراں مایہ مسودات تک رسائی کے لئے سیدھے مرشد کے سامنے جا پہنچے اور عاجزی سے عرض کیا ”حضرت میں چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس جو مسودات ہیں آپ انہیں مجھے عنایت کرکے فیض یابی کا موقع دیں۔ صرف چند دنوں کے لئے مرحمت فرما دیں میں مطالعہ کر کے آپ کو واپس کر دوں گا۔“

مرشد کو جو حسینؒ کی کوششوں سے آگاہ تھے اس طرح امید نہیں تھی کہ مرید جستجو میں ناکام رہ کر یوں آن کر مدعا بیان کرے گا۔ چنانچہ انہوں نے یہ سب عرض سن کر خفگی سے کہا ”حسین! کیا تم نہیں جانتے کہ تم ابھی مبتدی ہو مبتدی اسے کہتے ہیں جو ابھی منزل سے دور ہو۔ اس منزل سے جہاں تمہیں ان مسودات کے مطالعے کا حق ملے گا پھر بھلا ہم کیسے تمہیں وہ مسودات تھما دیں تم پہلے ہماری آزمائش میں تو پورے اترو ضبط کا یارانہ تو پیدا کرو تاکہ ہم پورے اطمینان سے تمہیں یہ مسودات تھما سکیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ ہم نے کسی غلط ہاتھوں میں یہ گراں مایہ مسودات نہیں پکڑائے۔“

یہ سن کر حسینؒ بھی تلخی سے بولے۔ ”جیسا آپ خیال کریں اگر آپ مجھے اس قابل نہیں سمجھتے کہ میں ان مسودات تک پہنچ حاصل کر سکوں تو میں بھی زیادہ اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھتا اور نہ ہی مجھے اس کی خواہش ہے۔“

حسینؒ کی اس برہمی کیفیت سے مرشد پر انکشاف ہوا کہ انہوں نے جو مرید کو اس آس پر صحبت میں رہنے کی اجازت دی تھی کہ شاید اس کے وجود میں کھلی حد سے زیادہ تخی و بیبا کی کم ہو جائے گی وہ ہرگز نہیں ختم ہوئی بلکہ اس کے وجود میں تو بے چینی نے اور اضافہ کر ڈالا۔ انہوں نے حیرت و افسوس کے ساتھ مرید کو دیکھا جو سجدے میں گر کر آہ و فریاد کر رہا تھا۔ وہ دُکھ سے مرید کی زبان سن رہے تھے جو کہہ رہا تھا۔

''اے رب العالمین ...... آخر تیرے بندے مجھ سے بدگمان کیوں ہیں۔ کیا میں تمہاری نافرمانی کی جرأت کر سکتا ہوں؟''

اے پروردگار تُو اچھی طرح جانتا ہے کہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں نہ میں جو کچھ کرتا ہوں اس میں میرے ارادوں کا کوئی دخل ہوتا ہے۔ تُو تو دلوں کا حال جانتا ہے میں وہی تو کرتا ہوں جو تُو چاہتا ہے۔ تُو ہی تو مجھے اس بات پر مجبور کرنے والا ہے کہ میں تمہارے راز جو میرے دل میں ہیں وہ افشا کر دوں۔

اے میرے خالق اگر تُو بھی ان بندوں کی طرح سوچتا ہے تو پھر مجھے بتا تُو نے مجھ جیسے کمزور اور مجبور ناتواں انسان کو کیوں اس بار سے لادا ہے۔ تُو تو عالم الغیب ہے تُو تو بندے کی ہر کیفیت سے آگاہ ہے کیا تُو میری استطاعت سے لاعلم تھا تُو نہیں جانتا تھا کہ میں اس بوجھ کو سہہ بھی سکوں گا یا نہیں۔

اور پھر اگر تُو نہیں چاہتا تو مجھ جیسا کمزور انسان تیرے حکم سے سرتابی کرتے ہوئے اتنا بڑا قدم کیوں کر اٹھائے ہوئے ہے؟''۔

عمر بن عثمانؒ یہ سن کر سرزنش کرتے ہوئے حسینؒ سے بولے ''حسین...... لگتا ہے تُو تو گمراہ ہو چکا ہے کبھی یہ بھی سوچا کہ جو کچھ تم کہتے ہو زبان سے ادا کرتے ہو آخر ان کے نتائج کیا نکلیں گے۔ تمہاری ان باتوں سے تو فساد کی بُو آتی ہے۔ تم ایک عالم کو گمراہ کر ڈالو گے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس سے پہلے کہ تم خدا کی زمین پر شر پھیلاؤ وہ خود ہی تمہیں کوئی عبرت ناک سزا دے چکا ہوگا۔''

عمر بن عثمان مکیؒ کی ان باتوں سے اب تو حسینؒ کا دل بھی اچاٹ ہو چکا تھا۔ اب وہ اس جگہ کو بھی چھوڑ دینے کی خواہش رکھتے تھے لیکن اس بات کا بھی تہیہ کر چکے تھے کہ وہ عثمان مکیؒ کا مسودہ چوری کر کے ہی رہیں گے جسے انہوں نے اس قدر سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ جس آگ میں وہ جل رہے ہیں یقیناً عثمان مکیؒ بھی اس آگ میں جلتے ہوں گے لیکن ان کی حالت سے اضطراب و بے چینی کیوں نہیں جھلکتی جس نے حسینؒ کو آتش زیر پا کر رکھا ہے۔ چنانچہ اب وہ پوری توجہ سے ان گراں مایہ مسودات کی تلاش میں سرگرم ہو گئے آخر ایک دن انہیں اس کا موقع مل ہی گیا۔

حضرت عمر بن عثمان مکیؒ کا ایک سادہ لوح سا مرید تھا وہ بیچارا حسین ابن منصورؒ کے ہاتھ لگا تو انہوں نے اس کے ذریعے وہ گنج نامہ حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا جسے عمر دل و جان سے محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ ایک دن موقع پا کر آپ نے اس سادہ لوح مرید کو جا پکڑا اور پوچھا ''پیر و مرشد سے ملنا ہے کیا بتا سکتے ہو اس وقت وہ کہاں تشریف رکھتے ہوں گے؟''

سادہ لوح مرید نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ مرشد کا یہ مرید کبھی کسی سے یوں مخاطب تو نہیں ہوا جس طرح آج اس سے مخاطب ہے پھر بھی بولا ''ابن منصور...... مرشد تو ظہر کی نماز کے لئے وضو کرنے غسل خانے تشریف لے گئے ہیں آپ کچھ دیر ٹھہر کر آ جائیں۔'' حسین ابن

منصورؒ نے افسردگی سے کہا۔ "اے میرے سادہ دل دوست...... میں جانتا ہوں کہ مرشد آج کل مجھ سے سخت ناراض ہیں اور وہ یقیناً مجھ سے تو اب ملنا بھی پسند نہ کریں گے۔ اس لئے میں نے اب یہ ارادہ کیا ہے کہ یہاں سے کہیں اور طرف کو کوچ کر جاؤں۔ بھائی میں تمہارا احسان مند رہوں گا اگر تم مجھے اس بات کا موقع فراہم کر دو کہ میں جاتے ہوئے آخری مرتبہ پیرومرشد کی ... نماز کو ... دیکھنے کی سعادت حاصل کر لوں۔"

وہ سادہ دل شریف سا مرید بہت تیار ہو گیا چنانچہ اس نے حجرے سے ... وضو کا ... کا طریقہ سر انجام دینا شروع کر دیا اور حسین ابن منصورؒ نے لپک کر جائے نماز کے نیچے سے وہ گراں مایہ مسودہ نکالا اور پھر ہمیشہ کے لئے اپنے پیرومرشد کا ساتھ چھوڑ کر تیزی سے انجانی منزل کی طرف گامزن ہو گئے۔

دوسری طرف عثمان مکیؒ وضو کے دوران اپنا پاؤں بھی دھوتے جاتے اور باآواز فرماتے بھی جاتے "افسوس صد افسوس...... بدبخت...... لے گیا۔ نادان نے لے ہی رہا۔ اپنی دنیا خراب کر لی۔ زندگی کا سودا کر کے ہی رہا۔"

مریدوں نے یہ سن کر حیرت سے انہیں دیکھا مگر سمجھ نہ سکے کہ آخر مرشد یہ کلمات کس کے لئے ادا کر رہے ہیں۔ آخر ایک نے ہمت کر کے آگے بڑھ کر وضاحت چاہی تو عثمان مکیؒ بولے "ابن منصور کو کوس رہا ہوں۔ بدبخت ہمارا گنج نامہ چرا بھاگا ہے۔ جس بات کا خطرہ تھا وہ سامنے آ ہی گئی۔ اب یہ ظالم خود پر ظلم کی انتہا کروا لے گا۔"

ایک مرید نے ہمت کر کے جسارت سے پوچھ ہی ڈالا کہ "حضرت جب آپ واقف ہی تھے کہ ایسا ہونا ہے تب آپ نے بڑھ کر اسے روک کیوں نہیں لیا۔"

عثمان مکیؒ بولے۔ "میں کیوں منع کرتا اس بدبخت ... نے گستاخیاں کیں، غیر معمولی اسرار فاش کئے۔ اب گنج نامہ چرانے کی ہمت کی آخر کچھ تو ... سزا ہے!"

ادھر کامیابی میں شادماں ابن منصورؒ تیزی سے بغداد کی طرف گامزن تھے وہ جلد سے جلد جنید بغدادیؒ کی صحبت میں جانا چاہتے تھے۔

جس نسخہ کی جستجو میں حسین ابن منصورؒ سرگرداں رہے وہ خود آج ان تک پہنچا تھا۔ گنج نامہ نظروں کے سامنے کھلا پڑا تھا۔ ابن منصورؒ انتہائی شوق و دلچسپی سے اس کا مطالعہ کرتے جا رہے تھے۔ اس میں لکھا تھا۔

"جب ہم نے مٹی سے آدم کو تخلیق کیا اور پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ تم اس کو سجدہ کرو تو سبھی نے ... حکم کے آگے سر جھکایا اور آدم کو سجدہ کیا لیکن ابلیس مردود وہ ذات خبیث تھی جس نے انکار کیا کیونکہ وہ واقف اسرار تھا جبکہ فرشتے آدم کی تخلیق کے بھید سے ناآشنا' پھر ہم نے کہا دیکھو زمین کی تہہ میں ایک ایسا خزانہ ہم نے دفن کر رکھا ہے کہ جو بھی اس کو تلاش کرنا یا آگہی کا حصول کرنے کی جسارت کرے گا وہ یقیناً تباہ و برباد ہو جائے گا لیکن ابلیس نے کہا علم و آگہی کا جو خزانہ مجھے حاصل ہے اس کے بعد کسی خزانے کی خواہش نہیں لیکن میں پھر بھی ہر حال میں اس خزانے کی جستجو کروں گا۔ سو ابلیس کو اس کی اجازت اور مہلت دے دی گئی۔"

جوں جوں ابن منصورؒ گنج نامہ سے فیض یاب ہوتے گئے ان کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہوتی گئی۔ وہ زیر لب بولے "گویا گنج نامہ عمر بن عثمان انسانی ذہن کی تصنیف ہے۔ اس کا لہجہ شاہد ہے کہ گویا انسان نہیں خدا خود مخاطب ہے لیکن پھر بھی یہ لوگ مجھے کیوں کافر گردانتے ہیں؟ میں بھی تو یہی کہتا

ہوں یہی بات انہیں سمجھانے کی کوشش میں لگا رہتا ہوں۔" پھر انہوں نے سر جھٹک کر خود سے کہا۔ "مجھ میں اور ان میں فرق ہے کہ میں منافق نہیں وہ منافق ہیں۔ میرے دل میں جو ہوتا ہے وہی زبان پر آتا ہے۔ کچھ بھی ہو میں منافقت کا جال ہرگز نہیں لپیٹوں گا۔ خواہ کچھ ہو مجھے سولی پر چڑھنا پڑے میں ہر حال میں حق بات، صاف گوئی اور جرأت سے سب کے سامنے کرتا رہوں گا۔"

اگلے دن وہ جنید بغدادیؒ کی صحبت میں پہنچے۔ جنید بغدادیؒ وہ صاحب بزرگ تھے جنہیں اہل طریقت واضع اندازی میں منفرد اہل اللہ کہا کرتے ہیں اور اس رتبہ پر بہت کم لوگوں کو فائز کرتے ہیں۔

جنید بغدادیؒ کی صحبت میں پہنچ کر حسین ابن منصورؒ ادب سے کھڑے ہوگئے جنید بغدادیؒ نے ایک نظر ان پر نگاہ جمائے رکھی پھر بے رخی سے بولے "ابن منصور تم ہمارے پاس کیا لینے آن پہنچے ہو؟"

حسینؒ بولے "شیخ کی صحبت سے فیض یابی حاصل کرنے آن پہنچا ہوں۔"

جنید بغدادیؒ نے بے رخی و درشتی سے کہا "ابن منصور افسوس ہم تجھے اپنی صحبت میں نہیں رکھ سکتے۔ تجھ جیسے دیوانے کیلئے ہماری محفل کے در بند ہیں تم کہیں اور جا کر در آزماؤ شاید کسی اور کا در تجھے کھلا ملے۔"

ابن منصورؒ نے ذرا مایوسی سے کہا "آخر کیوں؟ مجھ سے کیا گناہ سرزد ہوگیا ہے جو آپ کا در میرے لئے بند ہے۔ وہ در جہاں سے کبھی کوئی مایوس نہیں لوٹا مجھے کیوں مایوس دھتکارا جا رہا ہے۔"

جنید بغدادیؒ نے رکھائی سے کہا "تم جیسا متلون مزاج بھی تو آج تک ہمارے در پر نہیں آیا۔ آج سے پہلے تم نے سہل بن عبداللہ کو چھوڑا، عمر بن عثمان کے پاس رہنے لگے اور پھر ان سے جدا ہو کر یہاں آن پہنچے ہو اور ہم یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ تم ان کے ساتھ کیا کر کے آ رہے ہو۔ بھلا ایسے انسان کا کیا بھروسہ؟ نجانے تم کب کس حال میں ہمارا ساتھ چھوڑ کر کسی اور کی صحبت اختیار کرنے دوڑ پڑو۔ ابن منصور شاید تم نہیں جانتے کہ حسن صحبت کا تقاضا کیا ہوتا ہے۔ تم کیا جانو اسے...... تم تو ہوش و حواس سے ہی بیگانہ ہو اور حسن صحبت کا پہلا تقاضا ہی یہی ہوتا ہے کہ ہوش و حواس میں انسان ہو۔"

ابن منصورؒ نے جنید بغدادیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "حضرت یہ سب انسانی صفات ہوشی و مدہوشی ایسی ہیں کہ میں خدا سے دعا کروں گا کہ وہ مجھے اپنی رحمت سے کام لے کر ان میں سرخرو کرے لیکن پھر بھی میں آپ کو یہ بتانا چاہوں گا کہ آپ اس بات کو اچھی طرح جان لیں کہ جب تک انسان اپنی انسانی صفات سے بالکل ہی عاری نہ ہو جائے انہیں نیست و نابود نہ کر ڈالے وہ اپنے خالق سے اپنے آقا سے پوشیدہ ہی رہتا ہے اور میں نہاں دستور رہنا کم از کم اپنے مالک کی نظروں میں نہیں چاہتا۔"

جنید بغدادیؒ نے غصہ میں کہا "ابن منصور یہی تو تمہاری بھول ہے تمہاری نادانی ہے جسے تم صحیح راہ سمجھ کر چل رہے ہو وہ بربادی کی طرف تمہیں لے جا رہی ہے۔ تم تو ہوش و مدہوشی کے معاملے میں بالکل ہی غلط نظریہ رکھتے ہو۔ بھلا کیا یہ بھی انسانی اختیار کی بات ہے۔ نادان انہیں محض اپنی کوششوں سے حاصل کرنا سب سے بڑی غلط فہمی ہے۔ ابن منصور...... کاش تُو یہ سب سمجھتا۔ ہوش و حواس سے کام لیتا کاش تُو یہ سب جان سکتا کہ تیرے اقوال و فکر میں کسی قسم کی بھلائی نہیں یہ تو حماقت و دیوانگی ہے محض حماقت و دیوانگی۔"

ابن منصورؒ نے سب کچھ خاموشی سے سنا۔ انہیں سہل بن عبداللہ سے لے کر اب تک سب ہی ذہن

نشین کراتے آ رہے تھے کہ وہ باطل راہ کے ہم راہی ہیں۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ سراسر دیوانگی کی علامتیں ہیں چنانچہ انہوں نے جنید بغدادیؒ سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور خاموشی سے اُٹھ کر آ گئے۔

اب کی بار حج کرنے کی تڑپ پیدا ہوئی تو بغداد سے مکہ کی راہ لی۔ حج کرنے کے بعد مکہ سے پلٹ کر دوبارہ بغداد آ گئے اور خاموشی سے جنید بغدادیؒ کی خدمت میں رہنے لگے۔ اس دوران انہوں نے ایک شادی بھی کر لی۔

ایک دن انہوں نے جنید بغدادیؒ سے سوال کر ہی ڈالا "حضرت آپ کے خیال میں مجھ سے جو یہ افعال سرزد ہوتے ہیں آخر ان کا ذمہ دار کون ہے؟"

جنید بغدادیؒ نے انہیں غور سے دیکھا اور سوچا شاید اب حسینؒ کو اپنی حالت پر رحم آ رہا ہے وہ راہ بدلنا چاہتے ہیں سو انہوں نے فوراً جواب دیا۔ "اپنے افعال کے تم خود ہی ذمہ دار ہو۔"

لیکن اگلے ہی لمحے حسینؒ نے ان کی تمام امیدوں کی نفی کرتے ہوئے کہا "لیکن جناب میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔ مجھے آپ کی اس بات سے بالکل اختلاف ہے۔ بھلا میں کیوں گناہوں کو اپنی گردن میں لٹکنے کی جگہ دوں گا۔ میں تو جو کچھ کرتا ہوں اور مستقبل میں جو کچھ کروں گا وہ سب من جانب اللہ ہے اور یہ ایک ایسا راز ہے جسے میں کسی طور بھی پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔ رکھنا بھی چاہوں تو مجھ سے ایسا نہ ہو سکے گا۔"

جنید بغدادیؒ غور سے سب کچھ سنتے رہے۔ مرید پر نظر ڈالے اس کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لیتے رہے کہ آخر ابن منصور کس راہ پر ہے۔ کیوں نہیں سمجھ سکتا کہ راز کو راز ہی رکھنا مصلحت کے عین مطابق ہے چنانچہ انہوں نے فرمایا "ابن منصور...... تو کچھ بھی کہے لیکن ہم بھی ایک بات تجھے بتانا چاہتے ہیں اور ہماری اس بات کو تُو گرہ میں باندھ لے۔ اے بدنصیب تُو جو کچھ کہتا پھر رہا ہے اس سے تُو یقیناً کسی نہ کسی دھاتی چیز کو اپنے لہو سے رنگ کر ہی باز آئے گا۔ یہ ہمیشہ ذہن میں رکھنا۔"

ابن منصورؒ بے خوفی و بے باکی سے بولے "حضرت مجھے بھی علم ہے کہ میرے ساتھ کیا برتاؤ کیا جانے والا ہے۔ میں آپ کو بھی علمائے ظاہر کا پیراہن پہنے خلیفہ وقت کی طرف سے ملے حکم کے مطابق مجبوراً اپنے خلاف فتوا صادر کرتا دیکھ رہا ہوں۔ میں اس سولی کو بھی دیکھ رہا ہوں جس پر میرا جسم سجے گا لیکن اے شیخ چاہے کچھ بھی ہو میں ہرگز منافقت کا جال نہیں اوڑھ سکتا جو کچھ دل میں ہے زبان پر لاتا رہوں گا چاہے اس سے کئی رازوں کے افشا ہونے کا ڈر ہو یا نہ ہو۔"

جنید بغدادیؒ نے رحم بھری نظروں سے آپ کو دیکھا اور پھر خاموشی سادھ لی۔

جنید بغدادیؒ سے مایوس ہو کر آپ ناراضگی سے بغداد چھوڑ کر تستر چلے آئے۔ آپؒ کی بے باکی و صاف گوئی کی وجہ سے ہر وقت عقیدت مندوں کا ہجوم رہنے لگا لیکن دوسری طرف علماء ظاہر آپ سے سخت رنجش میں مبتلا ہو گئے۔ خود آپؒ کے مرشد عمر مکیؒ نے بھی آپؒ کے خلاف خطوط لکھ لکھ کر لوگوں کو بھڑکانا شروع کر دیا۔ غرض ایک طوفان حسد و معاندانہ کا تھا جس میں آپ کو پھنسا دیا گیا۔ ہر طرف سے مخالفت کی بوچھاڑ ہونے لگی آپ اس حد تک اس صورت حال سے عاجز آ گئے کہ دنیاوی زندگی اختیار کر لی لیکن وہ بھلا آپ کے مزاج سے کہاں لگاؤ کھاتی تھی سو جلد ہی اپنی پرانی روش پر آ گئے۔

اس عرصہ میں آپؒ نے لاتعداد کتب بھی تصانیف کیں۔ ان تصانیف پر آپ کو حلاج الاسرار کا خطاب دیا گیا۔

تستر میں طوفان مخالفت کی یلغار سے بچنے کے لئے آپؒ نے سیاحت کا پروگرام بنایا اور خراسان،

برصغیر اور جنوبی چین غرض جہاں بھی گئے لوگوں نے آپؒ کا بھرپور گرم جوشی سے استقبال کیا۔ آپؒ ان لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔

ایک مرتبہ پھر حج کا خیال پیدا ہوا تو عقیدت مندوں سمیت مکہ کی راہ لی۔ عقیدت مندوں کے ہجوم میں آپؒ آہستہ آہستہ مکہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مریدوں کی اکثریت تھی اور زادِ راہ اس حد تک کم کہ ابتدائی دنوں میں ہی ختم ہوگیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگ فاقوں سے بے حال ہوگئے اور جب آپؒ کو بے نیازی اختیار کئے دیکھتے تو جھنجلا کر رہ جاتے آخر دل کی بات لبوں پر آئی تو شکایت بھرے انداز میں کہہ اٹھے ''حضرت یہ بھی خوب رہی آپ کے ہمراہ حج کا ارادہ کیا لیکن آپ کی اہل سفر والوں سے یہ بے اعتنائی تو دکھا رہی ہے کہ مکہ تک پہنچنا نصیب ہو نہ ہو بھوک و فاقہ سے زمین کی تہہ میں ضرور جائیں گے۔''

یہ سن کر آپؒ نے پہلے تو حیرت سے اپنے ساتھیوں کے چہروں پر چھائی فاقہ کشی کے آثار دیکھے اپنی غفلت کا احساس ہوا تو بولے ''اچھا.... پھر اب تم کیا کھانا پسند کرو گے؟''

مریدوں نے حیرت سے یہ سن کر آپؒ کو دیکھا وہ آپ کی ذہنی کیفیت کی درستی کے بارے میں سوچنے لگے۔ بھلا یہ کیسے صاحب ہیں کہ عقیدت مند بھوک سے مرے جا رہے ہیں آس پاس کھانے کو درختوں کی جڑیں تک میسر نہیں اور پوچھا جا رہا ہے تم کیا کھانا پسند کرو گے۔ کبھی ایک دوسرے سے افسوس کا اظہار کرنے لگے کہ اب کی مرتبہ خوب پھنسے۔ نجانے گھر بار کی شکل بھی دیکھنا نصیب ہوگی یا نہیں۔ آپؒ نے جو یوں اہل فاقہ کو آپس میں باتیں کرتے پایا تو دوبارہ پوچھا ''میں تم سے پوچھ رہا تھا تم کیا کھانا پسند کرو گے؟''

ایک مرید بھڑک ہی اُٹھا اور کہنے لگا۔ ''حضرت اگر ہماری پسند کا خیال ہے تو ہمیں اس وقت سری اور گرم روٹیاں کھانے کی خواہش محسوس ہو رہی ہے اگر اس بیابان و سنسان ریگستانی علاقے میں بندوبست کرسکتے ہیں تو کردیں۔''

مرید کی یہ بات سن کر آپ مسکرا پڑے اور فرمایا'' جو تم مانگتے ہو تمہیں مل جائے گا تم لوگ اطمینان سے چادر بچھا کر بیٹھ جاؤ۔'' عقیدت مندوں نے غیر یقینی کے انداز میں آپ کو دیکھا اور چادر بچھا کر بیٹھ گئے۔ پھر اگلے لمحے انہوں نے جو آپؒ کو ہاتھ پیچھے لیجا کر کچھ تھامتے اور پھر ہاتھ آگے کرکے ہاتھ میں تھامی سری اور روٹیوں کو اپنی طرف بڑھاتے دیکھا تو حیرت سے گنگ رہ گئے لیکن بھوک کے ہاتھوں بے تاب لوگوں نے جلد از جلد کھانا شروع کیا اور خوب سیر و شکم ہو کر ہی ہاتھ کھینچا۔

لوگوں کے لئے یہ ایک دلچسپ کرامت تھی؛ وہ آپؒ کی موجودگی میں ضروریات زندگی سے لاتعلق ہوگئے۔ سفر دوبارہ شروع ہوا تو ایک مقام پر عقیدت مندوں نے آپؒ سے خرمے کھانے کی خواہش کا تقاضا کیا۔ آپؒ نے دائیں بائیں دیکھ کر کہا ''خرمے؟ خرمے یہاں کہاں؟ نہ تو خرموں والا باغ ہے نہ یہاں بازار جہاں سے خرمے خریدیں جائیں۔''

مرید جو آپؒ سے کرامت کی امید رکھے ہوئے تھے بولے حضرت ہمیں تو اپنی احتیاج عرض کرنا تھی سو کردی وہ مطلوبہ شے کہاں سے ملے گی یہ ہم نہیں جانتے اور نہ ہم گناہ گار بندے یہ جاننا چاہتے ہیں۔

یہ سن کر آپ کھڑے ہوگئے اور فرمانے لگے ''میں خوب سمجھتا ہوں کہ تم کیا چاہتے ہو اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے کتنی عقیدت ہے لیکن میں وہ وقت بھی دیکھ رہا ہوں جب تم میں سے میرے کچھ ساتھی مجھی پر پتھر برسائیں گے اپنی لعن طعن سے

مجھے ہوش نہ رہے تو آپ مجھے معاف کر دیں گے۔"

یہ سن کر عقیدت مند بے چین ہو گئے اور کہا۔

بولے "حضرت یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ خدا نخواستہ ہم تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے بھلا ہم ایسا کیوں کریں گے۔"

یہ سن کر آپ نے فرمایا۔ "خیر تم میرے جسم کو یوں جلاؤ جیسے چھدار درخت کو ایندھن کی خاطر جلایا جاتا ہے۔" مریدوں نے یہ عجیب وغریب حکم سنا پہلے تو ہچکچائے مگر پھر بڑھ کر آپ کی خواہش کے مطابق آپ کو جلانا شروع کر دیا۔ جوں جوں وہ آپ کے وجود کو جلاتے جاتے آپ کے جسم سے خرمے یوں گرنے لگے جیسے کسی شجر سے گرتے ہوں چنانچہ تھوڑی دیر بعد قبلہ آپ کے مرید خرموں کے ڈھیر کے پاس بیٹھے کھانے میں مصروف تھے۔

فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد آپ پھر دوبارہ مریدوں کے ہمراہ بغداد آ گئے۔ اب کی مرتبہ بغداد کی فضا بھی آپ کیلئے کوئی زیادہ سازگار نہ تھی۔ مخالفت عروج پر تھی علمائے دین ایڑی چوٹی کا زور آپ کو کافر ثابت کرنے میں لگا رہے تھے۔ لوگوں کو آپ کے خلاف حد سے زیادہ بھڑکا دیا گیا تھا۔ لوگ آپ کو تنگ و زچ کرنے کی خاطر الٹے سیدھے سوالات کی بوچھاڑ کرتے۔ یہ اطلاعات جنید بغدادیؒ تک بھی پہنچیں انہوں نے اس پر سخت دکھ اور غم کا اظہار کیا اور اپنی ناراضگی ظاہر کی لیکن پھر خود سے بولے "ہم بھی کیا کر سکتے ہیں جو شخص خود کو تباہ کرنے پر کمربستہ ہو اسے کوئی کیوں کر بچا سکتا ہے۔ بھلا ایسا بھی کیا کہ ایک چیز پر جو ازل سے پردہ پڑا ہے تم اسے اٹھانے کے درپے ہو رہے ہو۔ اگر اس فعل کے لئے مجبور ہو تو پھر سزا تو یقیناً ملے گی ہی۔ ہم بھلا کون ہوتے ہیں اس سزا سے بچانے والے۔"

حاسد اور ناداں علماء جو ہاتھ دھو کر آپؒ کے پیچھے پڑ چکے تھے طرح طرح کے سوالات کر کے آپؒ کو زچ کئے ہوئے تھے کسی نے شرارتاً پوچھا۔ "حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کچھ عرض کریں۔"

ابن منصور بولے۔ "پیغمبر تھے ... برحق خدا کے برگزیدہ پیغمبر۔"

کسی عالم نے دوبارہ پوچھا۔ "اچھا فرعون کے بارے میں کیا رائے ہے؟"

آپؒ نے جواب دیا۔ "وہ بھی سچا تھا۔"

یہ سن کر لوگوں نے طنزیہ انداز میں قہقہے لگانا شروع کر دیئے۔ "خوب ... حضرت آپ نے بھی کیا کہی ... سنو بھائیو تم بھی ذرا غور سے ابن منصور کی بات سنو۔ بدی بھی برحق ہے اور سچائی بھی حق ہے۔ ذرا ان سے پوچھو تو سہی یہ بات کیا ہوئی آخر؟"

ابن منصور بولے۔ "تم لوگوں کو ہنسنے سے فرصت ملے تو میری بات غور سے سنو۔ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ خدا نے دو طرح کے لوگ پیدا کئے ہیں۔ ایک عام قسم کے دوسرے خاص قسم کے۔ سبھی اپنے اپنے حصے کا کام سرانجام دے رہے ہیں؟"

یہ سن کر ایک شخص غصے میں بھڑک کر بولا۔ "تو کیا بک رہا ہے، کیوں ہمیں کفر کے کلمات سنا کر گناہ گار کر رہا ہے۔"

ابن منصورؒ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ خدا ہی ہر قسم کے لوگوں کو پیدا کرنے والا ہے۔ وہی انہیں راستے کا پتہ بتانے والا ہے حکمت ایک تیر ہے خدا تیر انداز اور مخلوق نشانہ......"

لوگوں نے اب آپ سے سخت بے چینی محسوس کی۔ وہ برہم دکھائی دے رہے تھے کہ ایک شخص کھڑے ہو کر پوچھنے لگا۔ "ابن منصور تمہارے نزدیک صبر کی کیا تعریف ہے۔"

ابن منصورؒ بولے۔ "صبر......صبر کا مطلب ہے مصائب و تکالیف کی چکی میں پسنے والا اُف تک نہ کرے سولی پر چڑھا کر اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ

ڈالے جائیں مگر اس کے لبوں سے پروردگار کے لئے شکوہ نہ نکلے۔''

اچانک مجمع میں سے ایک شخص بول اُٹھا۔''ابن منصور...... وہ وقت بھی دُور نظر نہیں آتا جب صبر کا مفہوم ہم تجھے سولی پر لٹکتے دیکھ کر تمہارے طرزِ عمل سے سیکھیں گے۔''

لوگوں کے اس طرزِ عمل سے دل برداشتہ ہوکر حسین ابن منصورؒ ایک دفعہ پھر حج کی نیت سے مکہ چلے گئے اور اس مرتبہ بھی آپؒ کے ساتھ ایک ہجوم تھا اور آپؒ بھی اس ہجوم میں اکثر کی منافقت پر دکھ بھی محسوس کرتے اور افسوس بھی۔ وہ کہتے اگر لوگ مجھے سمجھ نہیں سکتے میرے درد کا احساس نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ مجھے کافر ہی قرار دینے لگیں۔ اس بات پر وہ اس قدر برہم تھے کہ ضبط کا یارانہ چھوٹا تو عرفات کے میدان میں ہزار ہا افراد کے سامنے بلند آواز میں خدا سے فریاد کرنے لگے۔

''اے اللہ تُو بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھانے والا ہے۔ کیا میں بھی تیرے نزدیک کفر کی حدود میں داخل ہو چکا ہوں۔ جو تیرے بندے مجھے کافر کہنے لگے ہیں۔ اگر میرے افکار و نظریات واقعی کفر کے زمرے میں آتے ہیں تو میرے اس کفر میں اور اضافہ فرما دے۔''

یہ سن کر لوگ توبہ استغفار کرنے لگے اور اب تو انہیں مکمل یقین ہو گیا کہ ابن منصور مسلمان نہیں رہا کافر ہو گیا ہے۔ وہ آپؒ سے علیحدہ ہو گئے اور آپؒ پر لعن طعن کرنے لگے۔

ایک مرتبہ آپؒ کو اپنے ایک دوست کا خط ملا جس میں اس نے آپؒ سے دریافت کیا تھا کہ آخر ابلیس ہی کیوں آدم کو سجدہ کرنے سے منکر ہو گیا تھا تو اس کے جواب میں آپؒ نے ایک بے باکانہ انداز میں جواب لکھ کر بھیجا جس کا مضمون کچھ اس طرح سے تھا۔

''من جانب ارحم الرحمین...... بنام بندہ خدا

تم نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ شیطان مردود نے آدم کو اپنے خالق کے کہنے کے باوجود سجدہ کیوں نہیں کیا۔

اگرچہ اس کا جواب اب تک لوگوں سے چھپایا جاتا رہا ہے جو کہ مناسب نہیں تھا اور نہ ہی ایسا یہ کوئی راز ہے میں تمہیں آج اس سے آگہی دلواتا ہوں۔

ابلیس بہت بڑا موحد تھا اس نے اپنے رب کا بھی وہ حکم نہیں مانا جس سے شرک کی بو پائی جاتی تھی۔''

اس قسم کے خطوط لکھنے پر ہی ابن منصورؒ نے اکتفا نہ کیا بلکہ ساتھ ہی یہ نعرہ بھی لگا دیا کہ ''میں ہی وجود خداوندی ہوں۔'' لوگوں نے جب ''انا الحق'' کا یہ نعرہ سنا تو کانپ کر رہ گئے۔ دُور دُور تک حشر برپا ہو گیا۔ علماء و مشائخ نے یہ سننا تھا کہ تھرتھرانا شروع کر دیا۔ نادان اور نااہل اس حد تک مشتعل ہو گئے کہ انہوں نے آپؒ پر سنگ باری شروع کر دی جب معاملہ حد سے زیادہ بڑھ گیا تو مجبوراً خلیفہ وقت کو اس میں مداخلت کرنا پڑ گئی اور اس نے مفادِ عامہ کی بھلائی کی خاطر اپنے اس فعل کو جائز قرار دیتے ہوئے آپؒ کو گرفتار کر لیا اور قید خانے میں ڈال دیا۔

حسین ابن منصورؒ کی گرفتاری کوئی اتنا معمولی واقعہ نہیں تھا جو پوشیدہ رہتا چنانچہ بغداد اور آس پاس کے علاقوں میں یہ خبر پھیل گئی اور لوگ جوق در جوق آپؒ سے ملاقات کرنے جیل خانہ آنے لگے۔ لوگوں نے ابن منصورؒ کو قید میں دیکھا تو دل بھر آیا غم و رنج کی کیفیت سے ابن منصورؒ سے کہنے لگے۔

''ابن منصور...... اپنی جان پر رحم کھاؤ۔ کیوں خود کو عذاب میں مبتلا کیے دے رہے ہو۔ خلیفہ وقت سمیت تمام علماء اور بزرگانِ دین تم سے خفا ہیں کیونکہ تم اپنا لہجہ اس حد تک تلخ کرتے ہو کہ لوگوں کو تم پر انگلی اٹھانے کا موقع ملے۔ حسین ابن منصور...... مان لو...... اب بھی وقت ہے تم انا الحق...... اور من جانب الرحم الرحمین کہنا بند کر دو۔ لاتعلق کا اظہار کر دو خلیفہ

تمہیں چھوڑ دے گا"۔

ابن منصورؒ بولے "لوگو تم کیوں خواہ مخواہ مجھے حق راہ سے ہٹانے کے لئے کوشاں ہو۔ جاؤ تم لوگ اپنا کام کرو میں اپنا کام کرتا ہوں یہی خدا کی رضا ہے تم اپنی ذمہ داریاں نبھاؤ میں اپنا فرض سرانجام دیتا ہوں"۔

چنانچہ لوگ مایوس ہو کر آپ کی طرف دکھ بھری نظروں سے دیکھتے واپس پلٹ گئے۔ اب انہیں یقین ہو گیا کہ یہ درویش اپنی گردن کٹوا کر ہی رہے گا۔ اس کے افکار و نظریات نے جو تہلکہ مچا رکھا تھا وہ اس بات کی صاف نشاندہی کرتا تھا کہ بہت جلد کچھ نہ کچھ ناخوشگوار واقعہ ہونے والا ہے۔"

ایک رات عقیدت مند جو آپ سے ملنے قید خانے پہنچے تو حیرت زدہ ہو گئے وہاں نہ آپؒ کا قید خانے والا تھا نہ ہی آپؒ تھے۔ انہوں نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا سبھی کی آنکھوں میں بے یقینی کی کیفیت پائی جا رہی تھی وہ تمام رات قید خانے کے نگرانوں نے اور مریدوں نے اس جستجو میں لگا دی کہ آخر آپؒ کدھر گئے اور یہ کس انداز سے غیر حاضر ہوئے ہیں کہ ساتھ ہی جگہ کو بھی لے گئے۔

اگلی صبح انہیں پھر حیرت کا شدید جھٹکا لگا جب ان کی نظروں کے سامنے ابن منصورؒ اپنی جگہ موجود تھے۔ لوگوں نے آپ کو دیکھا تو حیرت سے دریافت کیا۔ "حضرت یہ کیا معاملہ ہے رات آپ قید خانے سمیت ہی اوجھل تھے۔"

ایک مرید نے تصدیق چاہی۔ "حضرت آپ چاہیں تو یہاں سے فرار با آسانی ہو سکتے ہیں۔"

آپؒ نے لحظہ بھر اسے دیکھا پھر فرمایا۔ "یہ شاید مٹی و پتھر کی بنی یہ دیواریں ہماری راہ نہیں روک سکتیں لیکن تحفظ شریعت کی خاطر ہم ایسا قدم نہیں اٹھا سکتے۔

اور پھر ایک دن فیصلہ کا وقت آن پہنچا۔ خلیفہ نے حکم جاری کیا کہ آخری بار دوبارہ ابن منصورؒ سے پوچھ گچھ کی جائے۔ اس پر جرح کرو شاید وہ اپنی غلطی تسلیم کر لے اور جان بچا لے لیکن اگر وہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرے تو علماء سے ان کے واجب القتل ہونے کا فتویٰ لے کر قتل کر دیا جائے۔

چنانچہ خلیفہ کے حکم سے علماء قید خانے میں ابن منصورؒ سے ملنے گئے اور ان پر جرح کرتے ہوئے بولے۔ "ابن منصور کیا تم اسے کفر خیال نہیں کرتے کہ خود کو انا الحق کہلاتے پھرو گویا اس طرح تم نے اپنی خدائی کا دعویٰ کر دیا۔"

دوسرا بولا۔ "ابن منصور پہلے تو ہم یہی سمجھتے رہے کہ شاید تم پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرنے والے ہو لیکن پھر تمہارے خطوط نے اور تمہارے نعرہ انا الحق نے ہم پر انکشاف کیا کہ تم تو اس سے بھی بلند سوچ رکھتے ہو اور خدائی کا دعویٰ کرنے لگے ہو۔"

حسین ابن منصور آخر تمہارا ان سب باتوں سے کیا مقصد ہے؟ کیا حاصل کرنا چاہتے ہو تم اس ذریعے سے۔"

ابن منصورؒ نے سب الزامات غور سے سننے کے بعد جواب دینا شروع کیا۔

"میں کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم لوگ میری مخالفت میں اس حد تک نکل جاؤ گے کہ مجھے خدا بننے کا الزام دینے لگو گے۔ کیا واقعی تم اس حد تک کم عقل و ناسمجھ ہو کہ تم میری باتوں کی گہرائی میں نہ جا سکے۔ تم میرے نظریات کو نہ جان سکے۔ کیا تمہیں "من الرحم الراحمین" کا مطلب ہی نہیں معلوم۔ نادانوں اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کاتب ہے اور میں خود آلہ کتابت پھر بھی تم یہ سمجھتے ہو کہ میں خدا بننے کا خواہش مند ہوں خدا تم پر رحم فرمائے۔ تم ایک بے گناہ کے لہو سے بہت جلد اپنے ہاتھ سرخ کرنے والے ہو۔ میں وہ منظر دیکھ رہا ہوں جب تم لوگ ناحق مجھے سولی پر چڑھا کر ہی دم لو گے۔"

ابن منصور کا کہا سچ ثابت ہوا۔ علماء نے اور خلیفہ نے ابن منصور کی تمام تر تاویلات کو مسترد کرتے ہوئے قتل کا حکم جاری کر دیا۔

چنانچہ اگلے روز آپ کو زنجیروں میں باندھ کر باہر لایا گیا اور مقتل گاہ کی طرف لیجایا گیا۔ راہ کے دونوں اطراف کھڑے شر پسند نادان اور ناسمجھ لوگ آپ کو پتھر مارنے لگے۔ انہی میں وہ شبلی نامی بزرگ بھی تھے جو جنید بغدادیؒ کے سب سے چہیتے شاگرد تھے وہ بھی حسین ابن منصور کو مارنے والوں میں شامل ہو گئے۔

آپ کو ٹکٹکی پر باندھا گیا اور پھر ایک جلاد صفت نوجوان خلیفہ وقت کے حکم پر آپؒ پر کوڑے برسانے لگا۔ ہر کوڑے کی ضرب پر کوڑے برسانے والا ایک پراسرار سی آواز سنتا جو ابن منصور کو مخاطب ہوتی۔ وہ آواز بار بار منصور سے کہتی "اے ابن منصور دیکھ گھبرا مت جانا" خوف زدہ نہ ہونا۔"

تین سو کوڑے برس چکے مگر ابن منصور کے لبوں سے آہ تک نہ نکلی اُف تک نہ کہا۔ آپؒ نے اس وقت عربی میں یہ شعر پڑھنا شروع کر دیئے۔

میرا ندیم ذرا سا بھی ظالم نہیں

اس نے مجھے وہ شراب پینے کو دی جو ایک میزبان مہمان کو دے سکتا ہے۔

اور جب جام پہ جام لٹائے جا چکے۔

تو اس نے شمشیر اور کوڑا اتھام لیا۔

اور بولا اس کے لئے یہی سزا ہے۔

یہ شخص اسی سزا کے قابل ہے اژدھے کے سامنے سخت گرمی میں۔

بھلا اسے شراب پینے کی جسارت ہوئی کیسے؟

پھر جلاد آگے بڑھا اس نے تلوار بلند کی اور ایک ہی وار میں آپؒ کے دونوں ہاتھ تن سے جدا کر دیئے آپؒ نے اُف تک نہ کی اور بولے "کیا ہوا میرے باطنی ہاتھ تو محفوظ ہیں انہیں کون کاٹ سکتا ہے۔"

پھر جلاد نے آپؒ کے دونوں پاؤں کاٹ دیئے آپؒ بولے "میرے باطنی پاؤں تو محفوظ ہیں وہ کسی کی رد میں آ سکتے ہیں بھلا۔ کون کاٹے گا انہیں۔"

اس کے بعد انتہائی ظالمانہ انداز میں آپ کی آنکھیں بھی نکال دیں۔ خون کے فوارے آپؒ کے جسم سے پھوٹ رہے تھے آپ کا بدن لہو میں ڈوبا خدا کی بارگاہ میں جھکا جا رہا تھا اور آپؒ کے لب آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے یکتا کی دوستی بھی یکتا ہی کر دیتی ہے؟

اور پھر جب آپؒ کی زبان کاٹی گئی اور آخر میں آپؒ کی گردن بھی کاٹ دی گئی تو ہر طرف سے صدا بلند ہونے لگی "انا الحق! انا الحق! انا الحق۔"

دوسرے دن آپ کی لاش جلا دی گئی اور دجلہ کے دریا کے سپرد راکھ کر دی گئی۔

ابن منصور بیشک مومن تھے عارف و محب جو خدا کی وحدانیت پرستی کے بہت بڑے علمبردار تھے پھر آخر انہیں اذیتوں بھری اتنی کڑی سزا کیوں ملی......!

صرف اس لئے کیونکہ انسان نے خود کو ان بلند و بالا پتھریلی دیواروں میں خود کو محبوس کر لیا جو اس نے خود اپنے لئے تیار کی ہیں اپنے اقوال اور افعال کی پابندی اور افکار میں اظہار کی مجبوری یہ وہ بوجھ ہیں جو انسان نے اٹھایا ہے جسے اٹھانے سے فرشتوں تک نے انکار کر دیا وہ اس بوجھ کی سزا سمجھتے تھے جو انسان نے اسے اٹھا کر بھگتنی شروع کی اور بھگت رہا ہے اور نجانے کب تک اسے اس کی یہ سزا بھگتنی ہے۔

ابن منصورؒ کے ساتھ یہ سلوک اس لئے کیا گیا کیونکہ وہ اپنے خالق کے رازوں کو راز نہ رکھ سکا۔ برسرعام برملا اظہار کرتا رہا اگرچہ ادھر تو یہ عالم ہے کہ موجودات کا ذرہ ذرہ انا الحق پکارتا ہے لیکن اسی انا الحق کہنے کی پاداش میں انسان کو سزا بھگتنی پڑی۔